# مسیحا کون؟
# سرسید یا آزاد !


عارف الاسلام

علی گڑھ






| | | |
|---|---|---|
| طبع اول | : | ۱۹۸۸ء مسیحا کون؟ سرسید یا آزاد! |
| طبع ثانی | : | ۲۰۱۰ء (بعنوان سرسید آزاد اور ہندوستانی مسلمان) |
| طبع ثالث | : | ۲۰۲۰ء |
| نام کتاب | : | مسیحا کون؟ سرسید یا آزاد! |
| مصنف | : | عارف الاسلام |
| اشاعت | : | ۲۰۲۰ء |
| طابع | : | مشکوۃ پرنٹرس، علی گڑھ |
| تعداد | : | ۵۰۰ |
| قیمت | : | ۴۰۰ |

ملنے کا پتہ

- دی علی گڑھ پبلشنگ ہاؤس، انوپ شہر روڈ، علی گڑھ
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، شمشاد مارکیٹ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
- مکتبہ جامعہ، شمشاد مارکیٹ، علی گڑھ

# انتساب

ہندوستانی مسلمانوں کی اس نوجوان نسل

کے نام

جس نے آزاد ہندوستان میں

آنکھ کھولی

# فہرست


۱- عرضِ احوال ........ 9

حرفِ آغاز: ........ 13

۲- علم طاقت ہے اور دولت بھی ........ 25

۳- ہندوستانیوں کی نئی تعلیم کا آغاز ........ 29

(۱) راجہ رام موہن رائے (۲) قدیم تعلیم بے فائدہ ہے (۳) مسلمانوں کا انکار

○ سرسید

۱- وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے ........ 41

۲- نوکری کا آغاز ........ 43

۳- مسلمانوں کی حکمرانی سے بے دخلی ........ 44

۴- سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کر دیے گئے ........ 47

۵- ایک اور ثبوت ........ 51

۶- سرسید پر غدر کے اثرات ........ 55

۷- جو کچھ رنج تھا قوم کی بربادی کا ........ 57

۸- کلمۂ حق! اسبابِ بغاوتِ ہند ........ 63

۹- خاکہ اسباب بغاوت ہند ........ 66

(۱) اہل ہند کی قانون ساز اسمبلی میں شرکت ضروری تھی ........ 69

(۲) تصورِ پارلیامنٹ ........ 72

(۳) عیسائی بنانے کی مہم غلط تھی ........ 76

(۴) ہندوستانی ذلیل کیے گئے

۱۰- اصلاحی کاموں کا آغاز: سائنٹفک سوسائٹی ........ 81

(۱) علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ ........ 82





۱۱- انگلستان کا سفر: قوم کی حالت کیسے درست ہو ........ 85

(۱) ہماری قوم ایسی کیوں نہیں ........ 87

۱۲- انگلستان کی حالت بھی خراب رہی ہے ........ 91

(۱) تہذیب الاخلاق (۲) آغازِ انقلاب ........ 92

۱۳- مدرسۃ العلوم کا قیام ........ 97

۱۴- تصورِ تعلیم: طریقۂ تعلیم میں تبدیلی ضروری ہے ........ 105

(۱) مروجہ علوم بے فائدہ ہیں

(۲) پرانے اور نئے علوم کا فرق

۱۵- سرسید کے مذہبی افکار ........ 113

۱۶- دافع البہتان: سرسید کا جواب در ''تائید اسلام'' ........ 117

۱۷- سرسید کی مخالفتیں ........ 127

(۱) مخالفت کے اسباب (۲) سرسید کا بائیکاٹ

(۳) خاص مخالفین (۴) سرسید کے خلاف فتوے

(۵) پہلا فتویٰ (۶) دوسرا فتویٰ (۷) فتوے دینے کا غلط طریقہ

۱۸- سرسید کی مصالحانہ کوششیں ........ 149

۱۹- سرسید کے سیاسی نظریات و کارنامے ........ 155

۲۰- اردو کے خلاف محاذ آرائی ........ 161

(۱) جو زندہ رہے گا دیکھے گا

۲۱- لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر سرسید کی ترمیم: ہندوستان میں بہت سی قومیں رہتی ہیں 167

(۱) ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی

(۲) سادہ جمہوری اصول غلط ہے

۲۲- قیامِ کانگریس ........ 173

(۱) سرسید پر الزام وفاداری اور وفادار کانگریس

(۲) سرسید کی کانگریس مخالفت

۲۳- لکھنؤ تقریر: مسلم سیاست کی شروعات ............ 183

۲۴- میرٹھ لیکچر: کانگریس کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں............ 189

۲۵- انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا قیام ............ 197

(۱) مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ (۲) ایسوی ایشن کے قواعد

(۳) مہاراجہ بنارس کی تقریر (۴) ایسوسی ایشن میں اختلاف

۲۶- سرسید پر تنقیدیں اور جوابات ............ 215

(۱) سرسید کا سیاسی حریف: ہیوم (۲) بنگالی اخبارات کی بہتان تراشیاں

(۳) بنگالی اخبارات کے حملے کا جواب (۴) دلہن کی دو آنکھیں لیکن......

(۵) طبیب جی کو استعمال کیا گیا (۶) ہر کانگریس کے خلاف ہوں

۲۷- محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن ............ 235

(۱) ایک جدید تحریک (۲) بیک کی تقریر

۲۸- جداگانہ انتخاب ............ 245

○ ابوالکلام آزاد: ............ 251

۲۹- پیدائش اور بچپن ............ 251

(۱) تقلید اور رسومات سے انکار (۲) الحاد اور شراب (۳) موسیقی سے لگاؤ

۳۰- مسلم مفاد کی مخالفت: مولانا آزاد کی سیاست میں آمد............ 261

۳۱- مسلم یونیورسٹی تحریک سے دشمنی ............ 265

(۱) خدا کو بھی ہار ماننی پڑے (۲) یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی: حق سے ٹکراؤ

(۳) حکومت کی بھیک اور جاہل مطلق لیڈران (۴) شیعہ کالج لکھنؤ

(۵) مسلمانوں کی گمراہی: تعلیم مسلم یونیورسٹی اور مسلم لیگ

(۶) شیطان کے راستے میں خرچ کرنا (۷) اللہ اور ملائکہ کی لعنت یونیورسٹی پر

(۸) مسلم یونیورسٹی کا نصاب تعلیم (۹) صاحبزادہ آفتاب احمد کا جواب

۳۲- قصص اسرائیل: سامری اور سرسید ............ 291

(۱) مولانا اور گاندھی جی کا رام راجیہ



۳۳- محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مولانا کی رائے............ 299

(۱) کانفرنس سے نقصانات (۲) مردے کو زندہ کرنے کی کوشش

۳۴- اتحاد اسلامی، خلافت تحریک اور مسلم یونیورسٹی............ 307

۳۵- وعظ یوسفی: مسلمان انسانیت کی پیشانی پر بدبختی کا داغ............ 317

(۱) تمہارا احساس فنا ہو گیا (۲) ماہ ربیع الاول اور مسلمان

۳۶- کانگریس: ایک صادق العمل جماعت ............ 331

۳۷- خطبۂ رام گڑھ: مولانا کے سیاسی خیالات کا آئینہ ............ 337

(۱) مسلمان اقلیت نہیں ہیں (۲) اپنی آنکھیں بند کر لو

(۳) اسلام سے رشتہ

۳۸- جامع مسجد تقریر ............ 353

(۱) تقسیم کی ذمہ داری (۲) انگریزوں کی غلامی

(۳) ہندوؤں کا حق (۴) ہجرت غلط ہے

۳۹- مسئلہ تاسیس و تجدید ............ 361

۴۰ جمعیۃ العلماء ہند کا نظریۂ قومیت ............ 369

۴۱- مسلم لیگ کا قیام اور تقسیم ہند ............ 379

# عرض احوال

اتفاقاً ہونے والے دو واقعات نے سائنس پڑھنے اور پڑھانے والے کو مسلمانوں کی سیاسی اور مذہبی تاریخ پر ریسرچ کرنے پر مجبور کر دیا۔ جس کے نتیجہ میں چار کتابیں وجود میں آئیں۔ پہلی ''مسیحا کون؟ سرسید یا آزاد'' (۱۹۸۸ء) ایک اُردو ناول ''اتاترک فی کربلا'' (۲۰۰۷ء) دوسرا انگلش ناول "Conflict Zones": Arif Islam(Amazon.in) (2011) اور مضامین کا مجموعہ ''اُمّتِ محمدیہؐ کے مذہبی اور سیاسی مسائل'' (۲۰۱۷ء)۔

شماریات میں پی ایچ ڈی کرنے کے بعد اے ایم یو میں ہی تقرر ہو گیا۔ لیکن ایک سال بعد ہی بصرہ یونیورسٹی عراق میں جوائن کرنے کے لئے استعفیٰ دے دیا۔ ایران عراق وار کا زمانہ تھا دو سال کے اندر ہی یونیورسٹی بند ہو گئی اور بصرہ شہر کھنڈر بن گیا۔ انڈیا واپس آنا پڑا اور یونیورسٹی آف کشمیر میں چند ماہ پڑھانے کے بعد ہی ایک ذاتی سانحہ کی وجہ سے وہاں سے بھی استعفیٰ دے دیا اور اولڈ بوائز لاج علی گڑھ میں ڈیرہ ڈال دیا۔ اب پھر وہی صبح و شام شمشاد مارکیٹ کے ڈھابے، علی گڑھ کے پرانے دوست تھے چند ابھی تک سیاسی کاوشوں میں لگے تھے، ریسرچ کر رہے تھے یا نوکری کی تلاش میں ابھی تک علی گڑھ میں ڈٹے ہوئے تھے۔ شام ہوتے ہی شمشاد مارکیٹ کے ایک خاص ڈھابے پر سب جمع ہو جاتے تھے۔ کبھی کبھی وہیں صبح بھی ہو جایا کرتی تھی۔ ایک رات سب وہاں جمع تھے رات کے دو بجے کا عمل ہوگا کہ ایک رکشہ وہاں آ کر رُکا اور ایک شخص سگریٹ خریدنے کے لئے ڈھابے پر آیا۔ پتا چلا کہ وہ دہلی سے آ رہے تھے اور ہمارے ساتھ بیٹھے ایک شخص کے بڑے بھائی کے دوست تھے۔ وہ بھی ہمارے اصرار پر چائے پینے رُک گئے۔ مسلمانوں کی باتیں ہو رہی تھیں جو کہ علی گڑھ کا خاصہ ہے۔ ذکر آ گیا مولانا آزاد کا۔ ہم سب ان کی تعریف میں رطب اللسان تھے کہ انہوں نے کہا کہ آپ لوگ آزاد کو نہیں جانتے وہ علی گڑھ تحریک کے دُشمن اور یونیورسٹی کے قیام کے سخت مخالف تھے۔ ہم سب ان پر ناراض ہو گئے کہ وزیرِ تعلیم کیسے



یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کر سکتا ہے۔ کسی نے کوئی سخت جملہ بھی کہہ دیا وہ فوراً بغیر چائے پیے اُٹھ گئے اور جاتے جاتے کہا کہ ''خطباتِ آزاد'' دیکھ لیجئے آپ کو پتا چل جائے گا۔ بڑی مشکل سے اُس دن صبح آئی اور میں نے زندگی کی پہلی کتاب خریدی۔ پہلے ہی خطبہ میں جو ''اتحادِ اسلامی'' عنوان سے انہوں نے کلکتہ کی خلافت کانفرنس میں دیا تھا، یونیورسٹی کے قیام کو شیطانی فعل قرار دیا اور کہا کہ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے جو تیس لاکھ روپیہ جمع کیا ہے وہی روپیہ ٹرکی بھیج دیا جائے۔ اُس دن کے بعد میں لائبریری سے ''مسیحا کون''؟ کی تصنیف کر کے ہی باہر آیا جو آپ کے ہاتھ میں ہے۔ مولانا کی ہر تحریر، تقریر، خطوط اور الہلال والبلاغ کے ہر صفحہ کو پڑھنے کے بعد مجھے سرسید روم میں بھی جانا پڑا کہ مولانا کی ہر تحریر میں سرسید، وقار الملک، محسن الملک، یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی اور مسلم لیگ کے خلاف قرآنی آیتیں اور احادیث نازل کی گئیں ہیں۔ بس ایک مشن ہے کہ کسی طرح مسلمان یونیورسٹی نہ بنا لیں اور سرسید و علی گڑھ تحریک کا خاتمہ کیسے کیا جائے۔ علی گڑھ کے نامی گرامی اساتذہ نے جو ہمیں سرسید کے بارے میں بتایا تھا کتابیں اور مضامین لکھے تھے وہ اگر سچ تھا تو مولانا کو سرسید کی حمایت کرنی چاہیئے تھی نہ کہ مخالفت۔ بس اسی سوال نے مجھے سرسید کے تہذیب الاخلاق، گزٹ، تقاریر اور خطوط و مضامین کے مجموعے کھنگالنے پر مجبور کر دیا۔ پتا چلا کہ ہمارے اساتذہ اور خاندانی بزرگوں نے جو کچھ بھی سرسید، آزاد اور مسلم لیگ کے بارے میں بتایا تھا وہ سب غلط اور سیاسی دباؤ کا نتیجہ تھا۔ اسی وجہ سے اس کتاب کا ٹائٹل بہت ادبی نہیں ہے۔

اسی طرح آج سے صرف دَس سال پہلے اسٹاف کلب میں ایک دوست کے ساتھ چائے پی رہا تھا کہ ان کا ایک شاگرد ''صحیح بخاری شریف'' واپس کرنے آیا۔ میں نے کہا کہ یہ کتاب میں پہلی بار دیکھ رہا ہوں اور پڑھنا چاہتا ہوں انہوں نے کتاب میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا کہ یہ اب آپ ہی کی ہو گئی۔ نہ صرف بخاری بلکہ صحاح ستہ کی تمام کتابیں، نہج البلاغہ اور شیعہ احادیث سب میں نے پڑھ ڈالیں۔ قرآن مختلف تراجم کے ذریعہ بہت دنوں سے سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ان کتابوں نے مجھے زندگی کا سب سے بڑا شاک دیا۔ اگر آپ کی کُھلی آنکھوں کے سامنے رکھا چائے کا کپ اژدھا بن کر آپ کے دوست

گلے پڑ جائے تو آپ کو کتنی حیرت ہوگی؟ اس سے بھی سَو گُنا زیادہ حیرت مجھے اس بات پر ہوئی کہ تمام فرقوں کے علماء حضرات ان کتابوں کو رسول اللہ کا کلام سمجھتے ہیں اور مانتے ہیں کہ ان کے بغیر قرآن سمجھ میں ہی نہیں آسکتا جبکہ قرآن واضح اعلان کر رہا ہے کہ ہم نے اسے سمجھنے کے لئے نہایت آسان بنایا۔ میں سَو فیصد کنوینس ہوں کہ یہ کتابیں رسولؐ اللہ اور اسلام کے خلاف ایک گہری سازش کے تحت لکھی گئیں۔ میری بات آپ بالکل مت مانیے گا لیکن کُھلی آنکھوں سے پڑھ کر اس بارے میں فیصلہ کیجئے گا۔ جب تک میں نے یہ کتابیں نہیں پڑھی تھیں علماء کی تقاریر اور کتابوں سے میں بھی ان کو رسولؐ اللہ کا کلام سمجھتا تھا۔ کتب احادیث پڑھنے کے بعد جو کچھ میں نے اسلام سمجھا وہ ''اُمت محمدیہؐ کے مذہبی اور سیاسی مسائل'' میں بیان بھی کردیا۔

کافی غور وخوص کے بعد سیریا، عراق اور یمن وغیرہ میں لاکھوں مسلمانوں کا قتل عام مسلمانوں کے ہی ذریعہ، ریفیوجوں کے یورپ کے دروازوں پر اندر آنے کی بھیک مانگتے ہوئے قافلے، عورتیں اور بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچے، ان سب حالات نے میرے لیے اسلام کی ایک نئی تھیوری وضع کرنے کا راستہ ہموار کردیا کہ ''اللہ تعالیٰ نے رسول ﷺ کے ذریعہ اسلام ان کے انتقال تک (۸؍جون ۶۳۲ء) مکمل کردیا اور قرآن ہمارے حوالے کردیا۔ ان کے بعد جو بھی اکیڈمک یا سیاسی واقعات، خلفاء کا انتخاب، آپسی جنگیں یا کتابیں لکھی گئیں وہ تمام کسی بھی صورت میں اسلام کا سورس نہیں ہوسکتیں وہ سب مسلمانوں کی تاریخ ہیں، اسلام کی نہیں۔ مگر ساری فرقے مسلمانوں کی تاریخ پر ہی ڈفائن کئے گئے ہیں، نتیجتاً اصل اسلام کہیں گم ہوگیا ہے۔

آخری درخواست یہ ہے کہ بنیادی کتابیں پڑھیے آنکھیں اور دماغ کھول کر۔ کسی عالم فاضل کے کہنے پر یقین مت کیجئے قرآن کے مختلف تراجم پڑھیے اور اپنے نتائج خود نکالیے اس لئے کہ مسلم تاریخ میں سچے عالم ہمیشہ سے تقریباً ناپید رہے ہیں اور شاید آئندہ بھی رہیں۔

آخر میں دو واقعات اس کتاب کے ریویس کے بارے میں لکھنا ضروری ہے۔ پروفیسر شافع قدوائی کا فل پیج ریویو قومی آواز کے ایڈیٹر موہن چراغی نے شائع



کیا تھا۔ یہ بالکل نئی تھیسس تھی لہٰذا پورے سال تقریباً ہر قلم کار اور دانشور کے مراسلے شائع ہوتے رہے۔ اسی زمانے میں ایک سینئر علیگ پاکستان سے علی گڑھ تشریف لائے تھے۔ وہ میری کتاب ریویو کرانے کے لئے لے گئے۔ چند ماہ بعد ''نیشن'' اخبار کی کٹنگ انہوں نے بھجوائی۔ وہاں کے ایک بڑے دانشور ایم اے صدیقی کا چار کالم کا ریویو تھا جس میں انہوں نے کتاب کو یک قلم مسترد کردیا تھا۔ اس بنیاد پر کہ ان کے بقول میں نے اس سلسلہ کی عبدالرزاق ملیح آبادی کی اہم کتاب ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' نہیں پڑھی تھی جبکہ اس کتاب کے چھ اقتباسات کو میں نے شامل کیا تھا۔ ''کتاب نما'' دہلی سے شائع ہونے والا مشہور ادبی رسالہ ہے جس میں ہر بار کسی بڑے ادیب کو اس کا اعزازی ایڈیٹر بنایا جاتا ہے۔ ایک بار شمس کمل صاحب کو ایڈیٹر بنایا گیا ان کا ایک مضمون ''اُردو کے موجودہ مصنفین'' کے عنوان سے شاملِ اشاعت ہوا۔ جس میں انہوں نے میرے خلاف خاصہ زہر اُگلا تھا۔ ایک دن مزمل منزل کے قریب ان کے زیرِ تعمیر گھر میں ان سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے ان کے مضامین کی تعریف کی انہوں نے ایک ٹوٹی کرسی میرے لئے بھی منگوالی۔ دورانِ گفتگو میں نے کہا کہ کتاب نما کے اس مضمون میں جن کا آپ نے ذکر کیا ہے وہ عارف الاسلام کون ہیں؟ بُرا سا منھ بنا کر کہنے لگے کہ لاحول ولا کس نامعقول کا ذکر لے بیٹھے۔ میں نے عرض کیا کہ پھر بھی۔ کہنے لگے آپ نہیں جانتے؟ علی گڑھ میں کوئی اُستاد ہے وطن دشمن ضمیر فروش کسی دن پکڑا جائے گا۔ میں نے کہا کہ وہ کتاب تو میں نے بھی پڑھی ہے میں نے بیان کرنا شروع کیا تو وہ حیرت سے سُنتے رہے۔ آخر میں میں نے کہا کہ وہ ضمیر فروش وطن دشمن میں ہی ہوں۔ مارے شرمندگی کے کرسی سے گرتے گرتے بچے۔ کافی دور تک مجھے چھوڑنے آئے میں نے کہا کہ کل آپ کو کتاب مل جائے گی اب پڑھ کر تبصرہ کیجئے گا۔

عارف الاسلام، علی گڑھ

20.09.2020

# حرفِ آغاز

زیر نظر تصنیف ایک لمبے عرصے کی ذہنی کاوشوں پیچ در پیچ سوالات اور علی گڑھ کے ذہین و پر جوش نوجوانوں کی محفلوں میں ہونے والی طویل بحثوں کا نتیجہ ہے جسے میرٹھ کے ناقابل یقین واقعات نے کتاب کی شکل عطا کر دی۔ میرٹھ میں ماہ رمضان ۱۹۸۷ء میں رونما ہونے والے واقعات دنیاءِ جمہوریت کی تاریخ کا تاریک ترین باب ہیں اور ثابت ہو جاتا ہے کہ سادی جمہوریت اکثریت کی آمریت کی بدترین شکل بھی اختیار کر سکتی ہے۔ نکھل چکرورتی نے اعتراف کیا کہ ان واقعات سے نازیوں کی داستانیں پھیکی پڑ گئیں۔ انگریز حاکموں کے دور میں جلیان والا باغ کا واقعہ پیش آیا لیکن وہ حکومت کی پلاننگ نہ تھی بلکہ ایک سرپھرے آفیسر جنرل ڈائر کا ذاتی فیصلہ تھا اس کے برخلاف میرٹھ میں جمہوری حکومت کے وزراء پولس اور پی اے سی کے اعلیٰ افسران نے باقاعدہ ایک لمبی میٹنگ کے بعد مسلم اقلیت کو سبق سکھانے کا فیصلہ کیا اور ننھے معصوم انسانوں کو گھروں سے کھینچ کھینچ کر سر عام گولیوں سے بھون دیا گیا۔ آزاد ہندوستان کی چالیس سالہ تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جس میں کسی نہ کسی بہانے کسی آفیسر یا وزیر کی زیر سرپرستی اقلیت کو ناقابل بیان مصائب سے دوچار ہونا پڑا۔ یہ ظلم وستم ان زیادتیوں کے علاوہ ہیں جو اقتصادی میدان میں مسلمانوں کو پیچھے دھکیل کر کی گئیں۔ ان کو ملازمتوں میں نہ لیے جانے کی پالیسی اپنائی گئی جس کا ثبوت اعلیٰ اور درمیانی درجے کی ملازمتوں کے علاوہ تیسرے اور چوتھے درجہ کے ملازمین میں بھی مسلمانوں کا تناسب ناقابل یقین حد تک کم ہونا ہے۔ لہٰذا تعلیم یافتہ نہ ہونے کا بہانہ بھی نہیں چل سکتا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کی زبان اور کلچر کو سرکاری سرپرستی سے محروم کر دیا گیا۔ بس قدیم زبانیں اور قدیم بھارتیہ سبھیتا ہی واحد سرمایہ قرار دی گئیں۔ تعلیمی اور اقتصادی طور سے پسماندہ تمام طبقات کے لیے قانون میں تحفظات رکھے گئے۔ ملازمتوں اور داخلوں میں رزرویشن کی پالیسی اپنائی گئی لیکن ان مراعات اور تحفظات کا



حقدار صرف ہندوؤں کی نیچی ذاتوں کو قرار دیا گیا۔ لہٰذا اب مسلمان صرف ان پوزیشنوں کے لیے کوشش کر سکتے تھے جن کی امیدوار ترقی یافتہ اعلیٰ ذاتیں پہلے ہی سے موجود تھیں۔ اس طرح نچلی ذاتوں کو تحفظ دینے کی پالیسی کی قیمت بھی مسلم اقلیت کو چکانی پڑی۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان حکمرانی سے بے دخل ہونے کے علاوہ سفید پوشی بھی قائم رکھنے سے معذور ہو گئے۔ اس کے علاوہ لون، لائسنس اور پرمٹ وغیرہ بھی خال خال ہی کسی مسلمان کو دیے گئے ان تمام پالیسیوں نے مسلمانوں کی اقتصادیات کی کمر توڑ کر رکھ دی اور وہ ذلت و خواری کے عمیق اندھیرے گڑھے میں گر گئے۔

ان تمام مسائل کا حل کیا ہے؟ یہ بہت اہم سوال ہے۔ کسی بھی قوم کی تنزلی کے اسباب کا پتہ لگانے کے لیے اس کی تاریخ کا مطالعہ کرنا ضروری ہوتا ہے کیونکہ محکومی کے ایک یا دو اسباب نہیں ہوتے دس بیس یا چالیس سالوں میں نتیجہ نہیں نکلتا بلکہ ایک لمبے عرصے کے اعمال وافکار کا اجتماعی نتیجہ سامنے آتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ۱۸۵۷ء اور ۱۹۴۷ء بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ ۱۷۵۷ء میں جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کی ہار دراصل ہندوستان میں مسلمانوں کی حاکم سے محکوم میں تبدیل ہونے کی شروعات ہے۔ یہ سلسلہ پورے سو سال میں مکمل ہو گیا جب ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور ایک زمانے سے چلی آ رہی مسلمانوں کی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء میں ایک اور اہم تاریخی موڑ آیا اور ملک کا بٹوارہ ہو گیا۔

۱۸۵۷ء سے ۱۹۴۷ء کے سو سالوں پر ان تین شخصیتوں نے بہت گہرا اثر ڈالا۔ سرسید، مولانا آزاد اور محمد علی جناح۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اعمال وافکار پر ان تینوں حضرات کے بہت گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ یوں تو علی برادرس ایک زمانہ میں اہم ترین قائدین بن گئے تھے لیکن یہ عرصہ پانچ سال سے زیادہ کا نہیں ہے اور ان کے خیالات وافکار نے ہندوستانی سیاست پر دوررس اثرات مرتب نہیں کیے۔ خلافت تحریک کا طوفان جس تیزی سے اٹھا اسی تیزی سے دب گیا کہ خود ترکوں نے اس خلافت کو ختم کر دیا تھا جس کی حمایت میں ہندوستان میں تحریک چلائی جا رہی تھی۔ محمد علی جناح کا شمار جدید ہندوستان کی اہم ترین شخصیتوں میں کیا جانا چاہیے کہ سیاسی عمل کے ذریعہ اور بغیر جنگ وجدل انھوں نے دنیا کے نقشہ پر ایک ملک کا اضافہ کیا لیکن جناح صاحب کا شمار ہم فکری انقلابیوں

میں نہیں کر سکتے۔انھوں نے کسی نئی فکر اور فلسفہ کو جنم نہیں دیا بلکہ پہلے سے موجود ''جانشین'' سرسید، محسن الملک، وقارالملک کی قائم کردہ جماعت کو بااثر وزوردار قیادت بخشی اور اس تحریک کا رخ ایک خاص سمت میں موڑ دیا۔

سرسید ایک ایسے قائد ہیں جن کی مثال ہندوستانی مسلمانوں کی پوری ہزار سالہ تاریخ میں نہیں ملتی۔ بلاشبہ شیخ احمد سرہندیؒ اور شاہ ولی اللہؒ اور ان کے جانشینوں کی خدمات شہرۂ آفاق ہیں۔شیخ احمد سرہندیؒ نے اسلام کو دوبارہ قائم کیا اور مجدد الف ثانیؒ کے لقب سے مشہور ہوئے۔ شاہ ولی اللہ نے بھی اسی روایت کو آگے بڑھایا لیکن اس وقت تک مسلمان ہی حکمراں تھے انگریزوں کی کوئی حیثیت نہ تھی اور برادران وطن کسی طرح بھی مسلمانوں سے مقابلہ آرائی کی پوزیشن میں نہ تھے۔اس کے برخلاف سرسید نے جب شعور کی آنکھ کھولی تو مسلمان حاکم سے محکوم ہو چکے تھے۔انگریزوں نے ان کو اقتدار سے محروم کر کے ظلم وستم کا بازار گرم کر رکھا تھا۔

سرسید کو چار محاذوں سے جنگ کرنی پڑی۔ پہلا انگریزوں کو مسلمانوں پر ظلم وستم جاری رکھنے سے روکنا اور دوسرا مسلمانوں کو نئے علوم وفنون کی طرف راغب کرنا، تیسرا مذہب میں عقلیت کو رواج دینا، چہارم آخری زمانے میں کانگریس کے نیشنل ازم کے خلاف محاذ کھولنا۔ یہ تمام کام انتہائی مشکل اور سنگین تھے۔

مسلمانوں کو ادبار سے نکال کر ان کی شان رفتہ واپس لانے کے لیے بہت سے مصلحین نے کوششیں کیں مثلاً سید احمد شہیدؒ اور ان کے رفقا نے تلوار اور مذہبی روایات کے سہارے مجاہدانہ کوشش کی لیکن دنیا بدل چکی تھی جنگی اصول اور ہتھیاروں میں زبردست تغیر آچکا تھا رسل ورسائل کے بے پناہ تیز وسائل ایجاد ہو چکے تھے۔لہٰذا پرانے ہتھیار اور پرانے علوم مسلمانوں کو تنزلی کے گڑھے سے نکالنے میں ناکام رہے بلکہ پہلے سے زیادہ مشکلات ان کے سامنے آ کھڑی ہوئیں۔ ۱۸۵۷ء کا غدر مسلمانوں کے لیے پیام اجل بن کر آیا۔اس غدر نے ان کی رہی سہی حکمرانی ومعیشت وتہذیب اور دوسری قوموں پر برتری کو بالکل ختم کر دیا۔اس وقت کوئی آفت آسمان سے ایسی نہ چلی جس نے مسلمان کا گھر نہ دیکھا ہو کوئی پریشانی ایسی نہیں جو تصویر میں آسکتی ہو اور مسلمانوں پر نہ پڑی ہو۔ایسے وقت میں جب قوم کی کشتی ڈوبنے کے قریب تھی اور قریب تھا کہ ہندوستان مسلمانوں کا اسپین بن جاتا



سرسید اٹھے اور تن تنہا اپنی بے مثال ذہانت اور بے پناہ محنت سے قوم کی کشتی کو طوفان سے صحیح سالم نکال لائے۔ یہ ایسا پیغمبرانہ کام تھا جس کی مثال ملنا مشکل ہے۔سرسید نادان مجاہد کی طرح تلوار لے کر میدان میں نہیں کودے اس لیے کہ وہ سمجھ گئے تھے کہ ہماری تنزلی اور بربادی کی بہت سی وجوہات ہیں کوئی ایک وجہ نہیں ہم خود ذمہ دار ہیں کوئی دوسری قوم نہیں جس سے تلوار کے ذریعہ لڑا جا سکے بہت سے عوامل کا مجموعی نتیجہ سامنے آیا ہے جن کو فرداً فرداً درست کرنا ہوگا۔انھوں نے سب سے پہلے یہ نتیجہ نکالا کہ مسلمانوں کی تنزلی جہالت کے سبب ہے وہ قوم جس کی شروعات اقراء سے ہوئی تھی اب پڑھنے لکھنے کا سبق بھول چکی تھی۔ جس کے پیغمبر نے علم حاصل کرنے کے لیے چین تک جانے کا حکم دیا تھا اب وہ علم سے محض بے بہرہ تھی۔ وہ قوم جس کی کتاب میں سیکڑوں جگہ غور وفکر اور تحقیق کرنے کا حکم دیا گیا تھا اب ان الفاظ تک سے نا آشنا تھی۔علم کے معنی محدود کر دیے گئے تھے۔صدیوں سے علماء کے نزدیک صرف وہی علوم علوم تھے جو سیکڑوں سال پہلے مسلم علماء نے تدوین کر دیے تھے۔وہی احادیث اور قرآن کی وہی آیتیں قابل عمل تھیں جن میں جنت دوزخ اور عبادات کا ذکر تھا۔ کسی نئی فکر اور نئے فلسفہ وسائنس کی ایجاد ان کے نزدیک بے معنی اور بعض اوقات غیر اسلامی تھی۔ مذہب میں بھی غلط روایات کے جاری ہونے سے بہت سی خرابیاں در آئی تھیں۔اب مذہب ہر ترقی کے خلاف ایک روک بن کر کھڑا ہو گیا تھا۔علماء کے نزدیک آگے بڑھنے کا نہیں پیچھے ہٹنے کا نام اسلام تھا۔رفاہِ عام کا نہیں اپنے لیے جنت کمانے کا نام اسلام تھا۔یورپین زبانیں اور ان کے جدید علوم کو سیکھنا محض کافرانہ کام تھا۔دوسری قوموں سے میل جول بڑھانے اور ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے تک سے مسلمان کافر ہو جاتا تھا۔ سرسید نے اجتہاد کیا کہ ساری خرابیوں کی جڑ مسلمانوں کی جدید علوم سے نفرت ہے۔لہٰذا اگر انہیں دنیا میں باعزت مقام حاصل کرنا ہے اور اسلام کی دنیا میں کچھ عزت ہوتی ہے تو بحیثیت قوم نئے علوم اور تعلیم وسائنس کی طرف ہمہ تن متوجہ ہونا پڑے گا۔ یہ کام انتہائی سنگین اور مشکل تھا۔دینی علماء ۱۸۳۵ء میں ہی انگریزی پڑھنے کو ناجائز وحرام قرار دے چکے تھے۔ دینی علماء کی اسلام پر اجارہ داری ہندوؤں میں برہمنوں سے بھی زیادہ تھی۔ ان کو خدشہ تھا کہ مسلمان انگریزی پڑھ کر عیسائی بن جائیں گے۔ایک طرف قوم کو نئی علوم کی

طرف راغب کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا دوسری طرف غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں پر ڈال کر انگریز ان کو ہر طرح برباد اور ذلیل وخوار کر رہے تھے۔ ایسے وقت میں جب کہ ملک نیا نیا غلام ہوا تھا مسلمانوں کی حمایت میں سرسید نے آواز اٹھائی اور غدر کی ساری ذمہ داری خود انگریز افسروں کی نااہلی پر ڈال دی۔ ''اسباب بغاوت ہند'' نے انگریزوں کے رویہ پر بہت گہرا اثر ڈالا اور اس طرح سرسید مسلمانوں کو ان کے ظلم وستم سے آزاد کرانے میں کامیاب رہے۔ جدید تعلیم شروع کرنے کے لیے ضروری تھا کہ خود انگلینڈ جا کر وہاں کے تعلیمی نظام کا مشاہدہ کریں لہٰذا گھر بار رہن رکھ کر انگلینڈ کا سفر کیا اور کئی مہینے تک وہاں کی درسگاہوں، لائبریریوں وغیرہ کی ایک ایک تفصیل جمع کرتے رہے۔ اسی دوران اسلام کی ایک عظیم خدمت بھی انجام دی یعنی ولیم میور کی کتاب ''لائف آف محمدؐ'' کا جواب 'خطبات احمدیہ' شائع کرایا۔ انگلینڈ جانے سے پہلے ہی انگریز دوستوں کے ساتھ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کی وجہ سے کافر تو پہلے ہی ہو چکے تھے اب ''ٹکسالی کرسٹان'' کے لقب سے نوازا گیا۔ ایسے میں کون سنتا؟ جن کے لیے اتنی دور کا سفر کیا تھا انہیں کو اپنا سب سے بڑا دشمن پایا۔ چاروں طرف سے فتوے آنے لگے ہندوستان کا کوئی اخبار کوئی دینی عالم ایسا نہ تھا جس کو سرسید کے کفر پر ذرا بھی شک ہو۔ لیکن وہ قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنا پیغام لے کر دردر بھٹکتا پھرا۔ ہر ہر دروازے پر دست غرض دراز کیا کہیں ہاتھ جھٹکا گیا کہیں دتکارا گیا لیکن اس نے ہمت نہ ہاری آخر کار کچھ نیک بندوں نے اس کے پیغام کو سمجھا اور رشتۂ وفاداری بغرض ترقی قوم استوار کیا۔ اب کچھ مخلص اور جاں نثار ساتھی ان کو میسر آ چکے تھے۔ انہیں کے سہارے یہ بے سروسامان خستہ پا خستہ حال۔ مسلمانوں کی نظر میں مطعون، علماء کے فتوؤں سے مزین، قافلہ جانب منزل چلنا شروع ہوا۔ ہر قدم پر رکاوٹیں کھڑی کی گئیں۔ تہذیب الاخلاق کے اجراء کے ساتھ ساتھ ایک طوفان بلاخیز اٹھا جس نے علی گڑھ تحریک کو جنم لینے سے پہلے ہی ختم کر دینا چاہا۔ کفر کے فتوؤں پر مدینہ ومکہ کے علماء تک کی مہر تصدیق لگوائی گئی اب تو کافر ہونے میں کوئی شک ہی نہ رہ گیا۔ لیکن اب قوم بھی جاگ رہی تھی کفر کے فتوے اب بے اثر ہوتے جا رہے تھے بالآخر ۱۸۷۲ء میں مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند کی بنیاد ڈالی گئی۔ رفتہ رفتہ یہ چھوٹی سی کرن مسلمانوں کی دنیا کے تمام اندھیروں پر چھا گئی۔ علم کا زور پھیلنا شروع ہوا۔ سرسید نے



کامیابی کا سورج طلوع ہوتے ہوئے دیکھا اور خدا کا شکر بجا لائے۔

ابھی سرسید کے کالج کو قائم ہوئے دس سال بھی نہیں ہوئے تھے کہ ۱۸۸۲ء میں لوکل سیلف گورنمنٹ بل کے ذریعے جمہوری انقلاب کی بنیاد ڈالی گئی۔ سرسید اس وقت وائسرائے کونسل کے ممبر تھے۔ انھوں نے اس بل پر نہایت عالمانہ تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ سادی جمہوریت (without reservation for Muslims) میں مسلمان اکثریت کے غلام ہو جائیں گے، نئے انقلاب کی بنیاد ڈالی گئی۔ ۱۸۸۵ء میں قیام کانگریس کے دوررس اثرات سرسید کی نظر سے پوشیدہ نہ رہ سکے۔ سر ہیوم نے اس تنظیم کے سلسلہ میں سرسید سے مشورہ طلب کیا تو انھوں نے واضح الفاظ میں کسی بھی نیشنل تنظیم کے بنائے جانے کی مخالفت کی۔ ۱۸۸۲ء میں ہندوستان نئے دور میں داخل ہو رہا تھا جس طرح ۱۷۵۷ء میں سراج الدولہ کی شکست نئے دور کا آغاز تھی۔ ۱۸۸۲ء میں پارلیمنٹری طرز انقلاب کا بیج بویا گیا جس میں ہندو اور انگریز اشتراک کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کا عظیم کام بھی خدا نے سرسید کے سپرد کیا تھا لہٰذا دو سال تک خاموش رہنے کے بعد ۱۸۸۷ء میں سرسید سیاسی مدبر کی حیثیت سے سامنے آئے اور لکھنؤ میں پہلی بار جلسۂ عام میں کانگریس کے مقاصد کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ قرار دیا۔ مسلمانوں کو من حیث الجماعت کانگریس سے دور رہنے کا مشورہ دیا اور ایک جماعت انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی۔ اس کی ناکامی کے بعد ۱۸۹۳ء میں خالص مسلمانوں کی جماعت محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قائم کرنا جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا آغاز بن گیا۔ اب مسلمان تعلیم اور سیاست دونوں اہم شعبوں میں نئے دور میں داخل ہو گیا تھا اور جدید دور کی زندگی میں اپنا کردار بخیر وخوبی ادا کرنے کے قابل بن چکا تھا۔ کانگریس اس کے باوجود بھی تمام ہندوستانیوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ لیکن ایک بار بھی سرسید سے مفاہمت کرنے کی کوشش نہیں کی گئی۔ اس کے برخلاف ان کو بدنام کرنے کی پوری کوششیں کی گئیں۔ ایک بنگالی اخبار نے لکھا کہ ''ان کا نام تمام ہندوستانیوں کے لیے نشان ملامت بن گیا ہے۔'' سرسید کو صرف یہ شکایت تھی کہ کانگریس کے مطالبات مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہیں اگر ان کو تسلیم کر لیا گیا تو مسلمان محکوم ہو جائیں گے ان کو بالخصوص سادے نیابتی طریقہ پر اعتراض تھا کہ مسلمان ایک ہے تو ہندو چار ہیں

لہٰذا مسلمانوں کے انتخاب میں کامیاب ہونے کی کوئی راہ نہیں ہے۔ دوسرا اعتراض اس مطالبہ پر تھا کہ سروسیز کے لیے مقابلہ کے امتحان کا طریقہ رائج ہو۔ ظاہر ہے کہ مسلمان تعلیم میں کم تھے لہٰذا یہاں بھی وہ کامیاب نہیں ہو سکتے تھے۔ سرسید کے ان اشکالات کو دور کرنے کی کوشش کی جانی چاہیے تھی اور ان سے مشورہ کر کے کانگریس کے مطالبات میں مسلم نقطۂ نظر کو بھی شامل کیا جانا چاہیے تھا کیونکہ سرسید کی قیادت میں تمام مسلمان متحد ہو چکے تھے لیکن ہوا یہ کہ نہ صرف سرسید کو انگریز پرست کہہ کر بدنام کرنے کی کوشش کی گئی بلکہ مسلم مسئلہ کی موجودگی ہی سے انکار کیا گیا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر ہندو مسلم مسئلہ کا حل اسی وقت نکال لیا جاتا تو یہ دونوں ہی قومیں بہت ہی پریشانیوں سے بچ سکتی تھیں اور ہندو مسلم مثل بھائیوں کے امن و آشتی سے اس ملک میں رہتے جیسے کہ رہتے چلے آئے تھے۔ یہ روز روز کے فسادات اور خون خرابہ سے ہندو مسلمان سب بچ جاتے اور ملک جلد آزاد ہو کر آج ترقی کی راہ پر بہت آگے بڑھ گیا ہوتا لیکن مسلم مسئلہ کی موجودگی سے انکار کیا گیا نتیجتاً ناقابل بیان پریشانیوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تین تین جنگیں ہوئیں ہزاروں انسان مارے گئے۔ کروڑوں، عربوں روپیہ کا نقصان ہوا، ملک کی ترقی امن و خوشحالی اور آپسی بھائی چارے کے لیے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی موجودگی کا اعتراف کیا جائے اور کوئی مناسب حل تلاش کیا جائے۔ اسی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کا بھلا ہے۔

سرسید کے انتقال کے بعد محسن الملک، وقار الملک علی گڑھ کی عالیشان رویات کے امین بنے۔ ۱۹۰۱ء میں پھر اردو کو ہٹانے کی تحریک چلی۔ محسن الملک اپنے پیش رو کی تقلید کرتے ہوئے انگریز حاکموں کے سامنے سینہ سپر ہو گئے حکم ہوا کہ کالج کی سکریٹری شپ سے استعفا دے دیں ورنہ کالج کی ایڈ بند کر دی جائے گی۔ تقسیم بنگال اور اس کی تنسیخ کے لیے تحریک چلی تو مسلمانوں کو پھر احساس ہوا کہ کانگریس مسلم مفاد کے خلاف ہے لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ پھر سے کوئی سیاسی انجمن مسلمانوں کے مفاد کے تحفظ کے لیے قائم کی جائے علی گڑھ گزٹ میں محسن الملک نے اس بحث کا آغاز کیا جو اس کے ایڈیٹر بن چکے تھے۔ بہت سے مدبرین کا خیال تھا کہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا پھر سے احیاء کیا جائے۔ آخر وقار الملک نے شملہ ڈیپوٹیشن ترتیب دیا۔ سر آغا خاں کی قیادت میں وائسرائے ہند کو مسلمانوں کے مطالبات پیش کیے گئے اور اس طرح ایک نئے سیاسی دور کا آغاز ہوا۔ اب حالات



بدل چکے تھے۔ علی گڑھ کالج کو قائم ہوئے پچیس سال سے زیادہ ہو چکے تھے اور کئی نسلیں تعلیم یافتہ ہو چکی تھیں۔ لہٰذا ۱۹۰۶ء میں بمقام ڈھاکہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسہ میں وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مسلم لیگ متقبل کے ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے قانونی تحفظات چاہتی تھی۔ لیکن بدقسمتی سے کانگریس ایسے کسی بھی مطالعہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر رہی تھی۔ قیام کانگریس کے بعد سے ہی ملک کے عوام انگریزوں کے خلاف نہیں بلکہ آپس میں ہی لڑتے رہے۔ آج آزادی کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری ہے سب کو متحد ہو کر غریبی اور افلاس سے جنگ کرنی چاہیے تھی لیکن ہوا اس کا الٹا رہا ہے۔

علی گڑھ تحریک کے زیر اثر مسلمان متحد تھے اور تعلیمی ترقی کے راستے پر رواں دواں تھے کہ ۱۹۱۲ء سے مسلمانوں میں تفریق کا دور شروع ہوا جس کی شروعات علی گڑھ کے ایک عربی کے استاد شبلی نعمانی نے سرسید کے انتقال کے فوراً بعد سے ہی ان کے خلاف مضامین لکھ کر کر دی تھی۔ قوم پرستوں کی ایک نئی نسل مسلمانوں میں پیدا ہو گئی اور علی گڑھ تحریک کے تمام پہلوؤں پر حملے کیے گئے۔ مولانا آزاد اس تحریک کے موجد اور روح رواں تھے جنھوں نے مذہبی علماء کے ایک طبقہ کو علی گڑھ تحریک کے خلاف اکسا کر کانگریس کے جھنڈے تلے جمع کر دیا۔ ان حضرات کے ذہن کے کسی گوشہ میں مذہبی علماء کی اس شکست کا بدلہ بھی لینا تھا جو سرسید کے ہاتھوں نئی تعلیم کا اجراء ہونے سے ہوئی تھی۔ مولانا آزاد انتہائی تیز طرار انسان تھے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمان متحد ہیں اور علی گڑھ تحریک میں ان کا کوئی مقام نہیں بن سکتا کہ وہ خود جدید تعلیم یافتہ نہ تھے تو انھوں نے کانگریس کی مدد حاصل کی اور نیشنل ازم کے علمبردار بن کر ابھرے۔ یہ کامیابی کا سب سے آسان اور سیدھا راستہ تھا۔ اسّی فیصد آبادی ان کے ساتھ تھی باقی رہے مسلمان جتنے بھی ان کے ساتھ آ جاتے زیادہ ہی زیادہ تھے۔ مولانا آزاد نے نہ صرف یہ کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی بلکہ مسلمانوں کے اتحاد اور ایک جماعت کے اصول پر بھی زبردست حملہ کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو زبان کی افادیت کو بھی شدید دھکا پہنچایا۔ علی گڑھ تحریک کے زیر اثر اور سرسید کی ذاتی کاوشوں کے نتیجہ میں آسان، سلیس اور دلنشیں زوردار اسلوب ایجاد ہو چکا تھا اس سے پیشتر استعمال ہونے والے اسلوب میں تصنع، بناوٹ اور رنگینئ عبارت پر زور دیا جاتا تھا۔ ہم قافیہ اور ہم وزن

جملوں کا استعمال کیا جاتا تھا۔ فارسی و عربی کے بھاری بھرکم اور مشکل الفاظ کا استعمال عام تھا۔ سرسید اوران کے ہمنواؤں نے اردو سے ان تمام خرابیوں کو دور کر کے اس میں سائنسی مزاج پیدا کردیا تھا۔ مولانا آزاد نے پھر سے اس پرانے اسلوب کو اختیار کیا اور قرآنی آیات واحادیث کا بے جا استعمال اپنی تحریروں وتقریروں میں شروع کیا۔ مولانا کا الہلال قرآنی آیات سے بھرا رہتا تھا۔ انھوں نے مسلمانوں کے ذہن سے خطاب نہیں کیا بلکہ مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنے کے تمام حربے استعمال کیے۔ مولانا کی تحریروں کو اگر غور سے پڑھا جائے تو اس میں معنی تلاش کرنا مشکل پڑ جاتا ہے۔ بس محض خوبصورت الفاظ فارسی و عربی تراکیب کا ایک مجموعہ نظر آتا ہے جس کے سحر میں قاری اس کے معنی تلاش نہیں کر پاتا۔ اس کے علاوہ قرآنی آیات اور اسوۂ حسنہ وسیرت رسولؐ سے اتنی مثالیں مولانا جمع کر دیتے ہیں کہ عقیدت کے مارے مسلمانوں کا ذہن کام کرنا بند کر دیتا ہے اور وہ یہ نہیں سمجھ پاتا کہ آیا جن مطالب ومقاصد کے لیے مولانا نے ان کو استعمال کیا ہے وہ وہاں قابل استعمال ہیں کہ نہیں۔ ایسا تو نہیں کہ آیت نازل ہوئی ابوجہل اور ابولہب کے لیے اور استعمال کر دی مسلم یونیورسٹی تحریک کے قائدین کے لیے۔ آیت نازل ہوئی اسلام کی فتح اور جہاد کے لیے استعمال کر دی ملک کی آزادی اور انگریزوں سے لڑائی کرنے کے لیے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ ایک بہت دلچسپ موضوع تحقیق کا ہوسکتا ہے کہ آیا جن مطالب ومقاصد کے لیے مولانا نے قرآن کی آیتیں پیش کی ہیں وہ وہاں قابل استعمال ہیں کہ نہیں۔ کوئی دینی ادارہ اس تحقیق کا بیڑا اٹھائے تو یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ مولانا کے اسلوب پر اور اردو کی افادیت کو نقصان پہنچانے پر ایک الگ سے تصنیف کی ضرورت ہوگی۔ ہم نے اس کتاب میں علی گڑھ کی تعلیمی اور سیاسی تحریکوں کا ہی ذکر کیا ہے۔ خلافت تحریک میں بھی مولانا ایک خاص مقصد سے شریک ہوئے تھے۔ ان کا مقصد خلافت کا تحفظ ہرگز نہ تھا بلکہ وہ خلافت کے پلیٹ فارم کو بھی کانگریسی نیشنل ازم کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کر رہے تھے۔ ان کی جتنی بھی تقریریں خلافت کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ہیں ان سب میں وہ یہی تاثر دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ''آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے عمل چاہتا ہے۔'' لہٰذا جب کمال اتاترک نے خلافت ختم



کر دی تو مولانا نے اس کو مبارکباد دی اور آخری خلیفہ کو غاصب کے نام سے یاد کیا۔ خلافت تحریک کے پلیٹ فارم سے وہ پان اسلام ازم کے نظریہ کی تبلیغ بھی کرتے تھے اور نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ تمام دنیا کے مسلمانوں کو ایک قوم بتاتے تھے لیکن اسی مسلم قومیت کو کانگریس کے پلیٹ فارم سے غیر اسلامی قرار دیتے تھے اور اس سے زیادہ قابل نفریں کوئی چیز نہ تھی۔ مولانا کی قوم پرستی کو تو سبھی جانتے ہیں ان کا مسلم قومیت ایک قائد ایک جماعت کا تصور بھی ملاحظے کی چیز ہے۔ ''ملت اسلامیہ ہندوستان میں اس طرح زندگی بسر کر رہی ہے کہ نہ تو ان میں کوئی رشتۂ انسلاک ہے نہ وحدت ملت کا کوئی رابطہ نہ کوئی قائد وامیر ہے محض ایک بھیڑ ہے ایک انبوہ ہے ایک گلہ ہے، جو ہندوستان کی آبادیوں میں بکھرا ہوا ہے اور یقیناً ایک حیات غیر شرعی وجاہلی ہے۔'' اتنا واضح تضاد شاید ہی کسی دوسرے لیڈر کے خیالات میں پایا جاتا ہو مگر یہ تضاد نہ تھا بلکہ یہ مولانا کی ضرورت تھی کانگریسی نیشنل ازم کو مضبوط کرنے کے لیے وہ ہر طرح کا حربہ استعمال کر سکتے تھے اور جہاں جس بات سے فائدہ ہوتا وہی بات کہتے تھے۔

ہندوستان آزاد ہوا اور ساتھ ہی دو حصوں میں تقسیم ہوگیا۔ کانگریس کی تمام زیادتیوں کے عینی گواہ ہونے کے باوجود (جس کا اقرار انھوں نے انڈیا ونز فریڈم میں کیا ہے) انھوں نے مسلمانوں کو ہی تقسیم کا ذمہ دار قرار دیا او اس طرح مسلمانوں میں احساس جرم پیدا کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کے اندر مسلمانوں کے تئیں نفرت پیدا ہوئی کہ یہ اپنا حصہ لے کر بھی یہاں موجود ہیں۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ پاکستان تمام مسلمانوں کے لیے نہیں مانگا گیا تھا بلکہ صرف یہ مطالبہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقوں کو خودمختار آزاد ریاستوں میں تبدیل کر دیا جائے لہٰذا آزاد بھارت میں مسلمان بھی اتنے ہی حقدار ہیں جتنے کہ ہندو لیکن آزادی کے بعد پہلی تقریر میں ہی انھوں نے یہ تسلیم کر لیا اور مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ اب یہ ملک ہندوؤں کا ہے۔ جامع مسجد کی تقریر میں کہا کہ ''وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے۔'' مولانا اگر جناح صاحب کی قیادت کو باطل ثابت کرنا چاہتے تھے اور اگر مسلمانوں کے ہمدرد تھے تو انھیں یہ کہنا تھا کہ اب میں مسلمانوں کے مفاد کا نگہبان ہوں اور مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوسکتا۔ اس کے برخلاف تقسیم ملک کا الزام کانگریس پر سے ہٹا کر مسلمانوں پر عائد

کردیا اور اپنی وزارت کے عیش و آرام میں کھو گئے۔ حیدرآباد پولس ایکشن میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے اردو ختم کی گئی، انگنت فسادات ہوئے، مسلمانوں پر زندگی کے تمام راستے تنگ کردیے گئے لیکن مولانا خاموش تماشائی بنے رہے بلکہ ان کے کسی جذبہ کو شاید تسکین بھی ملی ہو کہ تم نے مجھے لیڈر مانا ہی کب تھا لہٰذا اب بھگتو۔ لکھنؤ مسلم کنونشن میں مسلم قائدین کو خوفزدہ کیا اور یہ وعدہ لیا کہ اب مسلم اتحاد کے نام پر کوئی جماعت نہ ہوگی اور مسلمان متحد نہ ہوں گے محض کانگریس میں شریک ہوں گے اپنا کوئی سیاسی تشخص باقی نہ چھوڑیں گے حالانکہ خلافت کانفرنس میں یہ فرما چکے تھے ''اسلام نے مسلمانوں کے تمام اعمال حیات کے لیے بنیادی حقیقت یہ قرار دی ہے کہ کسی حال میں متفرق الگ الگ اور متشتت نہ ہوں۔ ہمیشہ مجتمع متحد اور نفس واحد ہو کر رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت میں جابجا اجتماع وحدت پر زور دیا گیا۔'' لکھنؤ کنونشن میں مولانا پر وحی نازل ہوئی اور قرآن وسنت کے احکامات تبدیل ہوگئے۔ انسانیت کی تاریخ میں ایسے کسی دورے معیار کے لیڈر کی مثال ملنا مشکل ہے۔

مسلم یونیورسٹی ایکٹ ۱۹۵۲ء میں مولانا نے مسلم طلبا تک کے لیے دینی تعلیم کو لازمی مضمون کے درجہ سے ہٹا کر اختیاری بنادیا اور یہ کہا کہ ایک سیکولر ملک میں ایسی کوئی مراعت حکومت نہیں دے سکتی اس کے علاوہ یونیورسٹی کورٹ کے اندر غیر مسلموں کی شرکت کا دروازہ کھول دیا۔ ۱۹۲۰ء کے ایکٹ میں واضح طور سے لکھا ہوا تھا کہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں نے اپنی ضرورت کے لیے قائم کی ہے۔ لیکن مولانا کے ایکٹ سے یہ ضروری تعریف نکال دی گئی اور مسلم تشخص ختم کر کے سیکولر بنادیا گیا۔ اس طرح مولانا آزاد نے علی گڑھ تحریک پر ایک کاری ضرب لگائی جس کے اثرات آج تک محسوس کیے جارہے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر مولانا کے اس رویہ کی تشریح کیا ہوسکتی ہے؟ جہاں تک ہم نے غور کیا ہے چار عوامل پر نظر جاتی ہے۔ پہلی یہ کہ مولانا نے جس وقت شعور کی آنکھ کھولی تو بڑے بڑے مسلم قائد موجود تھے اور مسلمانوں کی قیادت علی گڑھ کے ہاتھ میں تھی۔ یہ تمام قائدین اعلیٰ تعلیم یافتہ اور مسلمانوں میں مقبول تھے لہٰذا مولانا نے قوم پرستی کا راستہ چنا اور اپنے علم قرآن وحدیث کو نیشنل ازم کے درست ثابت کرنے میں استعمال کرنے لگے۔ کانگریس کے لیے ایسے کسی شخص کا ساتھ دینا بہت بڑی فتح تھی۔ مولانا پہلے آدمی ہیں جنھوں



نے سیاست میں مذہب کو استعمال کیا اور سیکولر سیاست کو خاص مذہبی نقطۂ نظر سے درست ثابت کرنے کی کوشش کی۔ لہٰذا کانگریس نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور مولانا کی پوزیشن ہمیشہ کے لیے مستحکم ہوگئی۔ دوسری وجہ اس رویہ کی یہ ہوسکتی ہے کہ وہ اور ان کے ساتھی علماء کرام علی گڑھ سے اس شکست کا بدلہ لینا چاہتے تھے۔ جو مذہبی علماء کو سرسید کے ہاتھوں نئی تعلیم شروع کرنے کی صورت میں اٹھانی پڑی تھی اور اس وجہ سے ان کا اثر مسلم سماج پر سے ختم ہوگیا تھا۔ تیسری وجہ مولانا کا خاندانی پس منظر ہوسکتا ہے کہ ان کا خاندان ہمیشہ سے ہی ہر طرح کی بدعات ورسومات کا عادی تھا اور سرسید اپنے آپ کو وہابی کہتے تھے اور وہابیت مولانا کے نزدیک کفر کے مترادف تھی۔ چوتھی وجہ جو ہمارے نزدیک زیادہ وزن رکھتی ہے وہ ہے ان کا وحدت ادیان کا نظریہ۔ اس نظریہ کے سبب ان کی مسلم قومیت سے دلچسپی بالکل ختم ہوگئی تھی۔ ان کا یہ عقیدہ گیتا کے عقیدے سے میل کھاتا ہے کہ راستے جدا جدا ہیں منزل ایک ہے۔ اسلام اور دوسرے مذاہب میں اختلافی مسائل مثلاً رسالتؐ اور پرانی شریعتوں کی منسوخی کو وہ اتحاد کی خاطر زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے لہٰذا تفسیر قرآن میں جگہ جگہ نظریۂ وحدت ادیان کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنے سیاسی نظریہ کی تشریح وتبلیغ کا کام بھی تفسیر سے لینے کی کوشش کی ہے۔ اس کے علاوہ اشعار کا استعمال اور بے دریغ لفاظی کے نمونے بھی ان کی تفسیر میں ملتے ہیں۔

یہ کتاب مسلمانوں کے لیے راہ فلاح کی تلاش کے جذبہ سے لکھی گئی ہمیں امید ہے کہ یہ تصنیف آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے راہ عمل متعین کرنے میں معاون ثابت ہوگی۔ میں اس کام کو پورا کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا تھا اگر مخلص دوستوں کا تعاون حاصل نہ ہوتا جنھوں نے قدم قدم پر مفید مشوروں سے نوازا اور میری ہمت افزائی کرتے رہے۔ میں خاص طور سے قاضی ضیاء الاسلام، احمد سلیم خاں پیرزادہ، ڈاکٹر بصیر احمد خاں، ڈاکٹر علی امیر، مسٹر عباس ضمیر، ڈاکٹر محمد خورشید، ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی، ڈاکٹر محمد شاہد، اور مسٹر یوسف جمال صاحبان کا ممنون ہوں جنھوں نے ہر طرح میری مدد کی اور میرا حوصلہ بڑھاتے رہے۔ اس تصنیف کے دوران بہت سے ایسے دن تنہائی میں بھی گزرے جب کہ مجھے اپنے معصوم بچوں احمد شہاب اور صبوحی یاسمین کے ساتھ ہونا چاہیے تھا لیکن کئی مرتبہ اس کام کی تکمیل کی خواہش نے مجھے ان سے دور رکھا۔

عارف الاسلام، علی گڑھ (۱۹۸۸ء)

# علم طاقت ہے اور دولت بھی

انسانوں اور قوموں کو زندگی دینے والی سب سے اہم چیز علم ہے اور جو قومیں حصول علم میں پسماندہ رہ جاتی ہیں غلامی اور بے عزتی کی زندگی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔ سچے قائدین اور ہمدردانِ قوم جن کو ہمیشہ زمانہ نے یاد رکھا ہے ان کی خدمات تعلیم کے میدان میں جا ہے بہت زیادہ نہ ہوں لیکن دنیا میں ایک بھی مثال ایسے رہنما کی نہیں مل سکی کہ جس نے خود اپنی قوم کو جن کی کہ وہ رہنمائی کا دعویدار تھا تعلیم اور علم حاصل کرنے سے روکا ہو یا ایسی کوششوں کی مخالفت کی ہو جو کہ قوم کو تعلیم اور علم کی طرف راغب کرنے کے لیے جاری ہوں۔ ہاں ایک ایسی مثال ضرور ہماری رہنمائی کا دعویٰ کرنے والوں میں سے ملتی ہے جس نے بالواسطہ اور بلاواسطہ ہندوستانی مسلمانوں کو تعلیم اور قومی ہمدردی کے میدان سے گھسیٹ کر لاعلمی اور مضرت رساں سیاست کے اندھیروں میں ڈبونا چاہا۔ کبھی جنگ آزادی کے نام پر کبھی خلافت تحریک کے نام پر اور کبھی صحابۂ کرام کے اسوۂ حسنہ کے نام پر اور کبھی خاص قرآنی آیات کا حکم بیان کر کے۔ مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی نسبت یہ دعویٰ بہت سے لوگوں کو شاید حیران کر دے لیکن آزادی کے بعد مولانا کی شخصیت پر بہت سے پردے ڈالے گئے ان کے گمراہ عزائم کو مسلمانوں کے لیے مرہم بنایا گیا۔ ریڈیو، ٹیلیفون، کتابیں، اخبارات غرض یہ کہ تمام ذرائع نشر و اشاعت اس کام کے لیے وقف کر دیے گئے کہ پچھلے دو سو سالوں میں اگر ہندوستانی مسلمانوں کا کوئی سچا رہنما اور ہمدرد پیدا ہوتو وہ مولانا آزاد تھے۔ اس لیے کہ آزاد ہندوستان میں یہ کام ایک قوم کی سب سے بڑی سیاسی ضرورت بن گیا ہے۔ آزاد ہند کے اکثر مسلم دانشوروں نے ذاتی مصلحتوں اور بدلے ہوئے ماحول کے سیاسی تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے وہی کیا جو کہ ان کے لیے اور ایوان حکمرانی میں مسند نشیں شاہان وقت کے لیے مفید تھا حالانکہ تقریباً تمام ہی مصنفین اس بات کے قائل ہیں کہ مولانا آزاد ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم الشان تعلیمی (مسلم یونیورسٹی کی) تحریک اس کے بانی سرسید اور اس تحریک کے علمبردار محسن الملک، وقار الملک اور سر آغا خاں وغیرہ کے



شدید مخالف تھے اور الہلال و البلاغ کی اشاعت کا مقصد علی گڑھ تحریک یا مسلمانوں کو باعزت بنانے کی تحریک کی مخالفت کرنا تھا۔ لیکن ان الفاظ کو بہت چھپا کر اور مضامین کے ایسے تناظر میں لکھا گیا کہ قاری اس ایک جملے کو کوئی خاص اہمیت نہیں دیتا اور اس کو صرف ایک سیاسی اختلاف سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے۔ جواہر لال نہرو نے اپنی مشہور تصنیف ڈسکوری آف انڈیا میں اعتراف کیا ہے کہ مولانا آزاد نے علی گڑھ تحریک پر سخت حملے کیے جو قدامت پرستی اور اینٹی نیشنل نظریہ کی حامل تھی۔ مولانا نے ایسے خیالات اور نظریات کو مشتہر کیا جس نے علی گڑھ تحریک کی بیخ کنی کر دی۔

ABUL KALAM AZAD ATTACKED THIS STRONG-HOLD OF CONSERVATISM AND ANTI-NATIONALISM NOT DIRECTLY BUT BY SPREADING IDEAS WHICH UNDERMINED THE ALIGARH MOVEMENT.1

ان نظریات اور خیالات کو مشتہر کرنے کا خاص ذریعہ پہلے الہلال تھا اور بعد میں اس کے بند ہونے پر البلاغ تھا۔ ان رسائل کے صفحات سرسید مسلم یونیورسٹی کی تحریک، محسن الملک، وقار الملک، مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کی نسبت مخالفانہ مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔

پروفیسر رشید احمد صدیقی مولانا کے بہت بڑے مداح تھے یہاں ہم ان کے ایک مضمون سے اقتباس نقل کرتے ہیں جس سے مولانا کا علی گڑھ تحریک کا مخالف ہونا ثابت ہوتا ہے۔

''اصولاً وہ علی گڑھ یونیورسٹی کی تحریک اور مسلم لیگ پروگرام کی تائید میں نہ تھے۔''۲

بعد غور کامل بھی وہ اصول سمجھ میں نہیں آسکتے کہ جن کی بنا پر مولانا آزاد مسلم یونیورسٹی تحریک کی حمایت میں نہ تھے ان اصولوں کو واضح کرنے کے لیے ہی ہم نے تحقیق کرنے کا تہیہ کیا ہے کہ جن کی بنا پر مولانا آزاد مسلم یونیورسٹی جیسی عظیم الشان تحریک کے مخالف تھے۔

اسی طرح وزارت اطلاعات و نشریات حکومت ہند کی طرف سے ''جدید ہندوستان کے معمار'' سیریز کے تحت شائع ہونے والی کتاب ''ابوالکلام آزاد'' میں البلاغ کی ایک عبارت کو نقل کرتے ہوئے عرش ملسیانی نے اعتراف کیا کہ ''انھوں نے ۱۹۱۵ء البلاغ نکالا۔ اسکی بھی وہی شان تھی وہی گھن گرج مسلمانوں کو سرسید کی انگریز پرستی سے متنبہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بت بنایا ہے اور اس کا نام رکھا ہے ''سرسید کی پالیسی'' یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک مخصوص بت ہوتا تھا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا ہے اور اس کے

اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم وعمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔'' مولانا کی یہ ضرب کلیمی علی گڑھ تحریک کے لیے مہلک ثابت ہوئی۔''[۳]

اس کتاب میں مولانا کی یہ خدمت بتائی گئی ہے کہ انھوں نے علی گڑھ کی روایات کی بیخ کنی اپنے خیالات کی نشر واشاعت کے ذریعہ کی کہ یہ تحریک قدامت پرستی کی علمبردار تھی۔

''آزاد نے قدامت پرستی کے قلعہ پر حملہ کیا۔ یہ حملہ براہ راست نہیں بلکہ اپنے خیالات کی ترویج واشاعت کے ذریعہ کیا گیا۔ اس نے علی گڑھ کی روایات کی بیخ کنی کردی۔'' اور ظاہر ہے کہ ان کے خیالات کی ترویج واشاعت کا ذریعہ ان کے مشہور رسائل الہلال والبلاغ ہی تھے۔ یہ چند مثالیں ہم نے حامیان آزاد کی صرف اس لیے پیش کیں تا کہ ہمارے اوپر مولانا کے مخالف ہونے کا الزام نہ لگ جائے اور یہ نہ کہا جائے کہ مولانا علی گڑھ تحریک کے خلاف تھے۔ ہمارا کوئی نیا خیال ہے بلکہ یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ رائے ان لوگوں کی بھی ہے جو مولانا آزاد کی تعریفوں میں اپنا تمام زور قلم صرف کردیتے ہیں۔ ہماری رائے میں مولانا کا مقصد حیات ہی یہ تھا کہ نہ صرف مسلم یونیورسٹی کی تحریک بلکہ علیگڑھ تحریک یا باالفاظ دیگر مسلمانوں کو باوقار و باعزت بنانے کی تمام تحریکوں کی مخالفت کی جائے اور انھوں نے تمام زندگی اس فرض کو نبھایا نہ صرف اپنے دعووں اور دلیلوں سے بلکہ قرآنی آیات کو بھی اپنے دلائل کی صداقت ثابت کرنے کے لیے بے موقع وبے محل استعمال کیا جس شخص کے دل میں ذرا بھی خوف خدا ہے ہمارا یہ دعویٰ ہے کہ وہ قرآن شریف کو اس بے دردی اور غلط طریقے سے استعمال نہیں کرسکتا۔

مولانا آزاد کے سیاسی پلیٹ فارم پر آنے کا وہی زمانہ ہے جب مسلم یونیورسٹی کی تحریک ملک میں پھیل چکی تھی۔ غیر منقسم ہندوستان کا کوئی مسلمان اس تحریک سے الگ نہ تھا۔ گاؤں کے دہقانوں، کسانوں، غریب مزدوروں سے لے کر تعلیم یافتہ نوکر پیشہ افسران اور بڑے بڑے زمینداروں اور جاگیرداروں تک تمام کی تمام ملت یونیورسٹی حاصل کرنے کے لیے اپنے تن من اور دھن کی بازی لگائے ہوئے تھی۔ آخر اس زمانے میں یعنی ۱۹۱۰ء کے آس پاس ۳۰ لاکھ روپیہ جمع کرنے کی شرط جو حکومت نے لگائی تھی وہ ملت مسلمہ کے عام چندہ کے بغیر کیسے پور ہو سکتی تھی۔ اس زمانے کے ۳۰ لاکھ روپیہ آج کے ۳۰۰ کروڑ روپے سے بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ آج اگر ہم سے کہا جائے کہ یونیورسٹی بنانے کے لیے ۳۰۰ کروڑ روپیہ مسلمان جمع کردیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ۳۰ لاکھ روپیہ بھی ہم تمام مل کر جمع نہیں کرسکتے۔



یہ تھا فیضان سرسید کی تعلیمی اور اقتصادی طور سے پسماندہ قوم نے ۳۰ لاکھ روپیہ یونیورسٹی کے نام پر اپنا پیٹ کاٹ کر، طلباء نے اپنا جیب خرچ کم کرکے، عورتوں نے اپنے زیورات قربان کرکے غرض بے شمار قربانیاں دے کر جمع کیا۔ اس زبردست جذبۂ ایثار کو مولانا مسلمانوں کے جوش کو ضائع کرنے سے تعبیر کرتے ہیں اور رہنمایان ملت کی اس غلط روی کے متعلق اپنے افسوس کا اظہار الہلال میں شائع اپنے ایک مضمون میں کرتے ہیں جس کا عنوان تھا ''نشۂ شام کی نصف شب یا مسلم یونیورسٹی'' عنوان پر غور کریں اور دیکھیں کہ '' آج تک مسلمانوں میں کوئی بھی تحریک ایسی پیدا ہوئی ہے جو شہروں قصبوں سے لے کر دیہاتوں تک پہنچ جائے؟ ہر گھر میں اس کا چرچا ہو ہر جگہ اس کا جوش وخروش۔ کوئی طبقہ اور فرقہ اس سے خالی نہ ہو، ممبروں پر سے اس کے لیے واعظ کہا جائے اور خانقاہوں میں اسکے ذکر پ حال وقال ہو...... یونیورسٹی کا قافلہ جدھر سے گزر جائے لوگ جوش ونشاط سے بے خود ہو کر اس طرح قدم لینے کو دوڑیں گویا ملائے اعلیٰ اور قدسیان عالم بالا عرش الٰہی کو چھوڑ کر دنیا میں اتر آئے ہیں......ہم رو سکتے ہیں مگر اپنے آنسو ہر شخص کو نہیں دکھا سکتے ہیں کہ بدبخت ملت کا اس قدر قیمتی جوش کس بے دردی سے ضائع کردیا گیا تو ہمارے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتے ہیں اور حیران رہ جاتے ہیں کہ رہنمایان ملت کی اس غلط روی کی نسبت کیا کہیں......[۴]

جوش تو ضرور ضائع ہوا لیکن مولانا آزاد کا۔ رہنمایان ملت صحیح راستے پر تھے اور ان کے دلوں میں خلوص تھا اور تعمیر کی لگن۔ لہٰذا یونیورسٹی بنی اور خدا کے فضل وکرم سے آج تک قائم ودائم ہے اور انشاءاللہ رہتی دنیا تک رہے گی۔

گزشتہ تمہید سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ نہ صرف ہماری نظر میں بلکہ مولانا کے مدح نگاروں کی رائے میں بھی مولانا مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں کے مخالف تھے اس ضمن میں اور ثبوت فراہم کرنے سے پہلے ہم ہندوستان میں مسلمانوں اور دوسری قوموں کی تعلیمی حیثیت کا تقابل کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔

○

**حواشی:**

(۱) جواہرلال نہرو، ڈسکوری آف انڈیا، ص:۳۵۱ (۲) علی گڑھ میگزین، انتخاب نمبر، ۷۶-۱۹۷۵ء، ص:۳۳۱

(۳) عرش ملسیانی، ابوالکلام آزاد ۱۹۷۴ء، ص:۳۱ (۴) الہلال، ۱۰/ستمبر ۱۹۱۷ء، ص:۵

# ہندوستانیاں کی نئی تعلیم کا آغاز

**راجہ رام موہن رائے:**

راجہ رام موہن رائے کی شخصیت نئے ہندوستان کی اساس ہے۔ وہ پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے اہل ہند کی غلامی کی وجوہات پر گہرائی سے غور کیا اور بجائے انگریزوں کو غاصب اور ظالم بتانے کے اپنی قوم کو نئی تعلیم اور سائنس کی طرف متوجہ کیا۔

۲۲ رمئی ۱۷۷۲ء کو راجہ رام موہن رائے بنگال کے رادھانگر گاؤں میں پیدا ہوئے۔ یہ گاؤں اس وقت ضلع بردوان میں تھا۔ راجہ رام موہن رائے ایک کٹر برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ اس خاندان کے افراد عرصۂ دراز سے مرشدآباد کے مسلم گھرانوں کی ملازمت میں تھے۔ ان کے والد رام کانت رائے ایک کٹر ہندو تھے اور سختی کے ساتھ شاستروں کی تعلیمات پر عمل کرتے تھے۔

جب راجہ رام موہن رائے اٹھارویں صدی کے آخری حصہ میں تاریخ ہند کے اسٹیج پر نمودار ہوئے تو مسلم حکومت منہدم ہو رہی تھی۔ انگریز جو ہندوستان میں تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے خود کو رفتہ رفتہ حکمرانوں میں تبدیل کرتے جا رہے تھے۔ جنگ پلاسی نے بنگال کی قسمت پر پندرہ سال پہلے ہی یعنی غدر سے پورے سو سال پہلے، ۱۷۵۷ء میں مہر لگادی تھی۔ جدید ہندوستان کی تاریخ میں یہ حقیقتاً تاریک ترین دور تھا۔ پرانا مسلم معاشرہ اور تمدن پارہ پارہ ہو چکا تھا۔ قدیم معاشرتی نظام کے کھنڈرات ہر طرف بکھرے نظر آتے تھے۔ ابھی تک کوئی ایسی طاقت وجود میں نہیں آئی تھی جو اس ملبے کو صاف کردے۔ پرانی بنیادوں پر نئی تعمیر کی کوشش بھی نظر نہیں آتی تھی۔ مردہ رسموں، منجمد دستوروں اور نامعقول تعصّبات نے ہندوستانیوں کے سرچشمۂ حیات کو مسدود کر دیا تھا۔ علم کی دولت ہاتھ سے جاتی رہی تھی غرض یہ کہ سخت تاریکی کا دور تھا۔ مغرب انگریزوں کی معیت میں صرف تجارتی نمائندے کی حیثیت



سے نہیں بلکہ تاریخ کے آلۂ کار کی حیثیت سے داخل ہوا تھا جس کے نصیب میں ہندوستان کو خوابِ غفلت سے بیدار کر کے نئے علوم اور سائنس کی طرف متوجہ کرنا تھا۔

## قدیم تعلیم بے فائدہ ہے

راجہ رام موہن رائے کو احساس تھا کہ اس وقت ہندوستان میں جو نظام تعلیم رائج ہے اس میں زبردست اصلاح کی ضرورت ہے۔ سائنسی طریقۂ استدلال کو رواج دینے کی ضرورت تھی۔ ضرورت تھی کہ سنسکرت کی جگہ علوم طبعی، فزکس، کیمسٹری، ریاضی وغیرہ کی تعلیم کا بندوبست کیا جائے۔ ۱۸۲۳ء میں جب کمپنی کی حکومت نے ہندو پنڈتوں کے تحت ایک سنسکرت اسکول قائم کرنے کا ارادہ کیا تا کہ اس تعلیم کا بندوبست کیا جاسکے جو ہندوستان میں پہلے سے رائج تھی۔ تو رام موہن نے اس فیصلے کے خلاف احتجاج کیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر حکومت ہندوؤں کو نئی تعلیم اور اصل علم سے بے خبر رکھنا چاہتی ہے تو ٹھیک ہے لیکن اس کو اپنی رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال ضرور رکھنا چاہیے۔ یہ خط دراصل آنے والے ہندوستانی سماج میں ہونے والی تبدیلیوں کی عکاسی کرتا تھا اور اس وقت تک مسلمانوں کو اس کی ہوا بھی نہ لگی تھی کہ ملک کس راہ پر جا رہا ہے۔ رام موہن رائے نے لکھا:

> ''ہندو پنڈتوں کے تحت حکومت ایک سنسکرت کالج قائم کر رہی ہے تا کہ وہ تعلیم دی جاسکے تو پہلے سے ہندوستان میں رائج ہے......ان درسگاہوں میں طالب علم وہ چیز سیکھیں گے جو دو ہزار برس پہلے سے معلوم ہیں البتہ صرف بے مصرف اور کھوکھلی دقیقہ سنجیوں کا اضافہ ہوجائے گا جن کا اس عرصہ میں مفکروں نے اضافہ کر دیا ہے۔ اگر برطانوی قوم کو اصل علم سے بے خبر رکھنا مقصود ہوتا تو بیکن کے فلسفے نے متکلمین کی تعلیمات کی جگہ اسکولوں میں لے لی ہوتی وہ تعلیم جہل و لاعلمی کو برقرار رکھنے کے لیے سب سے زیادہ مناسب ہے بشرطیکہ برطانوی مجلس قانون ساز کی یہی حکمت عملی ہو لیکن چونکہ حکومت کا مدعا برطانوی رعایا کی ترقی ہے اس لیے ضروری ہے کہ زیادہ معقول اور روشن خیال نظام تعلیم کو رواج دیا جائے جس میں ریاضی طبعی فلسفہ،

کیمسٹری اناٹومی دیگر علوم مفیدہ کے ساتھ پڑھائے جائیں۔''[۱]

رام موہن رائے پر وہی الزامات ہندو پنڈتوں نے لگائے جو پچاس سال بعد سرسید پر دینی علما نے لگائے۔ کہا کہ یہ شخص سنسکرت ختم کرانا چاہتا ہے اور ہندوؤں کے دھرم کو نشٹ کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ ہر طرف یہ بات پھیل گئی کہ رام موہن رائے سے ہندو دھرم کو سنکٹ ہے جس طرح سے پنڈتوں کے دلائل میں کوئی دم نہیں تھا اسی طرح سرسید کے خلاف لگائے الزامات عقل و مذہب کی کسوٹی پر پورے نہیں اترے لہٰذا دونوں مقامات پر پنڈتوں اور مذہبی علماء کے طبقے کو آخر کار اسی راہ پر آنا پڑا جس پر کہ رام موہن اور سرسید لانا چاہتے تھے۔

راجہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے ہندو سماج میں پھیلے ہوئے توہمات اور بت پرستی پر کتاب لکھی ان کے باپ عقائد میں بہت کٹر تھے۔ انھوں نے رام موہن رائے کو گھر چھوڑنے کا حکم دیا۔ رام موہن نے ہندو دھرم کی بالکل نئی تفسیر کی جس کے بغیر ہندو سماج کو ترقی یافتہ بنانے کی بات سوچنا ہی فضول تھا۔ ان کے مذہبی رجحانات اور خیالات کا اندازہ مندرجہ ذیل اقتباس سے ہوتا ہے جو ان کی مشہور کتاب ''تحفۃ الموحدین'' سے لیا گیا ہے:

> ''عادت یا کسی چیز سے مسلسل ربط کے سبب جو کچھ وجود میں آتا ہے اور ان داخلی صفات میں جو اقوام یا افراد کی فطری خواہش کا نتیجہ ہوتی ہیں فرق کر لینے والے لوگ خوش نصیب ہیں یہ لوگ اپنی حتی المقدوس کوشش سے یہ تحقیق کرتے ہیں کہ مختلف قوموں کے مذہبی عقائد میں کون سے عقائد واصول سچے ہیں اور کون سے جھوٹے۔ ایسا کرنے میں یہ لوگ تعصب و جانبداری سے بری ہوتے ہیں۔ یہ لوگ ان مسائل کی بھی تفتیش کرتے ہیں جنہیں سب لوگوں نے یہ تحقیق کیے بغیر تسلیم کر لیا ہے کہ ان کی وکالت کرنے والوں کی کیا حیثیت ہے۔''[۲]

رام موہن رائے کے مذہبی خیالات یقینی طور سے اس زمانے کے مروجہ ہندو دھرم سے بہت مختلف تھے، اسی لیے ان کو شروع میں پنڈتوں اور عام ہندوؤں کی زبردست مخالفت سہنی پڑی۔ لیکن رام موہن رائے کی اسی خصوصیت اور انداز فکر نے ان کے ذہن کو ہندوؤں کے لیے نئے علوم کی تعلیم جاری کرنے کی طرف متوجہ کیا۔ انھوں نے اپنے کیریئر کا آغاز سرسید کی



طرح ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت سے کیا اور کمپنی کے ریو نیوڈپارٹمنٹ میں نوکری کر لی۔ ملازمت کے دوران انہیں یورپ اور انگلستان کے سیاسی تغیرات کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقع ملا۔ ان کے انگریز افسروں کے پاس جو اخبارات ورسائل انگلستان سے آیا کرتے تھے وہ ان کا بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کرتے تھے۔ اپنی اسی ملازمت کے دوران میں انھوں نے انگریزی سیکھنی شروع کر دی۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ راجہ رام موہن رائے کی تحریک خاص ہندوؤں کے لیے تھی۔ انھوں نے کبھی بھی یہ نہیں کہا کہ میں ہندو اور مسلمان دونوں کے لیے تعلیم کا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ اسکے برخلاف سرسید نے ہمیشہ ہی یہ کہا کہ وہ تمام ہندوستانیوں کا بھلا چاہتے ہیں اور کالج کے دوازے ہندوؤں کے لیے بند نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی کوششوں سے نہ صرف مسلمانوں میں بلکہ شمالی ہند کے ہندوؤں میں بھی تعلیم کا ذوق شوق پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گیا اور انھوں نے اپنی تعلیمی کوششیں تیز کر دیں اور ولایت میں جا کر تعلیم حاصل کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ لیکن بنگال میں جس وقت موہن رائے کی تحریک پر ہندوؤں نے نئے علوم حاصل کرنا شروع کیے تو مسلمانوں کو ہوا تک نہ لگنے دی اور خاموشی سے رستہ طے کرتے رہے کہ بقول حالی:

> ''باوجود یہ کہ ہندو ۱۸۱۲ء سے انگریزی تعلیم میں مصروف تھے مگر وہ ایسے چپ چاپ یہ رستہ طے کر رہے تھے کہ جیسے تنہا خور آدمی ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے اور پڑوسیوں کو خبر نہیں ہونے دیتا۔ یہاں تک کہ پچاس برس گزر گئے اور مسلمانوں میں کسی قسم کی جنبش پیدا نہیں ہوئی۔ مگر سرسید کی چیخ و پکار صرف مسلمانوں کو ہی جگانے والی نہ تھی بلکہ اس نے شمالی ہندوستانیوں کے دونوں صوبوں میں اس سرے سے اس سرے تک تعلیم کا غل ڈال دیا۔ اگرچہ انگلستان کی تعلیم پر ہندو پہلے ہی سے متوجہ تھے اور سرسید کی تحریک نے سوا اس کے کہ ترقی کی رفتار کسی قدر تیز کر دی کوئی بڑا نمایاں اثر اس پر نہیں کیا لیکن اس میں شک نہیں کہ ولایت کی تعلیم کا خیال ان میں

صرف مسلمانوں کی ریس اور سرسید کے شور وغل سے پیدا ہوا۔''[۳]

نئے علوم اور سائنس کی طرف راغب کرنے کی کوشش کامیاب ہوئیں اور رام موہن رائے ۱۸۱۶ء میں ڈیوڈ ہرے (ایک انگریز آفیسر) کے تعاون سے کلکتہ میں ہندو کالج قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔

ہندوستان کالج کے قیام کی پہلی میٹنگ سپریم کورٹ کے چیف جسٹس سر ہائیڈ ایسٹ کے مکان پر ۱۴ر مئی ۱۸۱۶ء کو ہوئی۔ انگریز چیف جسٹس سے رام موہن رائے نے درخواست کی کہ ممتاز ہندو اپنے بچوں کی تعلیم کے لیے ایک تعلیمی ادارے کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں جس میں ایسے آزادانہ طریقے سے تعلیم دی جائے جیسے یورپ میں دی جاتی ہے[۴]۔

اس میٹنگ میں شہر کے ممتاز ہندوؤں نے شرکت کی اور اسی وقت پچاس ہزار روپیہ اکٹھا ہو گیا۔ ۱۸۱۶ء میں پچاس ہزار روپیہ کی قیمت کا اندازہ لگانا بہت مشکل نہیں ہے۔

اس کالج نے بہت ترقی کی اور اس کے طالب علموں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا چلا گیا۔ ۱۸۲۵ء میں ۴۳۲ طالب علم اس کالج میں زیر تعلیم تھے۔ دسمبر ۱۸۲۱ء میں رام موہن رائے نے ایک بنگالی ہفت روزہ سمبد کمودی شائع کرنا شروع کیا انھوں نے اس ہفت روزہ کے ایک شمارے میں ایک مضمون لکھا جس میں حکومت سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ غریب ہندو بچوں کو مفت تعلیم دینے کے لیے ایک اسکول قائم کرے۔

## مسلمانوں کا انکار

جب یہ سب کچھ ہو رہا تھا اور ہندوؤں میں تعلیم کا اتنا شوق اور ولولہ پیدا ہو چلا تھا مسلمانوں کو اپنی نسلوں کے مستقبل کا کچھ خیال نہ تھا بلکہ اس کے برخلاف وہ ایسی تمام کوششوں کو خلاف مذہب خیال کرتے تھے۔ بعض اوقات کسی خاص لمحہ پر کئے گئے فیصلے صدیوں پر اثر انداز ہوا کرتے ہیں۔ اسی طرح کا ایک فیصلہ مسلم مذہبی علماء اور رئیسوں نے کیا۔ جب لارڈ میکالے کی اسکیم کے تحت یہ قرار پایا کہ ہندوستانیوں کو بھی یورپین سائنس اور دیگر علوم پڑھائے جانے کا انتظام کیا جائے تو مذہبی علماء نے آٹھ ہزار عالموں اور رئیسوں کے دستخطوں سے یہ درخواست گورنمنٹ میں گزاری کہ ایسا کرنا خلاف مذہب ہے اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ حکومت کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔ اس



واقعہ سے گیارہ سال پہلے کلکتہ میں راجہ رام موہن رائے اور معزز ہندوؤں و پنڈتوں سے سنسکرت کالج کے قیام کی مخالفت کی تھی اور کہا تھا کہ ہمیں سائنس پڑھانے کی ضرورت ہے نہ کہ سنسکرت۔ دراصل دو تہذیبوں اور اس کے عالموں کے متضاد ردعمل نے ہی مسلمانوں اور ہندوؤں کی ترقی میں اتنا بڑا فرق پیدا کر دیا۔ اگر اسی وقت مسلمان شاہ عبدالعزیز کے فتوے پر عمل کرتے ہوئے نئی تعلیم کو قبول کر لیتے تو شاید صورتحال آج بالکل دوسری ہوتی۔ سید محمود نے اس واقعہ کو اپنی ایک تقریر میں یوں بیان کیا ہے:

> ''نہایت ہی قابل غور یہ امر ہے کہ جب کلکتہ میں ایسا ہی ایک سنسکرت کالج کھولنا چاہا جیسا کہ مسلمانوں کے لیے مدرسہ تھا تو تمام راجوں اور رئیسوں کی طرف سے ایک عرضداشت بہ سربراہی راجہ رام موہن رائے ۱۸۲۴ء کو بخدمت گورنر جرنل ہند بھیجی گئی کہ ہم کو سنسکرت دانی کی ضرورت نہیں ہے۔ ہمیں اپنے عوم سکھاؤ اور اپنی تدابیر بیر ملک بناؤ۔ ادھر ایک ہم بدنصیب مسلمانوں کی قوم تھی کہ جب ۱۸۳۵ء میں انصاف پسند لارڈ میکالے کے زور سے یہ فیصلہ ہو گیا کہ یورپین سائنسز اور انگلش لٹریچر کی ہندوستانیوں کو تعلیم دی جائے اور گورنمنٹ نے اسکولوں اور کالجوں کے کھولنے اور ان کی تعلیم کے لیے وظائف دینے پر توجہ کی تو مسلمانوں نے ایک عرضداشت تیار کی جس پر آٹھ ہزار مسلمان رئیسوں، علماء اور مشائخ کے دستخط تھے کہ ہم انگریزی نہیں پڑھتے، ہماری زبان عربی فارسی ہے وہ سمجھتے تھے کہ گورنمنٹ کا ارادہ ہندوستانیوں کو کرسٹان بنانے کا ہے۔ علوم انگریزی پر توجہ کرنا دین عیسوی کی اشاعت کی تدبیر ہے۔''[۵]

اس واقعہ کو حالی نے یوں بیان کیا ہے:

> ''کلکتہ کے مسلمانوں نے جب یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار عالموں اور رئیسوں کے دستخط تھے اور جس کا حاصل یہ تھا کہ

گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر اس قدر توجہ کرنا صاف وکالت کرتا ہے
کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔''۶

علماء اور روسا کی روش انتہائی غیر دانشمندانہ تھی اور کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو کہ عقلی علوم کی حمایت میں آواز اٹھا سکے اور آنے والے زمانہ کے بارے میں اندازہ لگا سکے کہ ملک کس روش پر جارہا ہے۔ تمام لوگ عوام کیا خواص کیا ایک بدترقسم کے تعصب میں پڑے ہوئے تھے۔ تقلید نے ان کے ذہنوں کو بند کر رکھا تھا اور قدم صحیح راستے پر اٹھنے کے لیے معذور تھے۔ یہ حالات ۱۸۷۲ء تک رہے۔ یہاں تک کہ سرسید نے ایک مدرسہ علی گڑھ میں کھولا پورے پندرہ سال کی انتھک کوششوں اور جان لیوا جدوجہد کے بعد کسی نہ کسی طرح مسلمانوں کے ایک محدود طبقہ کو عقلی علوم حاصل کرنے پر رضامند کرلیا۔ اس مدرسہ کی شروعات بہت محدود پیانے پر چند طلبا سے ہوئی۔ اس زمانہ تک کلکتہ، مدراس اور بمبئی میں پوری پوری الحاقی یونیورسٹیاں بن چکی تھیں اور ہندوؤں نے تعلیم کے میدان میں عظیم الشان سبقت حاصل کرلی تھی۔ اس وقت کے مسلم علماء اور رئیسوں کی حالت کا اندازہ لگانے کے لیے بادشاہ وقت کے خیالات کے بارے میں سرسید کی رائے کافی مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ''دلی کے معزول بادشاہ کا یہ حال تھا کہ اگر اس سے کہا جاتا کہ پرستان میں جنوں کا بادشاہ آپ کا طابع دار ہے تو وہ اس کو صحیح سمجھتا...... وہ کہا کرتا تھا کہ میں مکھی اور مچھر بن کر اڑ جاتا ہوں اور لوگوں کی اور ملکوں کی خبر لے آتا ہوں اور اس بات کو وہ اپنے خیال میں سچ سمجھتا تھا اور درباریوں سے اس کی تصدیق چاہتا تھا اور سب تصدیق کرتے تھے۔''۷

انیسویں صدی کے آغاز زمانہ جس میں راجہ رام موہن رائے نے ہندوؤں کی نشاۃ ثانیہ کی بنیاد ڈالی اور ان کو خواب غفلت سے بیدار کر کے ایک طاقت ور اور ترقی پسند قوم بنادیا مسلمانوں کے لحاظ سے ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ کا انتہائی تاریک ترین دور تھا۔ اسی زمانہ میں مغلیہ سلطنت کا زوال اپنے عروج کو پہنچا۔ ہندوستان میں انگریزوں کے قدم مضبوط ہوئے۔ مسلمان جاہ ومنصب سے محروم ہوئے اور انگریز حکمرانوں کے غیظ وغضب کا نشانہ بنے۔ بادشاہ وقت کا یہ عالم کہ ہندو مہاجنوں سے قرض نہ ملے تو صرف قلعہ کے ہی ملازمین کی تنخواہیں دینا مشکل پڑ جاتا تھا۔ اکبر ثانی نے اقتصادی پریشانیوں سے مجبور ہوکر



رام موہن رائے کو انگلستان بھیجا تا کہ وہ نام نہاد بادشاہ کی طرف سے ایسٹ انڈیا کمپنی کو پنشن بڑھانے کی درخواست گزاریں۔ پرستانوں کے جنوں کے بادشاہ کو اپنا طابع دار سمجھنے والا شاہ دہلی ایسٹ انڈیا کمپنی کا وظیفہ خوار تھا۔ لہٰذا رام موہن رائے کی کوششوں سے کمپنی نے ان کے وظیفے میں تین لاکھ روپیہ سالانہ کا اضافہ منظور کیا۔

''انگلستان پہنچتے ہی رام موہن رائے نے شہنشاہ دہلی کے مطالبات کے سلسلے میں ایک عرضداشت ایسٹ انڈیا کمپنی کے کورٹ آف ڈائرکٹرز اور لندن کے بہت سے باا ثر اشخاص کو پیش کردی تھی حالانکہ شہنشاہ دہلی کے کل مطالبات تسلیم نہیں کیے گئے۔ لیکن ۱۳ر فروری ۱۸۳۳ء کو اس کا کچھ حصہ منظور کرلیا گیا۔ کورٹ آف ڈائرکٹرز نے شہنشاہ دہلی کے وظیفے میں تین لاکھ روپے سالانہ کا اضافہ منظور کرلیا۔۸

بادشاہ وقت کی کسمپرسی کا یہ عالم تھا لیکن وہ بہرحال بادشاہ تھا حکم چاہے کمپنی بہادر کا ہو لیکن ملک بہرحال ابھی بادشاہ کا تھا اور سیکڑوں سال کی حکمرانی کا نشہ مسلمانوں کے ذہنوں سے آسانی سے اترنے والا نہ تھا حتیٰ کہ آج تک مسلمان یہ کہتے ہوئے سنے جاتے ہیں کہ حکمرانی کرنا یہ ہندو کیا جانیں جدید تعلیم کی طرف متوجہ ہونے اور وقت کے تقاضوں کے متعلق اپنے اندر صلاحیتیں پیدا کرنے کا کوئی جذبہ مسلمانوں میں پیدا نہ ہوا تھا۔ اس کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک مسلمان جہاں بھی گئے فاتح کی حیثیت سے گئے اور ہر جگہ اپنے علوم وفنون کو رواج دیا۔ انہیں پہلی بار ایک فاتح قوم سے واسطہ پڑا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ انہیں اپنی زبان اور اپنے علوم ترک کر کے دوسرے علوم اور کوئی دوسری زبان سیکھنی پڑ رہی تھی۔ صدیوں حکومت کرنے کے بعد اب مسلمانوں میں یہ صلاحیت باقی نہ رہی تھی کہ وہ خود کو حالات کے مطابق تبدیل کرسکیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے رویہ کا تجزیہ کرتے ہوئے اخبار انڈین ڈیلی نیوز نے مسلمانوں کی غیر دانشمندی کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

''ہندوؤں کے سامنے اس طرح کے فخر وامتیاز کے مٹنے اور ایسے حالات سے نپٹنے کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ اس لیے انھوں نے آسانی سے سر تسلیم خم کردیا اور جس صورت حال کا ان کو سابقہ تھا اس سے اپنے آپ کو ساز کرلیا جہاں وہ حکومت نہیں کرسکتے تھے وہاں انھوں نے حکم

بر داری قبول کر لی۔ اس طرح بیشتر حالات میں انھوں نے جہاں کہیں جیسا موقع دیکھا اس میں اپنے آپ کو ڈھال لیا......مسلمانوں کا طرزِ عمل دانشمندانہ نہ تھا۔ انھوں نے اپنے آپ کو تمام ملازمتوں سے علیحدہ رکھ کر اس تعلیم سے خود کو محروم کر لیا جسے انگریزی حکومت یا دوسری ایجنسیاں ان کے لیے فراہم کرتی تھیں اور جو ان کو سرکاری نوکری کے لیے سزاوار بنا سکتی تھی۔ اس دوران ہندو بالخصوص کمزور حقیر بنگالی نے اس حقیقت کو پا لیا کہ علم زور بھی ہے اور زر بھی۔'' ۹

علوم میں زور بھی تھا اور آج بھی ہے۔ نئی تعلیم اور ترقی سے مسلمانوں میں ہمیشہ ہی سے بیزاری رہی ہے اس زمانہ سے آج تک۔ اور یہ بات خاص طور سے قابل توجہ ہے کہ وہ لوگ جو کہ دینی قیادت کی کرسی جلیلہ پر رونق افروز رہے ہیں انھوں نے ہی اکثر نئے علوم اور سائنس کو مذہب کے مدمقابل کھڑا کر کے مسلمانوں کو نئی تعلیم سے روکا۔ چنانچہ سب سے پہلے حکومت کی تعلیمی کوششوں کی شروعات پر یہ الزام لگایا گیا کہ حکومت مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔ ہندو پنڈتوں نے بھی شروع میں بہت شور وشرابہ برپا کیا کہ راجہ رام موہن رائے ہندو دھرم نشٹ کرنا چاہتا ہے لیکن یہ شر چند سال سے زیادہ برقرار نہ رہ سکا اور ہندوؤں کا روشن خیال حقیقت پسند اور دور اندیش طبقہ بہت جلد ان پر حاوی ہو گیا اور پنڈتوں کی ایک نہ چلی۔ اس کے برخلاف اگر یہ کہا جائے کہ مذہبی علماء کا طبقہ آج تک سائنس کی تعلیم کا مخالف ہے چاہے اب زبان سے نہ کہے لیکن عملی طور سے وہ اس کی شدید مخالفت کرتا ہے تو یہ حقیقت سے شاید زیادہ دور نہ ہو۔ اس کی بہت سی مثالیں ہیں مثلاً یہ کہ دینی اور سائنسی تعلیم کو الگ الگ خانوں میں بانٹنا اور ان کے لیے جدا جدا مدرسے قائم کرنا۔ اس طرح مسلم سوسائٹی میں دو اجنبی طبقے پیدا ہو رہے ہیں جو کہ ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔ سائنسی ترقیات سے فائدہ اٹھانے میں سب لوگ یکساں شامل ہیں مثلاً یہ کہ بلب کی روشنی سے گھر روشن کریں گے، پنسلین سے ٹی پی کا علاج کریں گے، اینٹی بائوٹکس سے انفکشن کو روکیں گے، کاروں ریلوں اور ہوائی جہازوں میں سفر کریں گے، بیڈروم اور ڈائننگ روم میں الگ الگ ٹیلیفون لگائیں گے، چھاپہ خانوں میں کتابیں چھپوائیں گے اور لاؤڈ اسپیکر کو اذان کے



لیے استعمال کرنے کے علاوہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر زور دار اور گرجدار تقریریں کریں گے۔ یہ تمام فوائد تو الحمدللہ ہم ضرور حاصل کریں گے لیکن سائنس کے کافر ہونے میں شک نہیں ہے۔ پروفیسر عبدالسلام نے تہذیب الاخلاق میں ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ وہ کچھ یورپین حضرات کے ساتھ بیٹھے تھے تذکرہ نکل آیا پسماندہ ممالک میں غریبی اور جہالت کا اور ان کو درپیش پریشانیوں کا تو کسی ایک صاحب نے عبدالسلام صاحب کو مخاطب ہو کر کہا کہ ''سلام کیا تم سمجھتے ہو کہ جن لوگوں نے دنیا کے علوم میں ذرہ برابر اضافہ نہیں کیا ہے ان کو ترقی یافتہ یا خوشحال بنانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔'' کسی بھی غیور قوم کے لیے یہ واقعہ تازیانۂ عبرت ہے یہ تو سائنس کی بدقسمتی ہے کہ اب تک مسلمان نہ ہوئی۔ لیکن جو چیز کہ خاص اللہ نے اتاری اور رسول اللہ نے پیش کی یعنی اسلام اس کا ہم نے کیا حال کیا وہ بھی سب کے سامنے ہے۔ ۷۲ فرقوں کی جھوٹی حدیث کو بنیاد بنا کر زائد از دو فرقے مذہبی علماء پیدا کر چکے ہیں۔ ایک قرآن ایک رسول اور اسلام ہزار طرح کا، مسجدیں الگ الگ نماز کے طریقے جدا جدا اور سب ایک دوسرے کی نظر میں گمراہ۔

❍

**حواشی:**

(۱) ربندر ناتھ ٹیگور، ہندوستانی ادب کے معمار، راجہ رام موہن رائے، ساہتیہ اکادمی، ترجمہ نورالحسن نقوی، ص:۳۳، ۱۹۷۴ء

(۲) ایضاً

(۳) حالی، حیات جاوید، ص:۳۶۳، ۱۹۸۲ء، ترقی اردو بورڈ

(۴) ایضاً

(۵) گزٹ جنوری ۱۸۹۴ء، ص:۳۴

(۶) حیات جاوید، ص:۳۵

(۷) اسباب بغاوت ہند، ص:۸۰۶، ضمیمہ حیات جاوید

(۸) سمیندر ناتھ ٹیگور، ہندوستانی ادب کے معمار، راجہ رام موہن رائے، ساہتیہ اکادمی، ترجمہ نورالحسن نقوی، ص:۶۱، ۱۹۸۴ء

(۹) انڈین نیوز، ۱۳؍ جنوری ۱۸۷۷ء، بحوالہ نورالحسن نقوی سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ص:۱۱۲

# سرسید احمد خاں

# وہ ناصح اور ہوں گے جن کا کہنا ٹل بھی جاتا ہے

اس تنزلی کے عالم میں جب کہ چاروں طرف جہالت کا اندھیرا چھایا ہوا تھا کہ ہاتھ کو ہاتھ نہ سجھائی دیتا تھا راہ عمل اور صراط مستقیم کہیں کھوگئی تھی مسلمانان ہند کی سب سے عظیم الشان اور ہمہ گیر شخصیت کی ۱۷/اکتوبر ۱۸۱۷ء کو دہلی میں پیدائش ہوئی۔

سرسید احمد خاں باپ کی طرح حسینی سید ہیں ان کا سلسلۂ نسب ۳۶ واسطوں سے آنحضرت ﷺ تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد میر متقی کا لال قلعہ میں بہت زیادہ رسوخ تھا اور بادشاہ کی خواب گاہ تک ان کی باریابی تھی۔ سرسید بچپن میں اپنے والد کے ساتھ اکثر لال قلعہ میں جاتے تھے۔ سرسید کے حقیقی نانا دبیر الدولہ امین الملک خواجہ فرید الدین احمد دربار اکبر شاہ ثانی کے وزیر اعظم رہے۔ وہ اپنے خاندان میں سب سے زیادہ باقبال لایق دانشمند صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔ سرسید کی والدہ خواجہ فرید کی تین بیٹیوں میں سب سے بڑی تھیں۔ ان میں اولاد کی تربیت کا خداداد ملکہ تھا۔ سرسید کی زندگی اور شخصیت پر سب سے زیادہ ان کی والدہ کا اثر رہا ہے۔ ان کی والدہ کی شخصیت کے بارے میں چند واقعات کا نقل کرنا بہت نصیحت آموز ہے جس زمانہ میں کہ سرسید کی عمر گیارہ سال تھی انھوں نے ایک نوکر کو جو بہت پرانا اور ضعیف تھا کسی بات پر تھپڑ مارا۔ اس واقعہ کی جب ان کی والدہ کو خبر ہوئی تو انھوں نے سرسید کو گھر سے نکال دیا اور نوکروں کے ذریعہ باہر سڑک پر کھڑا کر دیا۔ اور یہ تین دن تک اپنی ایک خالہ کے یہاں رہے۔ آخر کار جب سرسید نے نوکر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگی تب کہیں جا کر ان کا قصور معاف ہوا اور گھر میں رہنے کی اجازت ملی۔ سرسید کی والدہ جیسی سمجھدار اور دانشمند تھیں اس سے زیادہ نیک دل اور پاک سیرت تھیں۔ ایک بار سرسید کی والدہ اور ایک لاوارث بوڑھی عورت جس کی خبر گیری وہ کیا کرتی تھیں ایک ساتھ بیمار ہوئیں اور دونوں کو حکیم نے ایک ہی معجون تجویز کی۔ یہ سوچ



کر کہ قیمتی معجون اس بوڑھیا کو کون بنوا کر دے گا۔ سرسید کی والدہ نے اپنی ساری معجون بڑھیا کو کھلا دی، جس زمانہ میں سرسید دہلی میں منصف تھے تو ان کی والدہ نے نصیحت کی کہ جہاں تمہیں ہمیشہ جانا ضروری ہو وہاں کبھی سواری پر جایا کرو اور کبھی پیادہ پا جایا کرو کہ زمانہ کا کچھ اعتبار نہیں، کبھی کچھ ہے اور کبھی کچھ۔ اسی طرح سرسید ایک شخص سے انتقام لینا چاہتے تھے جب ان کی والدہ کو یہ ارادہ معلوم ہوا تو انھوں نے کہا کہ ''سب سے بہتر تو یہ ہے کہ درگزر کرو۔ اور اگر بدلا ہی لینا چاہتے ہو تو اس زبردست حاکم کے انصاف پر چھوڑ دو۔ جو ہر بدی کو پوری سزا دینے والا ہے اپنے دشمنوں کو دنیا کے کمزور حاکموں سے بدلا دلوانا بڑی نادانی کی بات ہے۔'' ان واقعات سے یہ دکھانا مقصود تھا کہ انصاف پسندی جیسا کہ پہلے واقعہ سے ظاہر ہوئی، خدمت خلق جیسی کہ دوسرے واقعہ سے پتہ چلی اور وسیع النظری اور حقیقی شان اسلامی یہ فضیلتیں سرسید کے اندر اپنے خاندان سے وراثتاً ملیں۔

سرسید نے رسم بسم اللہ کی تقریب کے بعد قرآن مجید پڑھنا شروع کیا۔ ان کے گھر میں قدیم سے کوئی نہ کوئی استانی نوکر رہتی تھی۔ سرسید نے استانی ہی سے سارا قرآن ناظراں پڑھا اس کے بعد ان کو پڑھانے کے لیے مختلف ذی علم اور بزرگ حضرات معمور ہوتے رہے۔ فارسی اور عربی کی بہت سی ابتدائی کتابیں پڑھنے کے بعد ان کو اپنے خاندانی علم ریاضی پڑھنے کا شوق ہوا جس میں ان کے ننیہال کے لوگ دلی میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ماموں سے ریاضی کی تعلیم کی شروعات کی۔ اس کے بعد آلات رسد کو جاننے کا شوق ہوگیا اور بہت سے رسائل ان موضوعات پر اپنے ماموں سے پڑھے۔ حکیم غلام حیدر خاں سے جو ایک خاندانی حکیم تھے طب کا علم حاصل کیا اور چند ماہ تک ان کے پاس مطب بھی کیا اور پھر پڑھنا چھوڑ دیا جب انھوں نے پڑھنا چھوڑا ہے اس وقت ان کی عمر اٹھارہ انیس برس کی تھی۔ اس کے بعد بطور خود کتابوں کے مطالعہ کا برابر شوق رہا اور دہلی میں جو حضرات اہل علم اور فارسی دانی میں نام ور تھے جیسے صہبائی، غالب اور آزردہ وغیرہ ان سے ملنے کا اور علمی مجلسوں میں شامل ہونے کا اکثر موقع ملتا رہا۔

اس زمانے کا ذکر کرتے ہوئے سرسید نے اپنی غفلت و بدمستی کے متعلق لکھا ہے:

''ہم بھی اسی رنگ میں مست تھے۔ ایسی گہری نیند سوتے تھے کہ

فرشتوں کے بھی اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔کیا کیا خیالات ہماری قوم کے
ہیں جو ہم میں نہ تھے اور کون سی کالی گھٹائیں ہماری قوم پر چھارہی
ہیں جو ہم پر چھائی ہوئی نہ تھیں۔ جب رند تھے تو فرہاد سے بڑھ کر
تھے۔جب زاہد کشک تھے تو نہایت ہی اکھڑ تھے۔ جوصوفی تھے تو
رومی سے برتر تھے اور اپنی قوم کے غمخوار۔‘‘۲؎

آغاز شباب میں رنگین محفلوں کا بھی شوق رہا۔دہلی کے عام رئیس زادوں کی طرح رقص کی محفلوں میں بھی شریک ہوتے تھے۔لیکن سرسید ابھی ۲۱ سال ہی کے تھے کہ ۱۸۳۸ء میں ان کے والد کا انتقال ہوگیا۔اس سے پہلے ان کے بھائی کا انتقال ہو چکا تھا۔ان دونوں واقعات نے سرسید کی زندگی کا رخ بدل دیا اور وہ دوبارہ سے اکتساب علم کی طرف مائل ہوگئے۔ مالی مشکلات سے بچنے کے لیے انھوں نے عزیز واقارب کے مشوروں کے باوجود بجائے قلعہ کی نوکری کرنے کے ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کی۔

## نوکری کا آغاز

اس وقت وہ عدالت کی کارروائیوں اور انگریزی قوانین سے محض ناواقف تھے لہٰذا سب سے پہلے اپنے خالو مولوی خلیل الرحمٰن (جو کہ اس وقت دہلی میں صدر امین تھے) کے ساتھ کچہری میں کام سیکھنا شروع کیا۔کام سیکھنے کے بعد وہیں ملازم ہوگئے۔اس کے بعد فروری ۱۸۳۹ء میں آگرہ میں نائب منشی ہوکر منتقل ہوگئے آگرہ میں انھوں نے منصفی کے متعلق قوانین دیوانی کا ایک خلاصہ تیار کیا۔اسی کتاب کی بدولت کمشنر آگرہ نے ان کے لیے عہدۂ منصفی کی سفارش کی لیکن ابھی یہ تقرر ہو بھی نہ پایا تھا کہ اس عہدہ کے لیے مقابلہ کا امتحان جاری ہوگیا۔سرسید بھی امتحان میں شریک ہوئے اور پہلے سال ہی میں یہ امتحان امتیازی پوزیشن سے پاس کرلیا۔دسمبر ۱۸۴۱ء میں وہ مین پوری کے منصف مقرر ہوگئے۔ منصف ہونے کے بعد مقابلے کے امتحان کا خلاصہ کتابی شکل میں چھاپ دیا۔ یہ کتاب بہت مقبول ہوئی اور بہت سے لوگ اس کی بدولت منصف ہوگئے۔۱۸۴۲ء میں سرسید مین پوری سے تبدیل ہوکر فتح پور آگئے۔اسی زمانہ میں امراء دہلی کی سفارش پر سرسید کو ان کے دادا



کا خطاب بادشاہ نے عنایت فرمایا بلکہ جوادالدولہ میں عارف جنگ کا اضافہ کرکے جوادالدولہ عارف جنگ سرسید احمد خاں کا خطاب عطا کیا۔بڑے بھائی کے انتقال کے سبب ۱۸۵۴ء تک دہلی میں قیام رہا۔دہلی آکر دوبارہ باقاعدہ تعلیم کا سلسلہ جاری کیا اور اپنے وقت کے مشہور اساتذہ سے فقہ، حدیث اور قرآن کا درس لے کر سند حاصل کی۔اسی دوران انھوں نے اپنی اہم تصنیف آثار الصنادید مکمل کی جس میں دہلی کی تقریباً تمام مشہور قدیم عمارتوں کی تاریخ چھاپی۔اس کتاب میں کل ملا کر ۲۳۲ عمارتوں کی تاریخ، کتبہ اور نقشہ جات کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔دنیا کی کوئی بھی یونیورسٹی اتنے کام پر پی ایچ ڈی کی ڈگری دینا فخر سمجھے گی۔لہٰذا اس زمانہ میں بھی اس کتاب کی بہت تعریف ہوئی اور سرسید کی شہرت یورپ تک پہنچ گئی۔فرانسیسی زبان کے علاوہ بھی اس کے تراجم ہوکر مقبول عام ہوئے۔اس کتاب کی بدولت سرسید کو رائل ایشیاٹک سوسائٹی کا آنریری فیلو مقرر کیا گیا جو کہ علمی خدمت کا عالمی اعتراف سمجھا جاتا ہے۔

جنوری ۱۸۵۵ء میں سرسید کا تبادلہ بجنور ہوگیا۔بجنور میں دوسال کا جو عرصہ غدر سے پہلے گزرا اس میں انھوں نے دو بہت اہم علمی کام انجام دیے پہلا آئین اکبری کی تصحیح اور دوسرا تاریخ بجنور مرتب کرنا۔

## مسلمانوں کی حکمرانی سے بے دخلی

یوں تو ہندوستان کا اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ سے ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی کے بعد سے ہی نکلا جارہا تھا لیکن جس واقعہ نے دراصل مسلمانوں کی کمر توڑ کر رکھ دی اور انہیں اپنی غلامی کا صحیح احساس دلایا، وہ ۱۸۵۷ء کا غدر ہے۔اس وقت سرسید بجور میں صدر امین تھے۔ غدر سے پہلے کی تمام زندگی سرسید نے تحقیق وتصنیف میں صرف کی اور سیاست سے کوئی دلچسپی نہ لی۔لیکن غدر میں جو کچھ ہوا جس طرح مسلمانوں کی رہی سہی حکومت بھی جاتی رہی اور انگریز حکمرانوں نے صرف مسلمانوں کو ہدف ملامت بنایا۔اس نے سرسید کے دل میں کچھ کر گزرنے کا خیال پیدا کیا اور ان کی زندگی کا رخ مسلمانوں کی اصلاح کے کاموں کی طرف موڑ دیا۔جس راستے پر وہ زندگی کی آخری سانس تک چلتے رہے اور اپنے بعد سیکڑوں

افراد کا قافلہ چھوڑا جس نے کہ ان کی بتائی ہوئی راہ پر استقامت سے سفر کیا۔ جس کے نتیجے میں مشہور و معروف علی گڑھ تحریک وجود میں آئی۔

غدر کی شروعات میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک تھے لیکن چونکہ انگریزوں نے اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا لہٰذا ضروری تھا کہ ہندوؤں کو اپنا ہمنوا بنا کر مسلمانوں کو ذلیل و خوار کیا جائے تا کہ وہ آئندہ حکمرانی کا خواب تک نہ دیکھ سکیں۔ اس وقت تک مسلمان ہی حکمراں تھے ان ہی کو دبانا بھی غاصبوں نے ضروری خیال کیا لہٰذا ساری بربادی مسلمانوں کی ہوئی کوئی شریف باعزت مسلمان پورے ملک میں نہ بچا انگریزوں کی تیغ ستم مسلمانوں کے لیے بے نیام ہوئی اور ہندو اس سے محفوظ رہے۔ ہنٹر لکھتا ہے:

> ''غدر کے بعد انگریز مسلمانوں پر ٹوٹ پڑے اور صرف ان ہی کو اپنا دشمن سمجھنے لگے۔''[۳]

اس دشمنی کے نتیجے میں کوئی ذی اثر اور دولتمند مسلم خاندان ہندوستان میں نہ بچا۔ جواہر لال نہرو اس کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غدر کے بعد انگریز حکمرانوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں کے مقابلے میں بہت زیادہ دبایا۔

> AFTER THE MUTINY THE BRITISH GOVERNMENT HAD DELIBERATELY REPRESSED THEM TO AN EVEN GREATER DEGREE THAN IT HAD REPRESSED HINDUS. (DISTOVERY OF INDIA, P.347)4

اسی واقعہ کے متعلق جواہر لال نہرو آگے رقم طراز ہیں کہ غدر حالانکہ ہندو اور مسلمانوں کا متحدہ اقدام تھا لیکن مسلمانوں کا یہ سمجھنا کہ ان پر زیادہ پریشانیاں پڑیں بالکل صحیح ہے اور اسی کے ساتھ دہلی حکومت کے دوبارہ قائم ہونے کا خواب چکنا چور ہو گیا۔

> THE REVOLTOF 1857 WAS JOINT AFFAIR BUT IN IT'S SUPRESSION MUSLIMS FELT STRONGLY AND TO SOME EXTENT RIGHTLY THAT THEY WERE THE GREATER SUFFERERS.THIS REVOLT ALSO PUT AN END TO ANY DREAMS OR FANTASIES OF THE REVIVAL OF DELHI EMPIRE (IBID)5



اس غدر نے ایک طرف مسلمانوں کی حکومت کے درخشاں دور کو ختم کر دیا دوسری طرف ہندو اور مسلمانوں کے بیچ سیاسی اور سماجی اختلافات کو بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا کہ انگریزوں نے سیاسی حکمت عملی کے طور پر ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف گواہوں میں استعمال کر کے ان کو پھانسیاں دیں۔ ہندوؤں نے بھی انگریزوں سے مفاہمت میں ہی عافیت سمجھی۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اعتراف ہے کہ باوجود یہ کہ غدر ہندو اور مسلمانوں نے مل کر کیا تھا لیکن انگریز خصوصیت سے مسلمانوں کو ہی اپنا دشمن سمجھنے لگے اور زیادہ مصیبتیں ان پر نازل ہوئیں۔

> ''ایک بات بالکل یقینی ہے وہ یہ کہ ہندو اور مسلمان دونوں اس میں شریک ہوئے اور دونوں دہلی کے بادشاہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے لیکن انگریزوں کا طرز عمل مسلمانوں کے ساتھ زیادہ خصومت آمیز تھا کہ جن کے ہاتھوں سے انھوں نے ملک فتح کر کے چھینا تھا۔''[۶]

مسلمانوں کے ہاتھوں سے دولت اور حکومت چھن گئی۔ خود مغل خاندان کلیتہً تباہ و برباد ہو گیا۔ انگریزوں نے غدر کے بعد خاص طور سے سرکاری نوکریوں کے دروازے مسلمانوں پر بند کر دیے۔ عام طور سے مسلمان نوکریوں اور جاگیروں پر ہی گزارا کرتا تھا تجارت پیشہ اور کاریگر طبقہ ان میں کم تھا لہٰذا جاگیروں کی ضبطی اور نوکریوں سے نکالے جانے کے سبب ایک باعزت قوم بے وقار اور بے عزت ہو کر رہ گئی۔

> ''انتقام کے زبردست ہاتھ نے بہت سے ایسے خاندان تباہ و برباد کر دیے کہ جو اس سے پہلے دولت اور حکومت میں کھیل رہے تھے۔ انہیں دبانے کی بالقصد ایک پالیسی حکومت کے تمام محکموں میں اختیار کر لی گئی۔ مسلمان نہ صرف ملک کے انتظام کے اعلیٰ ترین شہری عہدوں پر ممتاز تھے بلکہ فوج میں ان کا تعلق اور بھی زیادہ نمایاں تھا۔ اول الذکر اعزاز سے انہیں محروم کرنے کے لیے دو سبب جمع ہو گئے۔ ایک تو برطانوی حکومت کی پالیسی ان کے خلاف کام کر رہی تھی دوسرے اس پالیسی کو مدد ان مسلمانوں کے طرز عمل سے مل گئی۔ جو

اپنے اس غم انگیز تجربے کے بعد اپنے گھروں کے اندر روٹھ کر بیٹھ رہے اور ایک عرصہ تک انگریزی تعلیم سے فائدہ نہ اٹھایا کہ جو رائج کردی گئی تھی اور جس کے بغیر حکومت کی ملازمتیں ملنا روز بروز دشوار ہوتا جارہا تھا۔‘‘ ۷

## سرکاری نوکریوں کے دروازے بند کردیے گئے

۱۹۴۷ء کی تقسیم وطن کے بعد اس بات کا اغلب گمان پایا جاتا ہے کہ جمہوری ہندستان میں خاص محکموں مثلاً فوج، پولس اور ایڈمنسٹریٹو پوسٹوں پر مسلمانوں کے نہ لیے جانے کی پالیسی اختیار کرلی گئی۔ لہٰذا سرکاری نوکریوں میں مسلمان بہت کم نظر آتے ہیں۔ اس صورتحال کا دوسرا اہم سبب یہ ہے کہ مسلمان انگریزی تعلیم اور سائنس کی طرف سے اتنا ہی بے بہرہ اور بے نیاز ہیں جتنا کہ اس زمانہ میں تھا۔ اگر تقابلی تجزیہ کیا جائے تو وہی نسبت آج بھی موجود ہے جو کہ غدر کے بعد کی تھی۔ اتر پردیش پولس میں مسلمانوں کی نمائندگی کے سلسلے میں اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق انسپکٹر کی رینکنگ سے نیچے مسلمان صرف ۱۴.۷٪ (14.7%) تھے۔ یہ رپورٹ ۳۱؍دسمبر ۱۹۸۱ء کے ڈیٹا پر منحصر ہے۔ ۸

| | RANK & CADRE | NO.OF MUSLIMS | PERCENTAGE |
|---|---|---|---|
| 1 | INSPECTOR C.P. | 9 | 1.36 |
| 2 | INSEPCTOR A.P. | 5 | 3.81 |
| 3 | SUB INSPECTOR C.P. | 307 | 4.03 |
| 4 | SUB INSPECTOR A.P. | 41 | 8.28 |
| 5 | ASSTT.SUB INSPECTOR C.P. | 22 | 7.58 |
| 6 | HEAD COSTABLES C.P. | 431 | 6.15 |
| 7 | HEAD COSTABLES A.P. | 482 | 9.09 |
| 8 | CONSTABLE C.P. | 4418 | 7.47 |
| 9 | CONSTABLE A.P. | 1235 | 7.40 |
| | TOTAL | 6947 | 7.14 |

(Source: Muslim India Sept. 1984, P 402)



اس ایک مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ باقی محکموں میں مسلمانوں کی کیا حالت ہے۔ گورنمنٹ کے کسی محکمہ میں بھی مسلمان ان کی آبادی کے لحاظ سے موجود نہیں ہیں۔ جمہوری اداروں کا کم ازکم فرض یہ ہوتا ہے کہ آبادی کے تناسب سے ان میں ہر فرقہ کی نمائندگی ہو۔

انگریز ہندوؤں پر شروع سے ہی اعتبار کرتے چلے آئے تھے اور مسلمانوں کو اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ ۱۸۴۸ء کی لارڈ ایلن برو کی تحریر سے مندرجہ ذیل اقتباس ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب میں نقل کیا ہے جس سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز کی یہ حکمت عملی تھی کہ ہندوؤں سے مصالحت کریں۔

’’مجھے یہ حد درجہ کی بے وقوفی معلوم ہوتی ہے کہ جب کہ ہمیں آبادی کے دسویں حصہ کی دشمنی کا یقین ہے تو پھر بھی ہم دس میں سے باقی نوّے کی پر جوش مدد حاصل نہ کریں جو کہ وفادار ہیں۔ میں اس اعتقاد کی طرف سے اپنی آنکھیں نہیں بند کرسکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے۔ اور اس لیے ہماری صحیح حکمت عملی یہ ہونا چاہیے کہ ہندوؤں سے مصالحت کریں۔‘‘ ۹

انگریزوں کی یہ پالیسی غدر میں ہندوؤں کے حصہ لینے کے باوجود بھی ختم نہیں ہوئی اور اسی طرح مسلمانوں کو دشمن اور ہندوؤں کی وفادار سمجھا جاتا رہا اور وفاداری کے صلے میں نوکریوں اور حکمراں طبقہ میں شمولیت آہستہ آہستہ بڑھتی گئی۔

’’۱۸۵۷ء کے غدر کے وقت مسلمانوں کی بہ نسبت ہندو اس میں حصہ لینے میں پیچھے نہ رہے لیکن انگریزوں کا اعتبار ہندوؤں پر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس تلخ تجربے کے بعد بھی نہ ہٹا تھا۔‘‘ ۱۰

یوں تو مسلمانوں کی حکومت سے بے دخل کرنے کی پالیسی شروع سے ہی انگریزوں نے اختیار کررکھی تھی لیکن غدر کے بعد اس میں اور شدت آگئی۔ ہنٹر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ انگریزوں کے آنے کے وقت مسلمان ہی سب سے زیادہ باعزت اور افضل قوم تھے لیکن اب سرکاری ملازمتیں مسلمانوں کو نہیں دی جاتیں اسی طرح

غیرسرکاری ذرائع زندگی میں بھی ان کا دخل بالکل بند ہے۔

''حقیقت یہ ہے کہ جب ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی سب سے اعلیٰ قوم تھے وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی میں ہی برتر نہ تھے بلکہ سیاسیات اور حکمت عملی کے علم میں بھی سب سے افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں کا دروازہ بالکل بند ہے۔غیرسرکاری ذرائع زندگی میں بھی کوئی نمایاں جگہ حاصل نہیں ہے۔''۱۱

مسلمانوں کو انگریزی تسلط میں بالکل تباہ و برباد کردیا گیا۔اس کا فائدہ سراسر ہندوستان کی ہندوآبادی کو ہوا جو کہ انگریزوں کے شانہ بشانہ نئی تعلیم حاصل کرنے میں لگی ہوئی تھی اورانگریزوں کی ہندوؤں سے مصالحت کی پالیسی سے زبردست فائدہ اٹھارہی تھی۔انگریزوں کے مقاصد کے لیے یہ بہت مناسب پالیسی تھی کہ ملک کی اکثریت کو ہمنوا بنالیں اور مسلم اقلیت کہ جن سے انھوں نے اقتدار چھینا تھا انہیں عزت اور دولت سے محروم کرکے اصلی غلام بنائیں کیونکہ مسلمان ہی ان سے حقیقتاً اپنی تاریخی روایتوں کے سبب لڑنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ہنٹر رقم طراز ہے کہ:

''مسلمانان ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصہ پہلے بھی ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے بالکل الگ تھلک رہے اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے اپنے لیے بہت بڑی قومی بے عزتی تصور کرتے ہیں۔''۱۲

اسی سبب سے مسلمان جو کہ انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں سرکاری محکموں پر جیسے کہ دیوانی پولس وغیرہ میں چھائے ہوئے تھے ان کو نکال کر ہندوؤں کو لینا شروع کردیا اور اس طرح تمام سرکاری ملازمتیں صرف ہندوؤں کے حصہ میں آئیں۔ہنٹر مسلمانوں کے جذبات جو انگریزوں کی پالیسیوں کی وجہ سے مجروح ہوئے تھے ان کا اعتراف کرتے



ہوئے لکھتا ہے:

''ہندوستانی مسلمان برطانوی حکومت کو غفلت اور بے اعتنائی کا مجرم جذبات وشجاعت سے معرا.........اور دیگر بڑی بڑی ناانصافیوں کا جن کا سلسلہ سو سال تک پھیلا ہوا ہے،مرتکب ٹھہراتے ہیں،اس کے جواب میں یہ کہنا کہ یہ سب کچھ نتیجہ ہے ان کے اپنے انحطاط کا عذر گناہ بدتر از گناہ کا مصداق ہوگا...... یہ وہ قوم ہے جسے برطانوی حکومت کے ماتحت برباد کردیا گیا۔''

برطانوی حکمرانوں کے مسلم مخالف رویہ کے سبب مسلمان ہرطرح کی نوکریوں سے محروم ہوگئے۔

''انگریزی حکومت کے ابتدائی دور میں مسلمان دیوانی، پولیس، عدالت اور فوج میں چھائے ہوئے تھے اور یہ محکمے ان کی دولت اور آمدنی کے سب سے بڑے ذرائع تھے لیکن انگریزوں نے ان کے نظام کو ختم کرکے ان پر سرکاری ملازمتوں کے تمام دروازے بند کردیے۔''۱۳

بغاوت کچلنے کے بعد انگریز مسلمانوں کو تباہ وبرباد کرنے پر تل گئے اور ان کی برتری جو ہندوستان کی دوسری قوموں پر تھی ختم کردی جو کہ ان کے حکمراں ہونے کی وجہ سے حکومت کے اعلیٰ سویلین اور ملٹری عہدوں میں اکثریت کی وجہ سے حاصل تھی۔

THE BRITISH TURNED ON MUSLIMS AS THEIR REAL ENEMIES THAT THE FAILUER OF THE REVOLT WAS MORE DISASTOURS TO THEM THAN TO THE HINDUS. THEY LOST ALMOST ALL THEIR REMAINING TRADITIONAL PRESTIGE OVER THE HINDUS. THEY FORFEITED THE COFIDENCE OF THEIR FOREIGN RULERS AND IT IS FROM THIS PERIOD THAT ONE MUST DATE THE LOSS OF THEIR NUMERICAL MAJORITY IN THE HIGHER SUBORDINATE RANKS OF SRVICES.14

## ایک اور ثبوت

ہنٹر نے اس بات کا صاف اعتراف کیا ہے کہ مسلمانوں سے چھوٹی بڑی ہر طرح کی نوکریاں چھین کر ہندوؤں کو دی جانے لگیں۔ حالانکہ حکومت اپنی رعایا کے تمام فرقوں کی فلاح و بہبود کی پابند ہوتی ہے مگر انگریز حکومت نوکریوں کے واسطے گزٹ کرتے وقت مسلمانوں کو اس میں درخواستیں گزارنے تک کی اجازت نہیں دیتی تھی اور اس وقت مشکل سے ہی حکومت کا کوئی آفس ہوگا جس میں مسلمان چپراسی، خدمت گار، مزدور سے بڑے کسی عہدے پر ہو۔ کچھ ہی عرصہ پہلے ایک بنگالی مسلمان کے غریب ہونے کا کوئی امکان نہ تھا اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ کوئی صاحب ثروت مسلمان نہ بچا۔

ALL SORT OF EMPLOYEMENT GREAT AND SMALL ARE BEING GRADUALLY SNATCHED AWAY FROM MOHAMMADENS AND BESTOWED ON MEN OF OTHER RACES.PARTICALARLY HINDUS. THE GOVERNMENT IS BOUND TO LOOK UPON ALL CLASSES OF ITS SUBJECTS WITH AN EQUAL EYE, YET THE TIME HAS NOW COME WHEN IT PUBLICLY SINGLES OUT THE MOHAMMADENS IN IT'S GAZATTES FOR EXCLUSION FROM OFFICAIAL POSTS... THERE IS SCARSELY A GOVERNMENT OFFICE IN WHICH A MOHAMMADEN CAN HOPE FOR ANY POST ABOVE THE RANK OF PORTER, MESSANGER,FILLER OF INKPOTS AND MENDOR OF PENS....

(HUNTER.W.W., THE INDIAN MUSALMANS,P.132)

سر ہنٹر ہندوستان میں ایجوکیشن کمیشن کے صدر تھے اور ایک آئی سی ایس آفیسر تھے ہمیں آج کسی ایسے آئی سی ایس آفیسر کی تلاش ہے جو کہ ایسی حقیقت پسندی سے اتنے واضح انداز میں خود اپنی حکومت کو مسلمانوں کے ساتھ ناانصافی کرنے کا ذمہ دار قرار دے سکے۔ ہر طرح کی سرکاری ملازمتیں مسلمانوں کے لیے حاصل کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے اس وجہ سے بھی مسلمان تعلیمی اور اقتصادی میدان میں دوسرے فرقوں سے بہت پیچھے رہ گیا



ہے۔ حکومت کو ملک کی بھلائی اور اس میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے اس طرح کی ناانصافیوں سے اجتناب کرنا چاہیے ورنہ ایک ہی شہر میں ایک طرف امیر خوش حال طبقہ اور دوسری طرف غریب اور بدحال طبقہ کب تک صلح و آشتی سے رہ سکتا ہے؟ اس وقت تک جب تک کہ عوام میں یہ احساس بیدار نہیں ہوجاتا کہ ہمارے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے اور یہ احساس اب تیزی سے پھیل رہا ہے حکومت کو چاہیے کہ خبردار ہوجائے اور اپنے عمل اور انصاف سے اس انتشار کو پھیلنے سے روک لے ورنہ ایک ہی قصبہ میں غریب بھوکا اور زمین پر سوتا رہے اور امیر ڈنلپ کے بستر پر آرام سے سوئے، کیا یہ حالت بہت دن چل سکتی ہے؟ ہرگز نہیں، تو حکومت کی، ملک میں رہنے والے ہندو اور مسلمانوں اور دوسرے طبقات کی بھلائی اس میں ہے کہ سب مل بیٹھ کر انصاف کا کوئی طریقہ نکالیں۔

انگریز حکمرانوں کی یہ پالیسی کہ وہ ہندوؤں کا ساتھ دیں اور مسلمانوں کو ہر طرح ذلیل وخوار کریں جنگ پلاسی کے بعد سے ہی چلی آتی تھی اس کا خاص اظہار ۱۸۱۶ء میں کلکتہ میں ہندو کالج کے قیام سے ہوا جو کہ انگریز آفیسروں کی سرپرستی میں راجہ رام موہن رائے کی تحریک کے سبب وجود میں آیا۔ ۱۸۴۲ء میں کابل اور غزنی پر انگریزوں کی فتح پر ہندوؤں نے خوب خوشی کا اظہار کیا اور اس طرح انگریزوں کو ہندوؤں کی مصلحت پسندی کا ایک اور ثبوت ملا۔ ہندوستان کے گورنر جنرل لارڈ البز نے ۱۸۴۲ء میں ڈیوک آف ولنگٹن کو لکھا:

''مجھے اچھی طرح ثابت ہوگیا ہے کہ خاص وہ لوگ جن کی گزر ہمارے ہی ٹکڑوں پر ہے وہ دل سے ہمارے بدخواہ تھے۔ بخلاف اس کے ہندو ہماری فتح پر اظہار مسرت کر رہے ہیں۔ جب ہمیں ان مسلمانوں کی دشمنی کا کامل یقین ہے جن کی تعداد ۱/۱۰ ہے تو پھر کیوں نہ ہم اس قوم کا ساتھ دیں جس کی تعداد ۹/۱۰ ہے اور ہماری وفادار ہے۔''[۱۵]

ہندوؤں کی طرف داری کی یہ پالیسی ۱۸۷۰ء تک چلتی رہی۔ ۱۸۵۷ء کے واقعات نے اس میں اور بھی شدت پیدا کردی۔ بغاوت کی ساری ذمہ داری مسلمانوں کے سر گئی اور انتقام اپنی تمام تر قہرمانی قوتوں کے ساتھ مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ مسلمان انگریزوں کی

بارگارہ میں مردود تو پہلے ہی تھے اور اب باغی اور حکومت کے بدترین دشمن بھی سمجھے جانے لگے۔ ہندوؤں کی نسبت یہ کیفیت نہ تھی۔ ہندوؤں کی زمانہ سازی اور انگریزوں سے مفاہمت کا ذکر کرتے ہوئے ولیم ہنٹر ۱۸۷۰ء میں لکھتا ہے:

''مسلمانانِ ہندوستان اب بھی اور اس سے بہت عرصے پہلے بھی
ہندوستان کی انگریزی حکومت کے لیے ایک مستقل خطرے کی
حیثیت رکھتے ہیں۔ کسی نہ کسی وجہ سے وہ ہمارے طور طریقوں سے
بالکل الگ تھلک رہے اور ان تمام تبدیلیوں کو جن میں زمانہ ساز
ہندو بڑی خوشی سے حصہ لے رہا ہے، اپنے لیے بہت بڑی قومی بے
عزتی تصور کرتے ہیں۔''۱۶

زمانہ ساز ہندوؤں نے غدر میں حصہ لینے کے بعد فوراً انگریزوں سے صلح کرنے میں عافیت سمجھی اور انگریزوں نے مسلمانوں سے انتقام لینے کے لیے ہندوؤں کو اپنے ساتھ لے لیا۔ سرسید، طیب جی کو ایک مراسلے کے جواب میں لکھتے ہیں کہ:

''غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا۔ مسلمانوں من چلے تھے
بیچ میں کود پڑے۔ ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے۔ مگر
مسلمانوں کے تمام خاندان برباد ہو گئے۔''۱۷

باغی مسلمان قرار دیے گئے ان کو سزا دینے کے لیے کسی گواہی کی ضرورت نہ تھی بس ان کا مسلمان ہونا کافی تھا۔ دہلی میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے دیا گیا۔ مسلمان صرف شناختی کارڈ دکھا کر ہی داخل ہو سکتا تھا۔ مغلوں کی دہلی میں مسلمان برباد تھے اور ہندو آباد۔

''اس ہنگامہ کی شروعات تو اس طرح ہوئی تھی کہ ہندو اور مسلمان
دونوں شانہ بشانہ انگریزوں سے نبرد آزما تھے۔ انجام کار برادرانِ
وطن نے حکمراں قوم سے مصالحت کرنے میں ہی عافیت دیکھی اور
ان کے ہمنوا ہو گئے۔ ۱۸۵۷ کی رستاخیز کے بعد غالب کی دلی میں
ہندو تو آباد تھے مگر مسلمان اجڑ گئے تھے اور بلا ٹکٹ ان کا داخلہ شہر
میں ممنوع تھا، انگریز حاکموں کے نزدیک باغی کے معنی تھے مسلمان



اور مسلمان کے معنی تھے باغی۔''۱۸

انگریزوں کی مسلم کش پالیسی شروع سے ہی چلی آتی تھی اس لیے کہ یہ ملک انھوں نے مسلمانوں سے ہی چھینا تھا اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ کوئی قوم اگر ہمارے مقابلے پر آتی ہے تو یہ مسلمان ہی ہیں لہٰذا مسلمانوں کو ہر طرح تباہ و برباد کیا گیا۔ غدر سے بہت پہلے ہی سے یہ پالیسی چلی آتی تھی کہ جتنا ہو سکے مسلمانوں کو دبا دیا جائے۔ مسلمان عام طور سے نوکر پیشہ تھے انگریز دور کی شروعات میں حکومت کے تمام محکموں میں مسلمان چھائے ہوئے تھے اور یہ محکمے ان کی دولت اور آمدنی کے سب سے بڑے ذرائع تھے لیکن انگریزوں نے ان کے نظام کو ختم کر کے ان پر سرکاری نوکریوں کے تمام دروازے بند کر دیے اور ہندوؤں کو نوازنا شروع کیا۔ طبابت و کالت اور دیگر غیر سرکاری پیشے جن پر مسلمان قابض تھے وہ بھی حکومت کی مسلم کش پالیسی انگریزی تعلیم اور طب انگریزی کے اجراء کی بدولت مسلمان کے ہاتھ سے جاتے رہے تھے۔ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ نوکریوں کے اشتہاروں میں صاف لکھا جاتا تھا کہ اس میں مسلمان درخواست نہ گزاریں ہندو اور دوسری قومیں امیدوار ہو سکتی ہیں۔

''اگر کچھ آسامیاں خالی ہوتیں تو اشتہار میں اس بات کی وضاحت
کر دی جاتی کہ ہندوؤں کے علاوہ یہ کسی کو نہ دی جائیں گی یعنی جہاں
تک ملازمتوں کا تعلق ہے مسلمانوں کی اہلیت یا نااہلیت کا سوال ہی
نہیں پیدا ہوتا تھا۔''۱۹

ہنٹر نے بہت واضح طور سے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ جب یہ ملک انگریزوں کے قبضہ میں آیا تو مسلمان علم سیاست اور حکمت عملی ہر طرح سے سب سے اعلیٰ قوم تھے لیکن اب ہر قسم کی نوکریوں کے دروازے ان پر بند ہیں۔

''حقیقت یہ ہے کہ جب یہ ملک ہمارے قبضہ میں آیا تو مسلمان ہی
سب سے اعلیٰ قوم تھے وہ دل کی مضبوطی اور بازوؤں کی توانائی میں
ہی برتر نہ تھے بلکہ سیاست اور حکمت عملی میں بھی سب سے زیادہ
افضل تھے لیکن اس کے باوجود مسلمانوں پر حکومت کی ملازمتوں
کا دروازہ بالکل بند ہے۔ غیر سرکاری ذرائع میں بھی کوئی نمایاں جگہ

حاصل نہیں ہے۔''۲۰

## سرسید پر غدر کے اثرات

غدر کے سبب خود سرسید کے خاندان پر بے انتہا تباہی آئی ان کے خاندان میں ان کے ماموں اور ماموں زاد بھائی انگریزوں کے ہاتھوں مارے گئے۔ انگریز فوج نے ان کے گھر کا تمام مال واسباب لوٹ لیا۔

''میرٹھ میں ان کو معلوم ہوا کہ دلی میں سرکاری فوج کے سپاہیوں نے ان کا گھر اور تمام اسباب لوٹ لیا ہے۔ جب دلی میں سرکاری فوج پھیلنی شروع ہوئی اور کشمیری دروازہ فتح ہو چکا تو شہر کے تمام زن ومرد شہر چھوڑ چھوڑ کر چل دیے تھے اور سرسید کا کنبہ بھی۔ جب کہ ان کے ماموں وحیدالدین خاں اور ان کے ماموں زاد بھائی ہاشم علی خاں سپاہیوں کے ہاتھ مارے گئے۔''۲۱

حد یہ کہ سرسید کی والدہ پر انتہائی پریشانی کا وقت گزرا۔ جب ان کا گھر پورا لٹ گیا تو انھوں نے ایک لاوارث بڑھیا کی کوٹھری میں پناہ لی اور آٹھ دن نہایت تکلیف کے گزارے حتیٰ کہ کھانے کو کچھ نہ ملا تو گھوڑے کے دانے پر گزر کی۔ محسن قوم کی قابل صد احترام والدہ نے جن سے کہ سرسید کی محبت اور عقیدت ضرب المثل تھی، انگریزوں کے ہاتھوں اتنی تکلیفیں اٹھائیں کہ سرسید جب میرٹھ سے دلی پہنچے اور والدہ سے ملاقات ہوئی تو ان کو دو دن سے پانی تک نہ ملا تھا۔

''جب ان کا سارا گھر لٹ گیا تو وہ حویلی چھوڑ کر جلو خانہ کی ایک کوٹھری میں جہاں زیبن نام کی ایک بڑھیا رہتی تھی چلی آئیں اور آٹھ دن نہایت تکلیف سے اس کوٹھری میں بسر کیے۔ اس عرصہ میں سرسید بھی وہاں پہنچ گئے۔ معلوم ہوا کہ تین دن سے ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ کسی قدر گھوڑے کا دانہ مل گیا تھا اسی کو کھاتی رہیں دو دن سے پانی بھی ختم ہو چکا تھا اور پیاس کی نہایت تکلیف تھی۔''۲۲



کسی طرح سرسید ان کو میرٹھ لے آئے اور رفتہ رفتہ ان کا تمام خاندان وہاں جمع ہو گیا۔ بھوک پیاس کی شدت کی وجہ سے صفرا کی بیماری پیدا ہوئی اور آخر کار اسی مرض میں کچھ ہی دن کے بعد میرٹھ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

''سرسید کی والدہ کو بھوک اور پیاس کی تکلیف سے صفرا کا بہت غلبہ ہو گیا تھا، کوئی دوا یا غذا پہنچتی نہ تھی۔ آخر کچھ دن بیمار رہ کر میرٹھ میں انتقال کیا۔''۲۳

ذرا تصور میں لائیے وہ حالات کہ گھر بار سارا لٹ گیا، خاندان تباہ ہوا حتیٰ کہ تمام دنیا سے پیاری والدہ کا انتقال بھی انہیں مصائب سے ہوا جو کہ غدر کی وجہ سے ان پر پڑے۔ اس کے علاوہ سارے دوست احباب اور ان کے خاندان تباہ ہو گئے۔ اپنی قوم کے غم میں ہمہ وقت اشکبار رہنے والی آنکھوں میں کتنا خون نہ اتر آیا ہو گا، غم وغصے سے ان کے جذبات میں کیسے کیسے ابال نہ آئے ہوں گے لیکن اس کے باوجود انھوں نے اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دیا اور ہوش کا دامن نہ چھوڑا۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نادان مجاہد کی طرح وہ بھی تلوار لے کر میدان میں اتر آتے۔ لیکن انھوں نے غور کیا، سوچا اور سمجھا اس تباہی کی اصل وجوہات کا پتہ لگایا اور ایک دانا مجاہد کی طرح جہالت اور ان سماجی برائیوں کے خلاف صف آرا ہو گئے جن کی وجہ سے مسلمانوں پر یہ عذاب آیا تھا۔

سرسید کے کریکٹر کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ایسے وقت میں جبکہ خود ان کا خاندان تباہ ہوا ایک عام آدمی یہی سوچتا کہ کسی طرح پھر سے خاندان کو بساؤ اور مال ودولت جمع کرو لیکن ان کو اپنے خاندان کا مطلق غم نہ تھا بلکہ تمام مسلمانوں کے اجڑنے کا صدمہ تھا۔ اپنے لیے مال واسباب جمع کرنا اور عیش کی زندگی گزارنا کچھ مشکل نہ تھا جبکہ خود انگریز حاکموں نے ان کو بجنور میں انگریز عورتوں اور بچوں کی جان بچانے کے عوض میں ایک لاکھ روپیہ سالانہ آمدنی کی جاگیر دینا چاہی تو سرسید نے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھ سے زیادہ نالائق کوئی نہ ہوگا کہ قوم تو ایسی بربادی میں زندگی گزارے اور میں جاگیردار بن کر عیش کروں۔ آج کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک بہت بڑا لمحۂ فکریہ ہے کہ اس زمانہ میں ایک لاکھ روپیہ کی جائداد کو صرف اس لیے ٹھکرا دیا کہ قوم مفلس ہے تو میں امیر ہو کر کیا کروں گا اور آج

ہم پوری پوری زندگی اس آس میں گزار دیتے ہیں کہ شاید کبھی کچھ مل جائے۔ اور ہمیں نہیں تو ہماری اولاد کو شاید ہماری وفاداری کا صلہ مل جائے سرسید پر انگریز پرستی کا الزام لگانے والے قوم پرور مسلمان ذرا پوری تاریخ میں ایک مثال بھی ایسے شخص کی دکھائیں جس نے صرف اتنی قربانی ہی دی ہو۔

## جو کچھ رنج تھا قوم کی بربادی کا

''غدر کے بعد نہ مجھ کو اپنے گھر لٹنے کا رنج تھا نہ مال و اسباب کے تلف ہونے کا جو کچھ رنج تھا اپنی قوم کی بربادی کا...... جب ہمارے دوست مرحوم مسٹر شیکسپیئر نے جن کی مصیبتوں میں ہم اور ہماری مصیبتوں میں وہ شریک تھے بعوض اس وفاداری کے تعلق جہاں آباد جو سادات کے ایک نامی خاندان کی ملکیت اور لاکھ روپے سے زیادہ مالیت کا تھا مجھ کو دینا چاہا تو میرے دل کو نہایت صدمہ پہنچا۔ میں نے اپنے دل میں کہا کہ مجھ سے زیادہ کوئی نالایق دنیا میں نہ ہوگا کہ قوم پر تو یہ بربادی ہو اور میں ان کی جائداد لے کر تعلق دار بنوں میں نے اس کے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میرا ارادہ ہندوستان میں رہنے کا نہیں ہے اور در حقیقت یہ بالکل سچ بات تھی۔ میں اس وقت ہرگز نہ سمجھتا تھا کہ قوم پھر پنپے گی اور کچھ عزت پائے گی۔

جو حال اس وقت قوم کا تھا مجھ سے دیکھا نہ جاتا تھا چند روز اسی خیال اور اسی غم میں رہا۔ آپ یقین کیجئے کہ اس غم نے مجھے بڈھا کر دیا اور میرے بال سفید کر دیے۔ جب میں مراد آباد میں آیا جو ایک بڑا غم کدہ ہماری قوم کے رئیسوں کی بربادی کا تھا اس غم کو کسی قدر اور ترقی ہوئی۔ مگر اس وقت یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردہ اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں نہیں! اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں



ہمت باندھنی قومی فرض ہے میں نے ارادۂ ہجرت موقوف کیا اور قومی ہمدردی کو پسند کیا۔'' ۲۴

اسی قومی ہمدردی نے انہیں آئندہ چالیس سال تک مضطرب رکھا اور اسی اضطراب سے انقلاب آفریں کارنامے انجام پذیر ہوئے۔

یوں تو ہنگامۂ ۱۸۵۷ء حکومت کے خلاف ایک عرصہ چلی آ رہی بہت سی شکایتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے ہوا مگر شروعات اس کی میرٹھ چھاؤنی سے ہوئی۔ انگریزوں نے فوج میں نئے کارتوس رائج کیے جن پر خوب موٹی چربی ہوتی تھی۔ دانت سے کاٹ کر یہ بندوق میں لگائے جاتے تھے۔ شہرت ہوئی کہ یہ گائے کی چربی ہے، اس سے ہندوؤں میں اشتعال ہوا اور یہ بھی شہرت ہوئی کہ اس میں سور کی چربی ہے اس سے مسلمان میں بیزاری پھیلی۔ ۱۰ مئی ۱۸۵۷ء کو یکایک میرٹھ چھاؤنی میں سپاہیوں نے ہنگامہ شروع کیا۔ انھوں نے انگریز افسروں کو قتل کیا اور ان کے بنگلوں میں آگ لگائی اور وہ دہلی کی طرف چل پڑے۔ انھوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے اپنی سرپرستی پر مجبور کیا۔ اور وہ مجبور ہو کر عوام کے ساتھ ہو گیا۔ ورنہ جنگ اس کے اور مسلمانوں کے وہم و گماں میں بھی نہ تھی۔ غدر کے بعد جو کچھ ہوا اس بربادی کی داستان ایک روح فرسا اور رونگٹے کھڑے کر دینے والی داستان ہے۔

مغلوں اور غالب کی دلی میں مسلمانوں پر بے پناہ قہر ٹوٹا ہزار ہا مسلمان سر عام پھانسیوں پر لٹکا دیے گئے۔ کوئی باعزت مسلمان دلی میں نہ بچا اس تباہی و بربادی کی داستان کو حالی نے ایک مرثیہ میں بیان کیا ہے۔

تذکرۂ دہلی مرحوم اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز
داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رولانا ہرگز
لے کے داغ آئے گا سینے پہ بہت اے سیاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہہ خاک
دفن ہوگا نہ کہیں اتنا خزانہ ہرگز

شاعر فلک سے فریاد کرتا ہے کہ اب تو تیرے مٹانے کے نشان بھی مٹ گئے یعنی اس درجہ بربادی کہ مٹنے کے نشان تک برباد ہوگئے۔ اب نہ مٹانا۔

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

مایوسی اور نامرادی کا یہ عالم ہے کہ شاعر قسمت کے خراب ہونے کو اس کا آرام کرنا ظاہر کر رہا ہے اور کہتا ہے بہت جاگ لیے اب ذرا قسمت کو آرام کرنے دو اسے سونے دو۔

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دور زماں
نہ ابھی نیند کے ماروں کو جگانا ہرگز

سرسید رقم طراز ہیں کہ:

''اب تمام ہندوستان میں پھرو اور قدیم شہروں اور قدیم قصبوں میں جاؤ اور دیکھو کہ جو معبد کہ ویران اور شکستہ حال پاؤ گے وہ مسلمانوں کی مسجدیں ہوں گی جو چھت بوسیدہ اور خم در خم رسیدہ دیکھو گے وہ سقف خانۂ مسلم ہوگی جو دیوار نبیدہ اور از سرتا پا افتادہ پاؤ گے وہ دیوار کسی مسلمان کے محل سرا کی ہوگی۔''۲۵

یہ صورت حال پیدا ہوگئی کہ انگریز تو پہلے ہی سے مسلمانوں سے بدظن تھے ہندوؤں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا۔ اس زمانے میں انگریزوں نے جتنے مضامین رسالے اور کتابیں لکھیں ان میں مسلمانوں کو ہی قصوروار ٹھہرایا گیا۔ کبھی کہا گیا کہ مسلمان اسے جہاد خیال کرتے تھے اور کبھی کہا گیا کہ شاہ نعمت اللہ ولی کی پیشن گوئی پر یقین کرتے تھے کہ اب انگریزوں کی عمل داری ختم ہوجائے گی اس لیے وہ بغاوت پر کمربستہ ہوگئے۔ یہ صورت حال سرسید کے لیے خاصی پریشان کن تھی لہٰذا انھوں نے یہ ثابت کیا کہ فساد دوسروں نے شروع کیا تھا مسلمان من چلے تھے بیچ میں کود پڑے۔ اس زمانہ کے متعلق سرسید لکھتے ہیں کہ:



''یہ بدبختی کا وہ زمانہ ہے جو ۱۸۵۷-۵۸ء میں ہندوستانی مسلمانوں پر گزرا کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی گو وہ رام دین یا ماتادین نے ہی کی ہو۔ کوئی بلا آسمان سے نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمان کا گھر نہ ڈھونڈا ہو...... جو کتابیں اس ہنگامے کی بابت تصنیف ہوئیں وہ بھی میں نے دیکھیں تو ہر ایک میں یہی دکھا کہ ہندوستان میں مفسد اور بدذات کوئی نہیں مگر مسلمان! مسلمان! مسلمان! کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں اگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔''۲۶

سرسید کے یہ الفاظ مسلمانوں کی بربادی کی صحیح تصویر کھینچ رہے ہیں۔ یہ بربادی صرف دہلی تک محدود نہ تھی بلکہ تمام ہندوستان میں مسلمان دولت اور حاکمیت سے محروم کردیے گئے۔ ہزاروں بے گناہ مسلمانوں کی جاگیریں جائدادیں ضبط ہوگئیں ہر طرف پھانسیوں کا بازار گرم ہوگیا گلی کوچہ تختۂ دار بن گئے۔ ان حالات کا سرسید نے ایک دوراندیش مدبر کی طرح جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ سوچنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔

''ایک مدت اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجیے جو خیالی تدبیریں کرتا تھا کوئی بن پڑتی معلوم نہ ہوتی تھی جتنی امیدیں باندھتا تھا سب ٹوٹ جاتی تھیں۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کرسکو۔ ہو نہ ہو اِسی بات پر دل ٹھہرا ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔''۲۷

○

## حواشی:

(۱) حیات جاوید،ص:۴۴

(۲) ایضاً،ص:۵۷

(۳) بحوالہ راجندر پرشاد، ہندوستان کا مستقبل،ص:۱۸۹

(۴) ڈسکوری آف انڈیا، جواہر لال نہرو،ص:۳۴۷

(۵) ایضاً،ص:۳۵۰

(۶) راجندر پرشاد، ہندوستان کا مستقبل،ص:۱۸۸

(۷) ایضاً،ص:۱۸۹

(۸) بحوالہ مسلم انڈیا، ستمبر ۱۹۸۴ء،ص:۴۰۲

(۹) راجندر پرشاد، ہندوستان کا مستقبل،ص:۸۸

(۱۰) ایضاً

(۱۱) ہمارے ہندوستانی مسلمان

(۱۲) حالی کا سیاسی شعور،ص:۲۹، ہنٹر ہمارے ہندوستانی مسلمان

(۱۳) جذبی، حالی کا سیاسی شعور،ص:۳۱

(۱۴) Garret & Thompson, The rise & fulfilment of British Rule in India (P.439)

(۱۵) محمد امین زبیری، مسلمانان ہند کی سیاست وطنی، ۱۹۳۸ء، آگرہ،ص:۱۶

(۱۶) ولیم ہنٹر: ہمارے ہندوستانی مسلمان، مترجم صادق حسین،ص:۲۱

(۱۷) بحوالہ ناموران علی گڑھ، پہلا کارواں،ص:۲۳۷

(۱۸) نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان،ص:۲۸

(۱۹) جذبی، حالی کا سیاسی شعور،ص:۳۲، ہمارے ہندوستانی مسلمان، ترجمہ ڈاکٹر صادق حسین،ص:۲۴۹



(۲۰) ایضاً

(۲۱) حیات جاوید،ص:۸۱

(۲۲) ایضاً،ص:۸۱

(۲۳) ایضاً،ص:۸۲۱

(۲۴) ایضاً،ص:۸۶

(۲۵) سرسید کے لیکچرز کا مجموعہ، مرتبہ منشی سراج الدین،ص:۱۳۹

(۲۶) لائل محمڈنز آف انڈیا،ص:۱۲

(۲۷) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم،ص:۵۷۰، مرتبہ ملک فضل دین

# کلمۂ حق

## اسباب بغاوت ہند

سرسید کی مسلمانوں کو پھر سے باعزت و باوقار بنانے کی کاوشوں کی ابتدا اسباب بغاوت ہند کی تصنیف سے ہوتی ہے۔ اس کتاب کے ذریعہ انھوں نے یہ ثابت کیا تھا کہ ۱۸۵۷ء میں پیش آنے والے واقعات کی ذمہ داری مسلمانوں اور دوسرے ہندوستانیوں پر نہیں انگریزوں کی حکمت عملی پر عائد ہوتی ہے۔ اس زمانے میں جبکہ حکومت مسلمانوں سے بے انتہا بدظن تھی مسلمانوں کے جرم ثابت کرنے کے لیے کسی ثبوت کی ضرورت نہ تھی۔ بلکہ ان کا مسلمان ہونا ہی کافی تھا اور برادران وطن بھی حکومت کی خیرخواہی کی آڑ میں مسلمانوں سے بدلے لے رہے تھے مسلمانوں کی حمایت کرنا جہاد سے کم نہ تھا۔

> ''ہندوستانی خیرخواہی سرکار کی آڑ میں مسلمانوں سے دل کھول کھول کر بدلے لے رہے تھے اور اگلے پچھلے بغض نکال رہے تھے مسلمانوں کو مجرم قرار دینے کے لیے کوئی ثبوت درکار نہ تھا ان کا مسلمان ہونا ہی ان کے مجرم ٹھہرانے کے لیے کافی تھا۔'' [۱]

ایسے وقت میں جب کہ مسلمان ہر طرف سے گھرا ہوا مطعون ہو رہا ہو مسلمانوں کی خیرخواہی میں کچھ کہنا نہ صرف کہنا بلکہ خود حکومت کی غلط پالیسیوں کو غدر کے واقعات کا ذمہ دار قرار دینا خودکشی کے مترادف تھا۔ زمانہ نہایت نازک تھا خیالات ظاہر کرنے کی مطلق آزادی نہ تھی۔ مارشل لاء کا دور دورہ تھا اور حاکموں کی زبان ہی قانون تھی۔ ایسے وقت میں انھوں نے جبکہ وہ مرادآباد میں تعینات تھے، اسباب بغاوت ہند لکھی جس میں عام ہندوستانیوں اور خاص کر مسلمانوں کو جن پر سارا الزام غدر کا تھا بغاوت کے الزام سے بری



کیا اور اس خطرناک اور نازک وقت میں وہ تمام الزامات جو لوگوں کے خیال میں حکومت پر عائد ہوئے تھے نہایت دلیری اور آزادی کے ساتھ بیان کیے اور جو وجوہات انگریزوں کے ذہنوں میں تھیں ان کی تردید کی اور ان کو غلط بتایا۔ سرسید کی زندگی کا صرف یہ ہی ایک مجاہدانہ کارنامہ ان کو ہمیشہ زندہ رکھنے کے لیے کافی تھا انگریزوں نے ملک مسلمانوں سے چھینا تھا اور اس وقت تو مکمل غلامی تھی اور آج جب کہ ہندوستان آزاد ہے ملک میں جمہور کی حکومت ہے۔ آزادی کی چالیس سالہ تاریخ میں ایک بھی شخص ایسا نظر نہیں آتا جس نے حق کو حق کہنے کی جرات کی ہو اور مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو حکومت کے سامنے رکھا ہو بلکہ الٹا مسلمانوں کو ہی فرقہ پرست اور قدامت پرست کہہ کر موردالزام ٹھہرایا جاتا رہا ہے۔

### اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو

رسالہ مکمل کرنے کے بعد بغیر اس کا ترجمہ انگریزی میں کرائے سرسید نے اس کی پانچ سو جلدیں چھپوالیں۔ جب انھوں نے ان کو پارلیمنٹ اور گورنمنٹ انڈیا میں بھیجنے کا ارادہ کیا تو ان کے دوست مانع آئے اور کہا کہ ان تمام کتابوں کو جلا دو اور ہرگز اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو لیکن سرسید کو جو آہنی عزم اور ارادہ کے مالک تھے قوم کی خیرخواہی منظور تھی چاہے اپنی جان ہی چلی جائے۔

> ''میں ان باتوں کو گورنمنٹ پر ظاہر کرنا ملک اور قوم اور خود گورنمنٹ کی خیرخواہی سمجھتا ہوں پس اگر ایک ایسے کام پر جو سلطنت اور رعایا دونوں کے لیے مفید ہو مجھ کو اگر گزند بھی پہنچ جائے تو گوارا ہے......
> سرسید نے اول دو رکعتیں بطور نفل ادا کیں اور دعا مانگی اور اسی وقت کچھ کم پانچ سو جلدوں کا پارسل ولایت کو روانہ کیا اور ایک جلد گورنمنٹ انڈیا میں بھیج دی اور کچھ جلدیں اپنے پاس رکھ لیں۔'' [۲]

یہ کتاب انگریزی میں ترجمہ ہو کر برٹش پارلیمنٹ میں پیش ہوئی تو کچھ ممبران نے بہت برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ اس شخص کو سخت سے سخت سزا ملنی چاہیے کیونکہ اس نے باغیانہ مضمون لکھا ہے۔ سرسید کی اس کوشش کا خاطر خواہ اثر حکومت پر ہوا اور مسلمانوں کے متعلق

جو غلط فہمی انگریز حکمرانوں میں چلی آ رہی تھی وہ کافی حد تک ختم ہوگئی۔ اس رسالہ میں سب سے بڑی شکایت جو سرسید نے کی تھی اور بغاوت کا اصلی سبب بتایا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسل میں شریک نہ ہونا تھا جس کے سبب سے گورنمنٹ کے خیالات رعایات پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہو پاتے تھے۔

> ''گورنمنٹ نے فوراً اس شکایت کا تدارک کیا۔ یعنی ۱۸۶۰ء میں یہ رسالہ گورنمنٹ میں پیش ہوا اور ۱۸۶۱ء میں ہندوستانی رئیس لیجسلیٹو کونسل کی ممبری پر نامزد کیے گئے۔''۳

سرسید کی یہ ایک تاریخی خدمت ہے کہ ان کی کوششوں سے ہندوستانیوں کو حکومت کے معاملات میں شریک ہونے کے لیے مدعو کیا گیا۔ سرسید ک وفات (۱۸۹۸ء) کے بعد مسٹر مارلین نے ایک مضمون ان کی پولیٹیکل خدمات کا ذکر کرتے ہوئے لکھا کہ کانگریس کو سرسید کے اس احسان کو ماننا چاہیے کہ ۱۸۵۸ء میں ہی انھوں نے حکومت سے کونسلوں میں ہندوستانیوں کے شریک کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

> ''انگریزوں میں بہت سے اس بات کے بڑے خواہشمند تھے کہ فتح کے بعد دل کھول کر انتقام لیں اور ان کے غصہ کی آگ مسلمانوں کے برخلاف خاص طور سے بھڑکی ہوئی تھی جن کی نسبت بہت سے لوگوں کا یہ خیال تھا کہ وہ غدر کے محرک ہوئے ہیں۔ اس وحشیانہ حالت میں جبکہ شدید تر خیالات کے پھیلنے کا احتمال تھا ایک ایسی حق بات کا جو عام پسند نہ تھی منہ سے نکالنا کوئی آسان بات نہ تھی......۱۸۵۸ء میں یہ دلیری کے الفاظ تھے......اور جو لوگ سرسید کے اس برتاؤ پر جو اس نے نیشنل کانگریس کے ساتھ کیا الزام لگاتے ہیں ان کے لیے اس بات پر غور کرنا مفید ہوگا کہ اس نے اتنی مدت پہلے جتنی کہ ۱۸۵۸ء سے اب تک گزری ہے گورنمنٹ پر زور ڈالا تھا کہ لیجسلیٹو کونسل میں دیسیوں کے داخل کرنے کی نہایت ضرورت ہے۔''۴

اسباب بغاوت ہند دراصل حریت کا پہلا بیج تھا جو ہندوستان کی سنگلاخ زمین میں



ڈالا گیا جو آگے چل کر آزادی کی تحریک کا تناور درخت بنا۔ مسٹر ہیوم کو اس کتاب کو پڑھ کر ہی انڈین نیشنل کانگریس بنانے کا خیال آیا تھا۔ رسالہ کی اس شکایت کو کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر نہیں لیا جاتا اس طرح دور کیا گیا:

> ''کتاب مذکور کے پیش ہونے سے دو برس بعد یعنی ۱۸۶۲ء میں پہلی بار پنڈت شمبھوناتھ ہائی کورٹ کلکتہ کے جج مقرر ہوئے اور رفتہ رفتہ اکثر اعلیٰ عہدے سے جو پہلے کبھی ہندوستانیوں کو نصیب نہیں ہوتے تھے ملنے لگے۔''۵

غلام ہندوستان میں مسلمانوں کی طرفداری میں جو پہلی آواز اٹھی وہ سرسید کی ہی تھی۔ قلم کی طاقت تلوار سے زیادہ ہوتی ہے صرف تلوار اٹھانے والے ہی مجاہد نہیں ہوتے بلکہ دانشمندی کے ساتھ اپنے قلم کو مسلمانوں کے لیے استعمال کرنے والے کو سب سے زیادہ سراہا جانا چاہیے اور یہ کہنا کہ جن لوگوں نے تلوار سے انگریزوں کا مقابلہ کیا صرف وہی مجاہد تھے حقیقت سے انحراف اور قلم کی طاقت کو تسلیم نہ کرنا ہے۔ کرنل گریہم سرسید کے پہلے سوانح نگار، لکھتے ہیں:

> ''غدر کے زمانے میں اور بہت مدت تک مسلمانوں پر ایک بددلی چھائی ہوئی تھی اس خوفناک زمانے کے تمام مکروہات ان کی طرف منسوب کئے جاتے تھے اور اس میں شک نہیں کہ یہ تعصب زیادہ تر بیجا تھا مسلمانوں کو اس کا بڑا رنج تھا اور یہ بات ان کو بری معلوم ہوتی تھی۔ ظاہراً کسی شخص نے ان کی حمایت میں حامی نہیں بھری۔ سید احمد خاں نے یہ مشکل کام اپنے ذمے لیا اور جہاں تک ان کی قدرت میں تھا انھوں نے مسلمانوں کی بگڑی ہوئی بات کو پھر درست کیا۔''۶

## خاکہ اسباب بغاوت ہند

اسباب بغاوت ہند سرسید کی شہرۂ آفاق تصنیف ہے۔ جس نے ہندوستان کی سیاست پر گہرے اثرات مرتب کیے اور ملک کی سیاست کا دھارا بدل دیا۔ انگریز حکمرانوں کو اپنی

غلطیوں کا احساس دلایا اوران کو وسیع انسانی اقدار کے مطابق عمل کرنے کا درس دیا۔ اس کام کے لیے انھوں نے خود عیسائیوں کی مذہبی کتابوں مثلاً متی، پطرس اور زبور کے حوالوں کا استعمال کیا۔ اس کتاب کی مختصر تفسیر یا اجمالی خاکہ قارئین کے لیے اور موجودہ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک عبرت کے بطور ہم پیش کرنا چاہتے ہیں تا کہ پتہ لے کہ جابر حاکموں کے سامنے سرسید نے کس طرح عام طور سے ہندوستانیوں اور خاص طور سے مسلمانوں کے مسئلہ کو پیش کیا اور خود حکومت کو اس کی غلطیوں کا احساس دلایا کہ وہ اپنی پالیسی بدلیں اگر ہندوستان پر امن سے حکومت کرنی ہے۔ بہت سے انگریز لیڈران نے اس کتاب کو باغیانہ قرار دیا تھا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروعات کر کے سرسید نے لکھا

''اس فساد کے اصلی سببوں پر غور کرنا اور اپنی صداقت سے سچے سچے سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہی اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں اس لیے مجھ پر واجب ہے کہ گو ان کا علاج بخوبی ہو گیا ہے۔ پھر بھی جو سبب میرے دل میں ہیں ان کو بھی ظاہر کر دوں۔''۸

اس تمہید کے بعد مضمون اس سوال سے شروع ہوا کہ ہندوستان کی سرکشی کا کیا سبب تھا اس کے بعد سرکشی کی چند مثالیں پیش کی ہیں اور بتایا ہے کہ:

''جان لو کہ اپنی گورنمنٹ کا مقابلہ کرنا یا مخالفوں کے شریک ہونا یا مخالفانہ ارادے سے حکم نہ ماننا اور نہ بجالانا یا نڈر ہو کر گورنمنٹ کے حقوق اور حدود کو توڑنا سرکشی ہے۔''

سرکشی کی اس تعریف کے بعد سرسید نے سوال اٹھایا کہ سرکشی کا ارادہ دل میں کیوں آتا ہے۔ بس یہیں سے ہندوستانیوں اور خاص مسلمانوں کے دلوں میں جو سرکشی پیدا ہوئی اور بغاوت ہوئی اس کی وجوہات بیان کرنے میں سرسید نے ہندوستانیوں پر ہوئی تمام زیادتیاں گنائی ہیں اور اس طرح ثابت کیا کہ خود حکومت گنہگار ہے۔ ہندوستانی نہیں۔ حکومت کا مدت دراز سے عوام کی رائے کے خلاف عمل کرنے سے ان کے دل میں سرکشی کے جذبات پنپ رہے تھے۔



''۱۸۵۷ء کی سرکشی میں یہی ہوا کہ بہت سی باتیں ایک مدت دراز سے لوگوں کے دل میں جمع ہوتی جاتی تھیں اور بہت بڑا میگزین جمع ہو گیا تھا صرف اس کے شتابے میں آگ لگانی باقی تھی کہ سال گزشتہ میں فوج کی بغاوت نے اس میں آگ لگا دی۔''

سرسید نے لکھا کہ چپاتی بٹنا کوئی سازش نہ تھی روس اور ایران کی سازش کچھ نہ تھی حتیٰ کہ بہادر شاہ ظفر کا ایران کے فرمانروا کو لکھنا کچھ عجب نہیں لیکن یہ سرکشی کی بنیاد نہیں ہے پھر بھی اتنی بہت سی سازشیں اگر ہو رہی تھیں اور حکومت کو پتہ تک نہ تھا؟

''کیا تعجب نہیں آتا کہ اتنی بڑی سازشیں اور اتنی مدت سے ہو رہی ہوں اور ہمارے حکام بالکل بے خبر رہیں۔''

پس کوئی سازش پہلے سے نہ تھی بلکہ اچانک یہ لاوا پھوٹ پڑا۔ ۱۷۵۷ء سے ہی انگریزوں کی حکومت ہندوستان پر قائم ہونی شروع ہو گئی تھی۔ سو سال کے بعد ۱۸۵۷ء میں ہندوستانیوں کو انگریزوں کی حکومت ختم کرنے کا خیال کیوں آنے لگا؟ بہت سے فسادات کے مواقع آئے اور ملک میں کچھ سرکشی نہیں ہوئی۔ مسلمانوں پر جہاد شروع کرنے کا الزام بالکل غلط ہے۔

''ظاہر ہے کہ بے گناہوں کا قتل علی الخصوص عورتوں اور بچوں اور بوڑھوں کا مذہب کے بموجب جرم عظیم تھا پھر کیونکر یہ ہنگامۂ غدر جہاد ہو سکتا تھا۔''

مسلمانوں کی ناراضگی باعتبار مذہب کے تھی اور ہندوؤں کی بنسبت مذہب میں مداخلت کی وجہ سے مسلمان زیادہ ناراض تھے۔ فوج میں کوئی پہلے سے سازش نہ تھی اور بادشاہ کو مطلق اس سازش کا علم نہ تھا۔

''بلاشبہ فوج باغی دلی پر جمع ہو گئی تھی۔ مگر جب اس نے سرکار سے بگاڑی تھی تو دلی کے بادشاہ کے سوا ایسا اور کون شخص تھا جس کی طرف فوج رجوع کرتی اس میں کچھ پہلے سے سازش کی حاجت نہ تھی۔''

## اہل ہند کی قانون ساز اسمبلی میں شرکت ضروری تھی

تمام ہندوستانیوں کو ہر الزام سے بری کر کے اور فرداً فرداً ہر طرح پر کی گئی سازشوں کا جواب لکھنے کے بعد جن کو کہ انگریز اپنے خیال میں لا سکتے تھے۔ سرسید نے اصلی سبب شورش کا ہندوستانیوں کا ملک کی قانون ساز اسمبلی میں شریک نہ ہونا قرار دیا اور اس طرح ایک نئی تحریک شروع ہوئی اور ہندوستانیوں کی حکمرانی میں شمولیت کا دور جاری ہوا۔ سرسید نے بہت عظیم الشان الفاظ میں اظہار کیا:

> ''اصلی سبب اس فساد کا میں تو ایک ہی سمجھتا ہوں باقی جس قدر اسباب ہیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں......تمام مصنفین پرنسپل آف گورنمنٹ (حکمرانی کے قوانین) کے اس باب میں میرے طرفدار ہیں اور تمام تاریخیں یورپ اور افریقہ کی میری رائے کی صداقت پر بہت معتمد گواہ ہیں......پیشتر اس سے کہ خرابیاں اس درجہ کو پہنچیں کہ پھر جن کا علاج ممکن نہ ہو اور یہ بات حاصل نہیں ہوتی جب تک کہ مداخلت رعایا کی حکومت میں نہ ہو علی الخصوص ہماری گورنمنٹ کو جو غیر ملک کی رہنے والی تھی اور مذہب اور رواج راہ و رسم اور طبیعت اور عادات بھی اس ملک سے مختلف رکھتی تھی اس بات پر خیال رکھنا واجبات سے تھا۔ گورنمنٹ کا انتظام اور اس کی خوبی اور اسلوبی اور پائیداری ملکی اطوار اور عادات کی واقفیت اور پھر اس کی رعایت پر موقوف ہے...... بلاشبہ پارلیمنٹ میں ہندوستان کی رعایا کی مخالفت غیر ممکن اور بے فائدہ تھی مگر لجسلیٹو کونسل میں مداخلت نہ رکھنے کی کوئی وجہ نہ تھی بس یہی ایک بات ہے جو جڑ ہے تمام ہندوستان کے فساد کی اور جتنی باتیں جمع ہوتی گئیں وہ سب اس کی شاخیں ہیں۔''

یہ تھا اعلان حق اور بے باکی تحریر کہ تمام خرابیوں اور فسادات کی ذمہ داری خود حکومت پر عائد کر دی اس لیے کہ اس نے ہندوستانیوں کو حکومت میں شامل نہیں کیا۔ اگر سیلف



گورنمنٹ اور حکومت خود اختیاری کا حاصل کرنا آزادی کی جنگ ہے تو بلاشبہ اس مطالبہ کی بنا پر اور ایسے وقت میں جب کہ ملک صحیح معنوں میں غلام ہوئے ابھی دو سال بھی نہ گزرے تھے سرسید سب سے بڑے جنگ آزادی کے رہنما قرار دیے جانے چاہئیں لیکن پروپیگنڈہ اس کے برخلاف جاری ہے اور سرسید پر الزام وفاداری ہے یہ کیسا تاریخ کا المیہ ہے اور کیوں ایسا کیا جا رہا ہے کیا مقاصد پوشیدہ ہیں اس الزام کے پیچھے؟

> ''بلاشبہ ہماری گورنمنٹ کو نہیں معلوم تھا کہ ہماری رعیت پر دن کیسا گزرتا ہے اور رات کس مصیبت کی آتی ہے اور وہ دن بدن کس مصیبت میں پڑتے جاتے ہیں اور کیا کیا رنج روز بروز ان کے دل میں جمتے جاتے ہیں جو رفتہ رفتہ بہت کثرت سے جمع ہو گئے تھے اور ایک ادنیٰ تحریک سے دفعتاً بہہ پڑے۔''

آگے سرسید نے یہ خیال ظاہر کیا کہ لجسلیٹو کونسل میں ہندوستانیوں کے شریک نہ ہونے سے گورنمنٹ کو اور رعایا دونوں کو ان قوانین کی افادیت بڑھانے میں حصہ دینے کا موقع نہیں مل سکا، حکومت کے اچھے کام کو بھی رعایا غلط سمجھتی تھی اور حکومت کو صحیح طور سے فلاحی کاموں کے کرنے کے قوانین وضع کرنے میں بغیر ہندوستانیوں کی شرکت کے دشواری پیش ہوئی۔

> ''رعایا کو اصلی منشا اور اصلی مطلب اور دلی ارادہ حکومت کا معلوم نہ ہوا۔ گورنمنٹ کی ہر تجویز پر رعایا کو غلط فہمی ہوئی۔ جو تجویز گورنمنٹ کی ہوتی تھی ہندوستانیوں کو بسبب اس کے کہ وہ لوگ اس میں شریک نہ تھے اس کی بنیاد معلوم نہ ہوئی اور ہمیشہ یہی سمجھتے کہ یہ بات ہمارے اور ہمارے ہم وطنوں کے خراب اور برباد اور ذلیل اور بے دھرم کرنے کو ہے۔''

## تصور پارلیمنٹ

سرسید نے اس مسئلہ پر بحث نہیں کی کہ کس طریقے پر رعایا کو لجسلیٹو کونسل (مجلس واضعان قوانین) میں شریک ہونے کا اختیار دیا جاتا انھوں نے کہا کہ یہ موقع اس بحث کا

نہیں ہے کہ انتخاب کے طریقوں پر گفتگو کی جائے۔یعنی انتخاب یا الیکشن کا تصور سرسید کے ذہن میں ۱۸۵۸ء میں بھی تھا اور وہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کا انتخاب کونسلوں میں ہو۔

''ہم نہیں چاہتے کہ اس مقام پر ہم سے یہ گفتگو کی جائے کہ ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کونسل میں شریک ہونا کس طرح ہوتا اور کیا قاعدہ ہندوستانیوں کی شرکت کا نکلتا اور اگر رعایائے ہندوستان کو مثل پارلیمنٹ (برطانوی) کے لیجسلیٹو کونسل میں مداخلت دی جاتی تو طریقہ ان کے انتخاب کا کیا ہوتا۔............اس مقام پر ہم کو صرف اتنا ثابت کرنا ہے کہ یہ بات گورنمنٹ کے لیے بہت اچھی اور ضرور تھی اور اسی کے نہ ہونے کے سبب یہ فساد برپا ہوئے اور طریقہ مداخلت رعایا کی بابت ہماری علیحدہ رائے ہے اس کو دیکھنا چاہیے اور جو بحث ہو وہاں کرنی چاہیے۔''

سرسید نے صاف الفاظ میں یہ مطالبہ رکھا کہ ہندوستان کی عوام کو لیجسلیٹو کونسل میں نمائندگی دی جائے اسی طرح جس طرح برطانوی عوام کو وہاں کی پارلیمنٹ میں نمائندگی ہے۔ اس زمانہ میں بھی سرسید کا ذہن اس قدر صاف انداز میں سوچ رہا تھا کہ عوام کی نمائندگی کے بغیر اور ان کے انتخاب کے بغیر حکومت ملک میں چل نہیں سکتی اور سارے فسادات کا سبب یہی کمی ہے باقی سب باتیں اس کی شاخیں ہیں لیکن حکومت نے سرسید کی اس تجویز کو محض اتنا مانا کہ عوام کی نمائندگی سے نہیں بلکہ اپنی مرضی سے راجہ اور جاگیرداروں کو لیجسلیٹو کونسل میں تعلقات کی بنیاد پر نامزد کرنا شروع کر دیا۔ بلاشبہ یہ بھی ایک بڑی رعایت حکومت نے ہندوستانیوں کو دی۔

اس کے آگے سرسید نے پانچ اصول سرکشی کے وقوع ہونے کے بتائے ہیں ۔ یہ پانچوں اصول حکومت کی بے احتیاطیوں اور ذمہ داریوں کو پورا نہ کرنے کی طرف نشاندہی کرتے ہیں:

(۱) غلط فہمی رعایا یعنی برعکس سمجھنا تجاویز گورنمنٹ کا۔

(۲) جاری ہونا ایسے آئین اور ضوابط اور طریقۂ حکومت کا جو ہندوستان کی حکومت اور



ہندوستانیوں کی عادات کے مناسب نہ تھے یا مضرت رسانی کرتے تھے۔

(۳) ناواقف رہنا گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات اور اطوار اور عادات اور ان مصائب سے جو ان پر گزرتی تھیں اور جن سے رعایا کا دل گورنمنٹ سے پھٹا جاتا تھا۔

(۴) ترک ہونا ان امور کا ہماری گورنمنٹ کی طرف سے جن کا بجالانا ہماری گورنمنٹ کے لیے واجب اور لازم تھا۔

(۵) بدانتظامی اور بے اہتمامی فوج کی۔

## عیسائی بنانے کی مہم غلط تھی

ان پانچوں اسباب کی تفصیل سرسید نے بتائی ہے اور فرداً فرداً ہر شق پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

عوامی غلط فہمیوں کا بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ پہلا بڑا سبب اس سرکشی کا یہ تھا کہ عوام میں تمام طبقوں کے لوگ عاقل، اعلیٰ قابل و جاہل غرض ہر طرح کے لوگ یہ سمجھتے تھے کہ حکومت کا ارادہ ہندوستانیوں کے مذاہب و رسم و رواج میں تبدیلی کرنے کا ہے اور یہ سمجھتے تھے کہ حکومت علانیہ جبر سے مذہب تبدیل نہیں کرائے گی بلکہ جس قدر عوام ان کے قبضہ میں آتے چلے جائیں گے لالچ دے کر اپنے دین میں شامل کرتے جائیں گے۔

''سب جانتے تھے کہ گورنمنٹ نے پادری صاحبوں کو ہندوستان میں مقرر کیا ہے۔گورنمنٹ سے پادری صاحب تنخواہ پاتے ہیں گورمنٹ اور حکام انگریزی ہر طرح ان کے مددگار و معاون ہیں...... اپنے ملازموں کو حکم دیتے تھے کہ ہماری کوٹھی میں پادری صاحب کا وعظ سنو اور ایسا ہی ہوتا تھا غرضیکہ اس بات نے ایسے ترقی پکڑی تھی کہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ گورنمنٹ کی عمل داری میں ہمارا یا ہماری اولاد کا مذہب قائم رہے گا۔''[9]

پادری صاحبان کی بہت سی بے جا کارروائیوں کا ذکر سرسید نے کیا ہے کہ وہ دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کو کھلے عام برا کہتے تھے اور زبردستی لوگوں کو وعظ سننے پر مجبور کرتے تھے

اس سلسلہ میں مشنری اسکولوں کی کارروائیوں کو بھی ہدف ملامت بنایا ہے کہ وہاں جو بچے عیسائی مذہب کے مطابق جواب دیتے تھے ان کو زیادہ نمبر دیے جاتے تھے۔ان باتوں سے ہی عوام کا دل گورنمنٹ کی طرف سے پھر گیا تھا۔اسی طرح لڑکیوں کے کالج شروع کرنے سے بھی عوام میں مخالف رجحان پایا جاتا تھا اس کے علاوہ نوکروں میں بھی پادریوں کی سفارش اور سرٹیفکٹ پر زیادہ توجہ کی جاتی تھی۔

> ''چھوٹی چھوٹی نوکریاں بھی ڈپٹی انسپکٹروں کے سرٹیفکٹ پر جن کو ابھی تک لوگ کالا پادری سمجھتے تھے منحصر ہوگئیں اور ان غلط خیالات کے سب لوگوں کے دلوں پر ایک غم کا بوجھ پڑ گیا اور سب کے دل میں ہماری گورنمنٹ سے ناراضی پیدا ہوگئی اور لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ہندوستانیوں کو ہر طرح بے معاش اور محتاج کیا جاتا ہے تاکہ مجبور ہوکر رفتہ رفتہ ان لوگوں کی مذہبی باتوں میں تغیر وتبدل ہوجائے۔''۱۰؎

یہ سب باتیں جمع ہوتی ہی جارہی تھیں کہ ۱۸۵۵ء میں پادری ایڈمنڈ کا دارالسلطنت کلکتہ سے ایک خط شائع ہوا جس میں کہا گیا تھا کہ اب تمام ہندوستانیوں میں ایک حکومت ہوگئی ہے۔لہٰذا مذہب بھی سب کا ایک ہونا چاہیے اس لیے یہ اپیل کی گئی کہ سب لوگ عیسائی ہوجائیں۔

> ''میں سچ کہتا ہوں کہ ان چھٹیات کے آنے کے بعد خوف کے مارے سب کی آنکھوں میں اندھیرا آگیا پاؤں تلے کی مٹی نکل گئی۔سب کو یقین ہوگیا کہ ہندوستانی جس وقت کے منتظر تھے وہ وقت اب آگیا۔اب جتنے سرکاری نوکر ہیں اول ان کو کرسٹان ہونا پڑے گا اور پھر تمام رعیت کو سب لوگ بے شک سمجھتے تھے کہ یہ چٹھیاں گورنمنٹ کے حکم سے آئی ہیں............ اگر سچ پوچھو تو یہ چٹھیاں تمام ہندوستانیوں کے غلط شبہات کو پکا اور مستحکم کرنے والی تھیں چنانچہ انھوں نے کردیا اور اس کے مٹانے کی کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی۔''۱۱؎

سرسید نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو ان تمام باتوں کا بہت دکھ تھا کیونکہ ہندو اپنے مذہب



میں مداخلت پر زیادہ برا نہیں مانتے بمقابلہ مسلمانوں کے کہ مسلمان اپنے عقائد اور احکام الٰہی کو ماننے میں ہی اپنی نجات سمجھتے ہیں۔

دوسرا سبب سرسید نے یہ بتایا کہ ایسے قوانین اور ایسا طریقۂ حکومت جاری ہوا جو ہندوستانیوں کی عادات کے خلاف تھا۔کئی ملکی قوانین سے ہندوستانیوں کے مذہب میں مداخلت ہوئی مثلاً ایکٹ۲۱،۱۸۵۰ء،ایکٹ۱۵،۱۸۵۶ء۔

> ''لیجسلیٹو کونسل سے بھی امور مذہبی میں مداخلت ہوئی۔ایکٹ ۲۱، ۱۸۵۰ء صاف مذہبی قواعد پر خلل انداز تھا پھر اس ایکٹ سے ایک یہ بدگمانی لوگوں کو تھی کہ یہ ایکٹ خاص واسطے ترغیب عیسائی مذہب قبول کرنے کے جاری ہوا ہے۔''۱۲؎

ایکٹ ۱۵ کے تحت حکومت نے ہندو بیواؤں کو کچھ حقوق دیے تھے اس پر بہت سے ہندو یہ سمجھتے تھے کہ یہ ان کے مذہب میں دخل اندازی ہے۔اس کے علاوہ زمین کی ضبطی کا قانون جو کہ ۱۸۱۹ء سے لاگو تھا اس سے عوام میں بہت شکایت تھی اس کے علاوہ حکومت نے لگان وصول کرنے میں جو سختیاں کی تھیں اور جس طرح اس کو وصول کیا جاتا تھا سرسید نے اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے اور خاص سبب سرکشی کا بتایا ہے۔

> ''اکثر اضلاع میں ہر ایک بندوبست سخت ہوگیا۔زمینداروں کاشتکاروں کو نقصان عائد ہوئے رفتہ رفتہ وہ بے سامان ہوگئے زراعت کا سامان بہت کم ہوگیا......ادائے مال گزاری کے لیے وہ قرض دار ہوئے سود قرضہ زیادہ ہونے لگا بہت سے زمیندار جو بہت اچھا سامان اور معقول خرچ رکھتے تھے مفلس ہوگئے۔''۱۳؎

اس کے ساتھ ساتھ اودھ میں تعلقداری کا خاتمہ، اسٹامپ خرچ کا جاری ہونا کہ ہندوستانی اس خرچ سے واقف نہ تھے، دیوانی، عدالتوں کا ناقص انتظام بہت سے اسباب بغاوت بڑھانے میں معاون ہوئے۔

## ہندوستانیوں کو مفلس بنا دیا گیا

تیسرا سبب گورنمنٹ کا رعایا کے اصلی حالات و اطوار و عادات اور ان پر جو مشکلیں و مصیبتیں پڑتی تھیں سے ناواقف رہنا بتایا ہے اور کیوں کہ حکومت کو رعایا کے متعلق پہنچتی تھیں وہ حکام کے ذریعہ بھیجی جاتی تھیں جو کہ خود عوام کی مشکلات سے ناواقف تھے کیونکہ ان کے رعب اور دبدبہ کے آگے کوئی سچی بات ان کے سامنے نہ کہہ سکتا تھا۔اس طرح رعایا اندر ہی اندر گھٹتی رہی اور اس کی فلاح کی کوئی تجویز نہ ہوئی:

> ''جو نیا قانون گورنمنٹ کی طرف سے جاری ہوا اس سے جو مضرت رعایا کے مال اور رفاہ و فلاح کو پہنچی اس کا رفع کرنے والا اس کی خبر کرنے والا کوئی نہ تھا اس قسم کے امور میں کوئی غمخوار رعایا نہ تھا بجز ان کے لہو کے جو جل جل کر ان کے بدن میں رہتا تھا اور بجز ان کی بے کسی کے جس پر وہ آپ رو کر چپ ہو رہتے تھے۔''۱۴؎

مفلسی عوام میں دم بدم بڑھتی جاتی تھی خاص مسلمان اس سے بہت زیادہ متاثر تھے کہ ان کو نوکریاں دیا جانا تقریباً موقوف کر دیا گیا تھا۔ ہندوؤں کے مقابلہ میں مسلمان زیادہ تر روزگار پیشہ تھے لہٰذا ان پر نوکریوں کے دروازے بند ہونے سے بہت اثر پڑا۔

> ''مسلمان اس ملک کے رہنے والے نہیں ہیں اگلے بادشاہوں کے ساتھ یہ وسیلہ روزگار کے لیے ہندوستان میں آئے اس لیے سب کے سب روزگار پیشہ تھے اور کمی روزگار سے ان کو زیادہ تر شکایت تھی۔''۱۵؎

اسی مفلسی کے سبب اکثر لوگ باغی فوج میں قلیل ترین آمدنی پر بھی نوکر ہو گئے بعض بعض کو یومیہ ایک آنہ تک ملتا تھا مگر جس طرح بھوکا اناج پر گرتا ہے اسی طرح رعایا نے ان نوکریوں کو قبول کیا۔اس کے علاوہ سرسید نے لکھا کہ جاگیروں کا نہ دیا جانا بلکہ ان کی ضبطی اور کمپنی کے عمل کی وجہ سے ملک میں عام مفلسی پھیل گئی تھی۔

چوتھی وجہ سرسید نے یہ بتائی کہ جو کام حکومت کو کرنے چاہیے تھے وہ اس نے نہ کیے۔



سرسید نے حکومت کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا اور ملک میں امن قائم کرنے کی نئی راہ سمجھائی بلاشبہ یہ کام ایک عظیم انسان ہی کر سکتا تھا۔انھوں نے ان کاموں کو گناتے ہوئے جو کہ حکومت نے نہیں کیے اور کرنے چاہیے تھے لکھا کہ حکومت نے عوام اور حکام اور انگریز اور ہندوستانیوں میں راہ و رسم پیدا کرنے کی کوئی ترکیب نہ کی۔رعایا اور حکومت کا اتحاد اور میل اور محبت ہی وہ اہم چیز ہے جسکے سبب حکمرانی آسان ہوتی ہے۔انگریزوں کو حضرت مسیح کا قول یاد دلاتے ہوئے لکھا کہ:

> ''کیا مسیح مقدس کا یہ قول دل کو تسلی دینے والا نہیں ہے کہ جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں ویسا ہی تم بھی ان سے کرو۔ مراد مسیح مقدس کی اس نصیحت سے محبت ہے۔غرض کوئی عقلمند اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ محبت اور اتحاد بہت عمدہ چیز ہے اور بہت اچھے نتیجے دیتی ہے اور بہت سی برائیوں کو روکتی ہے آج تک ہماری گورنمنٹ نے یہ محبت ہندوستان کی رعایا کے ساتھ پیدا نہیں کی۔''۱۶؎

بلکہ اس کے برعکس حکومت نے عوام کو اپنے سے اتنی دور رکھا جیسے آگ اور سوکھی گھاس۔حکومت اور ہندوستانی دو پتھر کے ٹکڑے ہیں ایک کالا اور ایک سفید۔ ہندوستان کا مذہب زبان اور کلچر سب انگریزوں سے الگ تھا پھر کس وجہ سے انگریز ہندوستانیوں سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے؟ یعنی سرسید کے خیال میں وفاداری کی کوئی وجہ موجود نہ تھی۔

> ''اب غور کرو کہ ہمارے حکام اور ہندوستانیوں کا خون ایک نہ تھا مذہب ایک نہ تھا رسم و رواج ایک نہ تھا دلی رضامندی رعایا کو نہ تھی آپس میں محبت اور اتحاد نہ تھا پھر کس بات پر ہمارے حکام ہندوستان سے وفاداری کی توقع رکھتے تھے۔''۱۷؎

## ہندوستانی ذلیل کیئے گئے

انگریزوں سے پہلے مسلمان اس ملک میں حکمراں بن کر آئے مگر انھوں نے آتے ہی ہندوستانیوں سے میل محبت پیدا کر لی اس طرح آرام سے کاروبار حکومت چلتا رہا محکوم و

رعایا دونوں خوش مگر انگریزوں نے سوسال کے عرصہ میں بھی ایسا نہ کیا بلکہ الٹا ہندوستانیوں کو ذلیل وخوار کیا اوران کوادنیٰ سمجھا کوئی عزت ہندوستانیوں کی باقی نہ بچی۔ مفلسی اور بے عزتی دو چیزیں ہندوستانیاں کوانگریزوں سے ملیں۔

''بلاشبہ تمام رعایا ہندوستان کی اس بات کی شاکی ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ان کونہایت بے قدر اور بے وقر کردیا ہے۔ ہندوستان کے اشراف آدمی کی ایک چھوٹے سے یورپین کے سامنے ایسی بھی قدر نہیں جیسی کہ ایک چھوٹے یورپین کی ایک بہت بڑے ڈیوک کے سامنے یوں تصور یا جاتا تھا کہ ہندوستان میں کوئی جینٹل مین نہیں۔'' ۱۸

سرسید نے حکام کی بدتمیزی اور رعونت کا نقشہ بہت دلسوزی سے کھینچا ہے۔ کہا ہے کہ دوسری طرح کے افسران بھی تھے مگر بہت قلیل۔ اکثر حکام ہندوستانیوں کومثل جانور کے سمجھتے تھے اور کوئی عزت ان کی نہ کرتے تھے بلکہ الٹا بے عزت کرنے کے بہانے تلاش کرتے رہتے تھے ان کی بدمزاجی اور بے پروائی کی حکومت نے مطلق خبر نہ لی۔

''کیا یہ ہماری گورنمنٹ کونہیں معلوم کہ بڑے سے بڑے ذی عزت ہندوستانی حکام سے لرزاں اور بے عزتی کے خوف سے ترساں نہ تھے؟ اور کیا یہ بات چھپی ہوئی ہے کہ ایک اشراف، اہلکار کے سامنے مثل پڑھ رہا ہے اور ہاتھ جوڑ جوڑ کر باتیں کررہا ہے کہ صاحب کی بدمزاجی اور سخت کلامی بلکہ دشنام دہی سے دل میں روتا جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہائے افسوس روٹی اور کہیں نہیں ملتی اس نوکری سے تو گھاس کھودنی بہتر ہے۔'' ۱۹

سرسید نے لکھا ہے کہ کچھ ایسے حاکم بھی تھے جنھوں نے حضرت عیسیٰ کی نصیحت یاد رکھی جوایک بارانھوں نے مچھلی کا شکار کرنے والوں کو کی تھی کہ آؤ میرے پیچھے میں تمہیں آدمیوں کا شکار کرنے والا بتاؤں گا اور ایسے ہی حاکموں نے حکومت کا رعب بھی رکھا ہے اور غرور بھی نہیں کیا۔ یہ تمام بے عزتیاں اور ذلتیں گو کہ تمام ہندوستانیوں کو بری لگتی تھیں مگر مسلمان



چونکہ ایک عرصہ تک اس ملک میں حکمراں رہے تھے ان کو اپنی عزت زیادہ پیاری تھی اور بسبب اپنی غیرت اور فطرت کے عزت کے آگے کسی چیز کی حقیقت نہیں سمجھتے۔

''یہ باتیں ہر ایک قوم کے لوگوں کو ناگوار تھیں مگر مسلمانوں کو زیادہ گراں گزرتی تھیں۔ مگر اسکا سبب بہت روشن ہے کہ صدہا سال سے مسلمان ہندوستان میں بھی باعزت چلے آتے تھے ان کی طبیعت اور جبلت میں ایک غیرت ہے دل میں روپیہ کا لالچ بہت کم ہے کسی لالچ سے عزت کا جانا نہیں چاہتے بہت تجربہ ہوا ہوگا کہ اورقومیں جو باتیں بغیر رنج کے اٹھالیتی ہیں مسلمانوں کواس سے بھی ادنیٰ بات کا اٹھانا نہایت مشکل ہوتا ہے۔'' ۲۰

یہی سبب تھا کہ مسلمان زیادہ رنج میں تھا اوراسی وجہ سے زیادہ جوش سے شورش میں حصہ لیا اور جتنا حصہ لیا اس سے کہیں بہت زیادہ حکومت کو بسبب اپنے تعصب کے دکھائی دیا اوراسی وجہ سے حکام نے انتقام بھی مسلمانوں سے بہت زیادہ لیا۔ سرسید نے اسکی وجہ پرغور کرنے کی دعوت دی کہ دیکھا جائے کیوں سورش اتنی زیادہ دکھائی دی جتنی کہ نہ تھی اس کا سبب انھوں نے انگریزوں کا تعصب اور مخالفوں کی خودغرضانہ باتوں کوقرار دیا۔

''جن اضلاع میں مسلمان زیادہ تر مفسد دکھائی دیے اس کا سبب صرف یہی خیال کرنا چاہیے کہ دلی کی سلطنت پر مسلمان بادشاہ نے دعویٰ کیا تھا اور درحقیقت مسلمان اسی قدر مفسد ہوئے تھے جیسا کہ نظر پڑے نہیں حکام کا مزاج دفعتاً ان باتوں سے جوظاہر میں مسلمان سے ہوئی ناراض ہوگیا۔ ان کے مخالفوں کی بڑی گنجائش ہوگئی۔ خودغرضانہ باتیں پیش کرنے کوتھوڑی بات کو بہت بڑھا کر کہا ادھر حکام کوزیادہ ناراضی ہوئی ادھر مسلمانوں کوزیادہ تر خوف و مایوسی ہوئی اوراپنی تقدیر سے جتنے تھے اس سے زیادہ مفسد دکھائی دیے۔'' ۲۱

مگر سرسید نے یہ بھی حکومت کو یاد دلایا کہ مسلمانوں نے ہی زیادہ تر اپنی جان پرکھیل کر انگریزوں کی جانیں بچائیں۔

پانچویں وجہ سرسید نے اس ہنگامے کی فوج کی بدانتظامی کو قرار دیا۔ خاص بدانتظامی سرسید کی نظر میں یہ تھی کہ فوج میں مخلوط پلٹنیں قائم تھیں اگر جدا جدا قوموں کی جدا جدا فوجیں ہوتیں تو سرکوبی کرنے میں آسانی ہوتی بلکہ یہ سرکشی ہی پیش نہ آتی اس صورت میں مسلمانوں کو شاید کارتوس کاٹنے میں بھی اعتراض نہ ہوتا۔

''یہ بات سچ ہے کہ ہماری گورنمنٹ نے ہندو مسلمان دونوں قوموں کو جو آپس میں مخالف ہیں نوکر رکھا تھا مگر بہ سبب مخلوط ہونے ان دونوں قوموں کے ہر ایک پلٹن میں یہ تفرقہ نہ رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایک پلٹن کے جتنے نوکر ہیں ان میں بہ سبب ایک جا رہنے کے اور ایک لڑی میں مرتب ہونے کے آپس میں اتحاد و ارتباط برادرانہ ہو جاتا تھا اسی سبب سے ہندو مسلمان کی تمیز نہ تھی دونوں قومیں آپس میں اپنے آپ کو بھائی سمجھتی تھیں...... اگر انہیں دونوں قوموں کی پلٹنیں اس طرح پر آراستہ ہوتیں کہ ایک پلٹن نری ہندوؤں کی ہوتی جس میں کوئی مسلمان نہ ہوتا اور دوسری پلٹن نری مسلمانوں کی ہوتی جس میں کوئی ہندو نہ ہوتا تو یہ آپس کا اتحاد اور برادری نہ ہونے پاتی اور وہی تفرقہ قائم رہتا اور میں خیال کرتا ہوں کہ شاید مسلمان پلٹنوں کو کارتوس کاٹنے میں کچھ عذر نہ ہوتا۔

اس کے آگے لکھا کہ میرٹھ میں فوجیوں کو غدر سے پہلے سے سخت سزائیں دی گئیں تھیں اس وجہ سے فوج میں سرکشی تھی اور میرٹھ کی فوج میں حکومت کا اعتبار جاتا رہا تھا۔ سب سے آخر میں سرسید نے پنجاب میں سرکشی نہ ہونے کے اسباب گنائے ہیں اور کتاب ختم ہو جاتی ہے۔



## حواشی:

(۱) حیات جاوید، ص:۹۲

(۲) ایضاً، ص:۹۴

(۳) ایضاً، ص:۳۲۶

(۴) بحوالہ حیات جاوید، ص:۳۲۴

(۵) حیات جاوید، ص:۳۲۶

(۶) انتخاب رپورٹ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس، لاہور ۱۸۹۹ء، ص:۱۵۹

(۷) یہ اشارہ ملکہ وکٹوریہ کے اشتہار کی طرف ہے جس میں عام معافی اور امن وامان کا اعلان کیا گیا تھا۔ سرسید نے اس کے شکریہ کے طور پر مرادآباد میں شاہ بلاقی کی مسجد میں مسلمانوں کا ایک جلسہ کیا جس میں پندرہ ہزار سے زائد مسلمان شریک ہوئے۔

(۸) اسباب بغاوت ہند، ص:۸۰۳، ضمیمہ حیات جاوید

(۹) اسباب بغاوت ہند، ص:۸۱۶

(۱۰) ایضاً، ص:۸۱۹

(۱۱) ایضاً، ص:۸۲۰

(۱۲) ایضاً، ص:۸۲۱

(۱۳) ایضاً، ص:۸۲۵

(۱۴) ایضاً، ص:۸۲۹

(۱۵) ایضاً، ص:۸۳۰

(۱۶) ایضاً، ص:۸۳۳

(۱۷) ایضاً، ص:۸۳۴

(۱۸) ایضاً، ص:۸۳۵

(۱۹) ایضاً، ص:۸۳۶

(۲۰) ایضاً، ص:۸۳۷

(۲۱) ایضاً، ص:۸۴

# اصلاحی کاموں کا آغاز: سائنٹفک سوسائٹی

مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنے کے لیے اور ان کی انگریزی علوم اور سائنس سے وحشت دور کرنے کے لیے سر سید نے اپنے قیام غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی جس کا مقصد یورپ کے بہترین علوم کا اردو میں ترجمہ کرا کے شائع کرنا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان انگریزی زبان سے نفرت کرتے ہیں اگر وہی علوم جو انگریزی میں ہیں ان کا ترجمہ کر کے اردو میں پڑھا جائے جائیں تو شاید مسلمانوں کو اعتراض نہ ہوگا۔

> ''مسلمان انگریزی پڑھنے کو گناہ سمجھتے تھے اور مسلمانوں کے سوا دوسری قوموں کے لیے بھی کوئی ایسی ترغیب نہ تھی جس سے وہ انگریزی تعلیم کی طرف مائل ہوں۔ تمام عدالتوں میں دیسی زبان مروج تھی اعلیٰ سے اعلیٰ عہدوں کے لیے جو اس وقت تک مسلمانوں کو مل سکتے تھے مشرقی زبانوں کی تعلیم کافی تھی۔''[1]

مسلمان انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے اور ہندو محض نوکریوں کے حصول کے لیے انگریزی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے دونوں کے دل میں انگریزی علوم کا نقش جمانے کے لیے ضروری تھا کہ کچھ علمی و تاریخی کتابیں انگریزی سے ترجمہ کرا کے اردو میں شائع کی جائیں تا کہ مغربی لٹریچر اور مغربی علوم کی افادیت کا ان کو اندازہ ہو سکے اور انگریزوں و ہندوستانیوں کی بیگانگی میں کمی آئے۔ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک علمی سوسائٹی قائم کی جائے جس میں انگریز اور ہندوستانی دونوں شانہ بشانہ مل کر کام کر سکیں لہٰذا سر سید نے ایک مضمون بعنوان ''التماس بخدمت ساکنان ہندوستان در باب ترقی تعلیم اہل ہند'' چھاپ کر شائع کیا جس میں یہ تجویز تھی کہ ہندوستان میں علم پھیلانے اور ترقی دینے کے لیے ایک مجلس مقرر کرنی چاہیے جو مفید سائنس اور انگریزی لٹریچر کا ترجمہ کر کے



اردو میں چھاپے۔ اس کے نتیجہ میں ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی غازی پور میں قائم ہو گئی سر سید اس کے آنریری سکریٹری قرار پائے۔ وزیر ہند سوسائٹی کے پیٹرن اور گورنر صوبہ شمال و مغرب اور گورنر صوبہ پنجاب وائس پیٹرن۔

تمام شمالی ہند میں یہ سوسائٹی اپنی طرز کی پہلی تنظیم تھی اور اس کے قیام کے کچھ عرصہ بعد ہی بہت سی سوسائٹیاں اور سبھائیں وجود میں آ گئیں اس کے علاوہ چند برس کے قلیل عرصہ میں ہی بہت سی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کر کے چھپ گئیں۔ علی گڑھ میں ایک بہت عمدہ عمارت سوسائٹی کے نام سے بنوائی گئی۔ سوسائٹی کو چلانے کے لیے سر سید نے خود بہت زیادہ خرچ کیا جو ہمیشہ ان کا دستور رہا جب کبھی کسی کام کے لیے چندہ مانگتے سب سے پہلے خود اس میں اپنا حصہ ڈالتے تھے۔ اپنا ذاتی قیمتی پریس تک سوسائٹی کے حوالے کر دیا۔ سوسائٹی کی آمدنی بڑھانے کے لیے فوجداری اور کلکٹری کے مختاروں کو قانون پر لیکچر دینا شروع کیا تا کہ جو فیس ملے وہ سوسائٹی کے کام آئے۔ غرض کہ سوسائٹی کی تمام کوششیں سر سید کی جانفشانی کی بدولت کامیابی سے ہمکنار ہوئیں اس سوسائٹی نے مغربی علوم اور مفید لٹریچر سے ملت اسلامیہ کو روشناس کرانے کی تاریخی خدمت انجام دی جس کے بغیر ہندوستانی مسلمان کوئی قابل قدر کارنامہ انجام دینے سے قاصر رہتے اور مغربی علوم کی وسیع دنیا سے یکسر ناواقف رہتے۔

## علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ

ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں گزٹ نے بہت اہم کردار ادا کیا اگر یہ کہا جائے کہ یہ گزٹ ہی تھا جس نے ہندوستانی مسلمانوں کو پرانی بوسیدہ دنیا کے تعصّبات سے نکال کر نئی روشنی میں لا کھڑا کیا اور نئی دنیا کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے کے قابل بنا دیا تو شاید یہ حقیقت سے زیادہ دور نہ ہو۔ گزٹ کا اجرا سائنٹفک سوسائٹی کی طرف سے سر سید نے ۱۸۶۶ء میں کیا۔ شروع میں یہ ہفتہ وار اخبار تھا بعد میں ہفتہ میں دو بار چھپنے لگا اس اخبار کا ایک کالم انگریزی میں اور دوسرا کالم اردو میں ہوتا تھا اسکا خاص مقصد گورنمنٹ اور انگریزوں کو ہندوستانیوں کے حالات، معاملات اور خیالات سے آگاہ کرنا اور ہندوستانیوں کو انگریزی

طرز حکومت سے آشنا کرنا اور ان میں پولیٹکل خیالات اور قابلیت و مذاق پیدا کرنا تھا۔

یہ اخبار مدرسۃ العلوم تحریک کا خاص آرگن تھا اس سلسلے میں جاری تمام کارروائیوں کا ذکر گزٹ میں تفصیل سے ملتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ روزمرہ پیش آنے والے واقعات اہم تقاریر اور خبریں شائع ہوتی تھیں۔ کانگریس کے قیام تک یہ گزٹ برابر تمام ہندوستانیوں کے اندر سیاسی بیداری اور اپنے حقوق کی جان کاری پیدا کرنے کا خاص ذریعہ تھا لیکن قیام کانگریس کے بعد خاص مسلمانوں کے اندر سیاسی بیاری پیدا کرنے کی اہم خدمت گزٹ نے انجام دی۔ ۱۸۸۵ء کے بعد گزٹ، سرسید اور ان کے ہمنواؤں کا سیاسی آرگن بن کر ابھرا جس نے ہندوستان کی سیاست پر دوررس نتائج مرتب کیے۔ کانگریس کے مطالبات حکومت اور مسلمان پر پوری طرح واضح کرنے میں گزٹ نے اہم رول ادا کیا کہ ان مطالبات کے مانے جانے پر حکمرانوں کو مسلمانوں کو اور خود ہندوؤں کو کیا کیا مشکلات پیش آسکتی تھیں اس کا واضح انداز میں بیان کرنا گزٹ کا خاص مشن تھا۔ اس کے علاوہ سرسید کے اسلامی انجمنوں کے نام مراسلے کے جواب میں (جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان پورے ملک میں جلسے منعقد کریں اور کانگریس کے مطالبات سے اپنی بیزاری کا اظہار کریں) منعقدہ جلسوں کی کارروائیاں بہت جلی الفاظ میں سرسید کے نوٹ کے ساتھ شائع ہوتی تھیں۔ ان جلسوں کی کاروائیوں کی اشاعت سے گزٹ کے ۱۸۸۸ء کے بعد کے شمارے بھرے پڑے ہیں۔ انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن جو بمقابلہ کانگریس کے سرسید نے قائم کی تھی اور خود اس کے آنریری سکریٹری قرار پائے تھے کی مہم بھی گزٹ کے ہی ذریعہ وقوع پذیر ہوئی۔ اس ایسوسی ایشن کے ختم ہونے کے بعد ۱۸۹۳ء میں سرسید کی محمڈن ڈیفنس ایسوی ایشن کے آرگن کی حیثیت سے گزٹ نے خدمت انجام دی۔ درحقیقت کانگریس کے بن جانے کے بعد گزٹ کے اکثر شماروں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ سرسید کو سب سے زیادہ فکر مسلمانوں کے سیاسی مستقبل کی تھی جو کانگریس کے قیام کی وجہ سے خطرے میں پڑ گیا تھا۔ سرسید کے ان احساسات کو عوام تک پہنچانے کا وسیلہ گزٹ ہی تھا۔ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کی پہلی میٹنگ جو سرسید کے گھر پر انہیں کی صدارت میں ہوئی اس کی تفصیل گزٹ نے بہت جلی الفاظ میں شائع کی۔ سرسید کے انتقال کے بعد گزٹ بند ہو کر جب دوبارہ محسن الملک کی



ادارت میں شائع ہونا شروع ہوا تو ایک بار پھر سرسید کی تحریک کو آگے بڑھاتے ہوئے محسن الملک نے مسلمانوں کو اپنا پیغام گزٹ ہی کے ذریعہ سنایا کہ اب سرسید نہیں رہے۔ اس وجہ سے اب زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں کا ایک سیاسی پلیٹ فارم ہونا چاہیے۔ ۱۹۰۱ء کے بعد کے گزٹ میں محسن الملک، وقار الملک اور دیگر معززین قوم کی تحریروں سے مسلمانوں کے سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت کا احساس قوم میں پیدا کرنے میں گزٹ کا بہت اہم رول رہا۔ ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے بعد گزٹ نے مسلمانوں کی اس تاریخی جماعت کا کامیاب بنانے میں بہت اہم رول ادا کیا کیونکہ محسن الملک لیگ کے عہدیدار ہونے کے ساتھ ساتھ گزٹ کے ایڈیٹر بھی تھے لہٰذا گزٹ نے اس جماعت کو آگے بڑھانے اور مسلمانوں میں مقبول عام کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔

○

(۱) حیات جاوید، ص:۱۲۲

# انگلستان کا سفر
# قوم کی حالت کیسے درست ہو

جس زمانے میں سرسید نے انگلستان کا سفر اختیار کیا مسلمان عام طور سے اور مذہبی علما خاص طور سے انگریزوں سے بے پناہ نفرت کرتے تھے اور کچھ تو ان کی صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اس تعصب اور نفرت نے انگریزوں کا تو کچھ نہ بگاڑا بلکہ خود مسلمان ہی بہت سی نئی حقیقتوں اور علوم سے ناواقف رہے جس کا سراسر نقصان خود مسلم قوم کو پہنچا۔ ایک بزرگ کا قول تھا کہ:

''کتا گرچہ میرے مذہب میں نجس ہے مگر وہ انگریز کی طرف منہ کر کے بھونکے تو میں اس کا منہ چوم لوں۔''

عطاءاللہ شاہ بخاری کہا کرتے تھے کہ:

''اگر میرا بس چلے تو میں انگریزوں کو مارنے کے لیے سوروں سے اتحاد کرلوں۔''۲

اور ایسے بہت سے بزرگ پائے جاتے تھے جو انگریز کو کہیں سے راستے میں دیکھ لیتے تو آنکھ بند کر لیتے تھے یا کسی انگریز سے اگر ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو جب تک رگڑ رگڑ کر دھو نہ لیتے اس وقت تک نجس خیال کرتے تھے۔ اس انتہا پسندانہ رویہ کی بہت ٹھوس وجوہات بھی موجود تھیں مثلاً یہ کہ مسلمانوں سے حکومت کا غصب کرنا اور انہیں کو ہر طرح سے ذلیل وخوار کرنا، یہ باتیں علماء کو زیادہ ناگوار تھیں مگر غصہ اکثر غلط راہ پر ڈال دیتا ہے اور بجائے اس کے کہ عزت حاصل ہو اور بے عزتی کی زندگی ہاتھ آتی ہے۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ معزز بزرگ اور علماء کرام ٹھنڈے دل سے حالات خراب ہونے کی وجوہات پر غور کرتے اور اصلی سبب بربادی کے تلاش کر کے ان کو دور کرنے کی کوشش کرتے مگر ہوا اس کا بالکل الٹا بجائے



مرض کی تشخیص اور صحیح علاج کے مرض کی ذمہ داری انگریزوں پر ڈال کر اپنے طور سے علماء نے اپنی ذمہ داری پوری کرلی اور اپنے کو مطمئن کر لیا نتیجتاً مرض اندر ہی اندر بڑھتا رہا۔ آج بھی ہمیں بجائے غصہ کرنے کے ٹھنڈے دل سے اپنے موجودہ مسائل کی وجوہات پر غور کرنا چاہیے نہ کہ صرف دوسروں کو مورد الزام ٹھہرا کر اپنے کو مطمئن کرلیں۔

سرسید نے غدر کے بعد جب نظر اٹھا کر چاروں طرف دیکھا تو:

''اسلام کی وہ صورت پائی کہ خدا کرے کافر بھی نہ پائے پوری قوم کیا دنیا کی باتوں میں کیا دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڑھے میں پڑھی تھی کہ ادھر ادھر کی چیزیں تو درکنار خود اس گڑھے کو بھی نہ دیکھ سکتی تھی جس میں وہ پڑی تھی۔''۳

معاشی بدحالی اور اخلاقی تنزلی کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ معاشی طور پر تباہ مسلمانوں کی اخلاقی حالت بھی بہت پست ہو چکی تھی۔ بقول حالی:

تغلب میں بدنیتی میں دغا میں — نمود اور بناوٹ فریب اور ریا میں
سعایت میں بہتان میں افترا میں — کسی بزم بیگامہ و آشنا میں
نہ پاؤ گے رسوا و بدنام ہم سے — بڑھے پھر کیوں نہ شان اسلام ہم سے

غریبی ایمان کی سب سے بڑی دشمن ہے انسان ہر طرح کا جرم کرنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ سرسید کے سامنے جو قوم کی حالت تھی وہ حالی کے اس قطعہ سے کافی نمایاں ہو جاتی ہے۔

فلاکت جسے کہئے ام الجرائم — نہیں رہتے ایمان پر دل جس سے قائم
بناتی ہے انسان کو جو بہائم — مصلّٰی ہیں دل جمع جس سے نہ صائم
وہ یوں اہل اسلام پر چھا رہی ہے
کہ مسلم کی گویا نشانی یہی ہے

بدترین دور غلامی، اخلاقی ومعاشی پسماندگی سے مسلمانوں کو نکالنے کے لیے سرسید نے دو باتوں کو ان کی آئندہ بہبودی کے لیے انتہائی ضروری سمجھا۔ اول یہ کہ مسلمانوں میں مغربی علوم جاری کیے جائیں اور انگریزوں سے زمانہ سے چلی آ رہی نفرت اور بغض وعناد کا خاتمہ کر کے مسلمانوں اور انگریزوں میں قریبی میل جول پیدا کیا جائے۔ ان دونوں کاموں کو کرنے

کے لیے سرسید نے انگلینڈ جانے کو ضروری خیال کیا تاکہ وہ خود وہاں جاری طریقۂ تعلیم کا مشاہدہ کر سکیں اور جہاں تک ممکن ہو مسلمانوں کے لیے یہاں جاری کریں۔ اس کے علاوہ سب سے اہم کام جو ان کے عشق رسولؐ اور حمیت اسلامی کی غمازی کرتا ہے۔ انگریز آفیسر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد کا جواب دینا تھا۔ جس میں مصنف نے آنحضرتؐ کی شان میں گستاخیاں کی تھیں اور سیرت نبی کو توڑ موڑ کر پیش کیا تھا اس کتاب کا جواب دینے کے لیے جن کتابوں کی ضرورت تھی وہ صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کی لائبریری میں مل سکتی تھیں۔

اس وقت ولایت جانا آسان نہ تھا مگر سرسید نے اپنا تمام مال واسباب حتیٰ کہ کوٹھی تک رہن رکھ کر قرض لے کر سفر کی تیاری شروع کر دی۔ محسن الملک لکھتے ہیں:

> ''جب سید احمد لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا تھا۔ انھوں نے اپنے کتب خانے کو بیچا گھر اور کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی انھوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں ذکر کیا تھا کہ میرا مقصد پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذات خود اصول وطرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔''[۴]

## ہماری قوم ایسی کیوں نہیں

سرسید اپریل ۱۸۶۹ء میں بنارس سے ولایت کو روانہ ہوئے ان کے ساتھ ان کے دونوں بیٹے سید حامد اور سید محمود اور ایک نوکر تھا۔ راستہ میں ان کی ملاقات مختلف نسلوں اور قوموں کے لوگوں سے ہوئی ہر جگہ انہیں اپنی قوم اور ملک یاد آیا۔ وہ جہاں بھی گئے قوم کا غم ان کے ساتھ گیا اور اسی غرض سے دور دراز کا سفر اختیار کیا۔

> ''میں نے صرف اس خیال سے کہ کیا راہ ہے جس سے قومی حالت درست ہو دور دراز کا سفر اختیار کیا اور بہت کچھ دیکھا جو دیکھنے کے لائق تھا میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ جب میں نے کوئی عمدہ چیز دیکھی جب کبھی عالموں اور مہذب آدمیوں کو دیکھا جب کبھی علمی مجلسیں دیکھیں جہاں کہیں عمدہ مکانات دیکھے جب کبھی عمدہ پھول دیکھے جب کبھی کھیل کود عیش و آرام کے جلسے دیکھے یہاں تک کہ



> جب کبھی کسی خوبصورت آدمی کو دیکھا مجھ کو ہمیشہ اپنا ملک اور اپنی قوم یاد آئی اور نہایت رنج ہوا کہ ہائے ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔''

ان کے اصل مقاصد میں ایک بڑا مقصد انگلستان کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس غرض سے کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹیوں کو خود جا کر دیکھا اور بڑی چھوٹی تمام چیزیں جو یونیورسٹی سے تعلق رکھتی تھیں اپنے ذہن نشین کر لیں۔ یورپ کا طرز معاشرت وہاں کی تہذیب وشائستگی وہاں کی صنعت وحرفت ہر چیز پر نظر کی۔ وہاں عمومی علمی شوق وجستجو کے جذبے کو دیکھ کر سرسید پر بڑا اثر ہوا۔ انگلستان کی ترقی نے انکو اور زیادہ فکرمند بنا دیا کہ ہماری قوم ایسی کیوں نہیں۔ آج یہ تمام باتیں عام سی نظر آتی ہیں کیونکہ ہماری یہ نسل اپنی آنکھوں سے ہر طرح کی علمی وسائنسی ترقی دیکھ رہی ہے جگہ جگہ یونیورسٹیاں قائم ہیں اور تعلیم عام ہو چکی ہے مگر اس زمانے میں جب کہ جہالت کا گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا ہوا تھا لوگ جہالت کو ہی علم سمجھتے تھے یورپ جانا ایک معجزانہ واقعہ تھا۔ سرسید کا انگلستان سے ترقی کا طریقہ بذات خود سیکھ کر آنا بلاشبہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کا وہاں جانا سیر تفریح کی غرض سے نہ تھا بلکہ اپنی قوم کی ترقی کی راہیں تلاش کرنے کے لیے تھا کہ بقول حالی:

> ''سید احمد خاں انگلستان گئے مگر اس مطلب سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوام روئے زمین پر شرف رکھتی ہے انھیں کے گھروں میں انہیں کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ دیکھا واپس آ کر اپنی قوم میں پھیلایا لوگ ولایت جا کر تماشہ گاہ تھیٹر پارک میوزیم اور عمارات کی سیر کرتے ہیں اور یہ حامئ دین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا خطبات احمدیہ کی تصنیف میں منہمک تھا۔ اور کالجوں و یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا جانا قوم کے واسطے تھا رہنا قوم کے واسطے اور واپس آنا قوم کے واسطے تھا۔''[۵]

انگریز قوم کی ترقی کو دیکھ کر انہیں اپنی قوم کی تنزلی کا اور بھی شدید احساس ہوا۔ ایک مکتوب میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''ہماری قسمت میں جلنا لکھا ہے یہاں کا حال دیکھ کر اپنے ملک وقوم کی حماقت، بیجا تعصب، موجودہ تنزل اور آئندہ ذلت کے خیال سے رنج وغم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کو ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔''[۶]

○

**حواشی:**

(۱) نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ص:۵۱

(۲) ایضاً، ص:۵۱

(۳) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص:۵۷۰

(۴) بحوالہ حیات جاوید، ص:۱۴۸

(۵) حیات جاوید، ص:۱۵۹

(۶) بحوالہ حیات جاوید، ص:۱۵۷

# انگلستان کی حالت بھی خراب رہی ہے

قیام انگلستان کے دوران انہیں ایک اہم انکشاف سے دوچار ہونا پڑا کہ جو حالت آج ہندوستان کی ہے وہی حالت کبھی ولایت کی بھی رہ چکی ہے اور ان حالات کو سدھارنے کے لیے لندن کے عظیم مصلحین ایڈیسن اور اسٹیل نے رسائل ٹیٹلر واسپیکٹیٹر جاری کیے تھے تا کہ:

''انسان کی زندگی جو جھوٹی بناوٹوں سے عیب دار ہوتی ہے اسے بے عیب کریں اور مکاری اور جھوٹی شیخی کو مٹا دیں اور بناوٹی پوشاک اتار دیں اور اپنی قوم کی پوشاک اور گفتگو اور برتاؤ میں عام سادہ پن پیدا کریں۔''

سرسید لکھتے ہیں کہ:

''ان پرچوں کے جاری ہونے سے انگریزوں کے اخلاق و عادات اور دینداری کو نہایت فائدہ پہنچا اور ہر ایک کے دل پر ان کا اثر ہوا جس زمانے میں پہلے پہل ٹیٹلر نکلا ہے انگلستان کے لوگوں کی جہالت اور بداخلاقی اور ناشائستگی نفرت کے قابل تھی۔ وضع دار لوگ کیا مرد کیا عورت تحصیل علم سے نفرت کرتے تھے اور علم پڑھنے کو خود فروشی و بادفروشی کہتے تھے اور کمینوں کا کام سمجھتے تھے۔ جہالت کی شرم کسی کو نہ تھی عورت کا پڑھا لکھا ہونا اس کی بدنامی کا باعث ہوتا تھا عورتیں آپس میں بدگوئی کیا کرتی تھیں خلاف تہذیب باتیں کرنا گویا ایک بڑی وضعداری گنی جاتی تھی...... اسپکٹیٹر میں ایک دفعہ لکھا تھا کہ میں اخلاق میں خوش طبعی کی جان ڈالوں گا اور خوش طبعی کو اخلاق سے ملاؤں گا تا کہ جہاں تک ممکن ہو اس کے پڑھنے والے دونوں باتوں میں نصیحت پاویں اور تاوقتیکہ لوگ ان تمام خرابیوں سے جن میں اس زمانے کے لوگ پڑے ہیں سنبھل جاویں ہر روز ان کو نصیحت کی باتیں یاد دلاتا رہوں گا کیوں کہ جو دل ایک دن بھی بیکار پڑا رہتا ہے اس میں بے شمار عیب



جڑ پکڑ جاتے ہیں جن کے ریشے بہت مشکل سے دور ہوتے ہیں۔ سقراط کی نسبت ایسا کہا گیا ہے کہ اس نے فلسفے کو آسمان سے اتارا اور انسانوں میں بسایا مگر میں اپنی نسبت صرف اتنا ہی کہلانا چاہتا ہوں کہ میں نے فلسفے کو مدرسوں اور مکتبوں کے کتب خانوں کی کوٹھریوں سے نکالا جلسوں اور چائے خانوں وقہوہ خانوں تک پھیلایا اور ہر ایک دل میں بسایا۔''[1]

## تہذیب الاخلاق: آغاز انقلاب

مسلمانوں کی اخلاقی حالت بھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی کہ دور تاریکی میں انگلستان کی تھی۔ کوئی اخلاقی برائی ایسی نہ تھی کہ مسلمانوں میں نہ ہو۔ ان تمام برائیوں کو دور کرنے کے لیے اور مسلمانوں میں نئی تعلیم اور سائنس کا رجحان پیدا کرنے کے لیے سرسید نے انگلینڈ سے واپسی پر تہذیب الاخلاق جاری کیا۔ جس وقت یہ پرچہ جاری ہوا اس وقت مسلمانوں پر دو مختلف کیفیتیں طاری تھیں۔ غدر کے حادثات نے ان میں ایک طرف مذہبی جوش وخروش نہایت زوروں پر پیدا کر دیا تھا دوسری طرف ایک طبقہ مسلمانوں میں ایسا بھی تھا جو اپنی قوم کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو انتہائی مایوسی اور افسردگی سے دیکھ رہا تھا اور ان کی امید بندھنے کی کوئی آس نظر نہ آتی تھی۔ پہلے طبقے کے لیے تہذیب الاخلاق کے مضامین بارود میں آگ لگانے کے مترادف تھے۔ وہاں ایڈیسن اور اسٹیل نے مذہبی معاملات میں دخل دینے سے احتراز کیا تھا اور اس میں وہ کامیاب رہے تھے لیکن یہاں معاملہ مختلف تھا یہاں یہ حال تھا کہ جب کسی کام کو کرنے کو کہا جاتا تھا تو یہ عذر پیش کیا جاتا کہ مذہباً ممنوع ہے اور اگر کسی کام سے باز رہنے کی تاکید کی جاتی تو فوراً جواب ملتا کہ ثواب ہے۔ چنانچہ مجبور ہو کر سرسید کو کہنا پڑا کہ جس چیز کو تم مذہب سمجھ رہے ہو وہ مذہب نہیں ہے بلکہ تمہاری اختراعات ہیں۔ یہی وہ باتیں تھیں کہ مسلمان علماء کا طبقہ انتہائی برانگیختہ ہو گیا۔ انہیں کافر مرتد، ملحد، زندیق اسلام کا دشمن مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو اور کیا کیا نہ کہا گیا۔ کئی بار مایوسیوں نے گھیرا مگر ہر بار اللہ پر بھروسہ کر کے محنت اور جدوجہد شروع کی۔ انھوں نے ایک بار اپنے بارے میں لکھا کہ:

''وہ قوم کی بھلائی کا پیاسا اپنی قوم کی بھلائی کی فکر کرتا ہے دن رات اپنے دل کو جلاتا ہے۔ ہر وقت بھلائی کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے ان کی

تلاش میں دور دراز کا سفر اختیار کرتا ہے۔ یگانوں بیگانوں سے ملتا ہے۔ ہر ایک کی بول چال میں اپنا مطلب ڈھونڈتا ہے مشکل کے وقت ایک بڑی مایوسی سے مدد مانگتا ہے۔ جن کی بھلائی چاہتا ہے انہیں کو اپنا دشمن پاتا ہے شہری وحشی بتاتے ہیں دوست آشنا دیوانہ کہتے ہیں۔ عالم فاضل کفر کے فتووں کا ڈر دکھاتے ہیں بھائی بند عزیز و اقارب سمجھاتے ہیں اور پھر یہ شعر پڑھ کر خاموش ہو جاتے ہیں۔

وہ بھلا کس کی بات مانے ہیں
بھائی سید تو کچھ دیوانے ہیں ۲

بعینہ یہی حالت آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی مسلمانوں کی ہے۔ مسلمانوں کی ہمدردی کرنے والے لوگ سماج میں تنہا رہ جاتے ہیں اور ابن الوقت اور تن آسان لوگ ان کا مذاق اڑاتے ہیں کہ یہ چلے ہیں قومی خدمت کرنے۔ قومی خدمت کا جذبہ عام خودغرضی کے ماحول میں مذاق کا موضوع بن گیا ہے۔ سیاسی اصلاح کرنے والوں کو تو خاص طور سے ہدف ملامت بنایا جاتا ہے۔ تہذیب الاخلاق کے نکلتے ہی چاروں طرف سے مخالفت کا شور اٹھا۔ ایک طبقہ ایسا بھی پیدا ہو گیا جو کہ سرسید کے خیالات سے اتفاق رکھتا تھا، مخالفتوں کی وجہ سے ایک غلط نتیجہ یہ نکلا کہ جو لوگ مذہباً سرسید کی مخالفت کرنا ضروری خیال کرتے تھے انھوں نے دین اسلام کی حمایت سمجھ کر دینی تعلیم کے مدارس جگہ جگہ کھول دیے۔

''جوں جوں تہذیب الاخلاق مدرسۃ العلوم کی طرف بلاتا تھا اور جس قدر انگریزی تعلیم کی ضرورتیں ان کے ذہن نشین کراتا تھا اسی قدر مدارس اسلامیہ قائم کرنے کا جوش مسلمانوں میں بڑھتا جاتا تھا چنانچہ اسی کی تحریک سے بے شمار اسلامی مدارس ہندوستان میں قائم ہو گئے۔''۳

تہذیب الاخلاق کی تعلیم نے سنی اور شیعہ دونوں فرقوں کو جگایا۔ سرسید کی تعلیم کے ردعمل میں مسلمانوں کو دینی تعلیم کا خیال اور جوش جیسا اس زمانہ میں پیدا ہوا اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔ بقول سرسید:

''سب سے اخیر مدرسہ جو ہماری تحریروں کے اثر سے قائم ہوا وہ



مدرسہ ایمانیہ لکھنؤ ہے جس میں بشمول دیگر علوم...... کے مذہب شیعہ اثنا عشریہ کی بھی تعلیم ہوتی ہے اور اس سے خیال ہوتا ہے کہ ہماری کوششوں نے شیعہ اور سنی دونوں کے دلوں کو جگایا ہے۔''۴

تہذیب الاخلاق کے پیغام کی مخالفت کے سبب اس کے حامیوں میں بھی اس کی تحریک کی زیادہ حمایت کرنے کا جوش پیدا ہوا۔ لہٰذا اس پرچہ کی مخالفت اور مدافعت دونوں نے قوم کے حق میں اچھے نتائج پیدا کیے۔ اس کے ایک اچھے نتیجہ میں ندوۃ العلما کا قیام بھی ہے حالانکہ فی زمانہ دینی تعلیم اور سائنسی تعلیم کے الگ الگ اداروں کا ہونا ملت کے لیے فائدہ مند ہونے سے زیادہ نقصان دہ ہے لیکن اس زمانہ میں جبکہ دینی تعلیم کی طرف بھی لوگوں کا خیال نہ تھا ندوۃ العلماء کا قیام دینی تعلیم کے لیے نیک کام تصور کیا گیا۔

''اگر غور سے دیکھا جائے تو خود ندوۃ العلما کا وجود اسی نتیجہ کی ایک شان ہے جس کے لیے تہذیب الاخلاق جاری کیا گیا تھا وہی کانپور جو تہذیب الاخلاق اور سرسید کی مخالفت کا سب سے بڑا مرکز تھا اور جہاں سے تہذیب الاخلاق کے برخلاف نور الانوار، نور الآفاق اور امداد الآفاق اور کیا کیا رسائل مدت دراز تک شائع ہوتے رہے۔ وہیں سے علماء کی یہ جماعت اس غرض سے اٹھی ہے کہ مسلمانوں کی قدیم طرز تعلیم زمانہ حال کی طرز تعلیم کے سانچے میں ڈھالی جائے اور اسی لیے اکثر علماء اس سے بدگمان ہو گئے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ یہ مجلس سید احمد خاں کے اشارے پر قائم ہوئی ہے۔''۵

بہت سے علماء کو یہ شک گزرا کہ کیونکہ یہ زمانۂ حال کی طرز سے دینی تعلیم دینا چاہتے ہیں لہٰذا سرسید کے کہنے سے ہی یہ مجلس بھی قائم ہوئی ہے اس لیے وہ اس کے خلاف ہو گئے حالانکہ ان علماء کی حالت بھی بشمول علامہ شبلی نعمانی کے جو دینی تعلیم کو نئے طرز سے پڑھانا چاہتے تھے۔ بقول ایک پروفیسر کے ایسی ہے کہ:

''جیسے کسی محفل میں آپ اپنے مخالفین کا مزاج دریافت کریں اور انہیں یہ محسوس کرا دیا جائے کہ ان پر احسان کیا گیا ہے۔ پرانی زندگی

شبلی کے لیے صداقت ہے وہ نئے میلانات کی طرف متوجہ ہوتے
ہیں لیکن انہیں پھر کسی گوشہ میں شمس تبریز کی عبا نظر آتی ہے اور وہ نئی
دنیا پر عاجزانہ طنز کے ساتھ مسکرا کر اسے پہن لیتے ہیں۔''[۶]

بانیین ندوہ کی یہ معمولی سی ترقی پسندی اور نئے علوم کی طرف رغبت بھی علماء سے برداشت نہ ہو سکی۔ دینی مدارس کا نقطۂ نظر تو صاف ہے وہ نئی بصیرت کے قائل ہی نہیں قطع نظر اس بات کے کہ اس کے ضمیر میں خود سقراط اور بطلیوس کا خون ہے۔ یہ اس زمانے کے علماء کی حقیقت پسندی اور وسیع النظری تھی اور یہ آج کے علماء کی تنگ نظری اور حقیقت ناشناسی ہے۔ سقراط بھی یورپ کے تھے اور آج کا نیا علم بھی یورپ میں پلا بڑھا۔

تہذیب الاخلاق نے تعصّبات کو بہت کم کر دیا تقلید کی بندشیں ڈھیلی کر دیں اور مسلمانوں کو عقل کا استعمال کرنے کی دعوت دی۔ توکل قناعت اور تقدیر وغیرہ کے جو غلط معنی مسلمان سمجھتے تھے اور جس غلط فہمی نے ان کو نکما کاہل اور جمادات کی طرح بے حس و حرکت بنا دیا تھا اس سے ان کو مطلع کیا۔ نہ صرف مطلع کیا بلکہ ہزار ہا مسلمانوں کے خیالات بدل دیے اور تدبیر و کوششوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ تقدیر کا مروجہ عقیدہ آج بھی محبوب و مقبول ہے۔ حالی نے بھی اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے۔

کبھی کہتے ہیں سعی و کوشش سے حاصل　　کہ مقسوم بن کوششیں سب ہیں باطل
نہیں ہوتی کوشش سے تقدیر زائل　　برابر ہیں یاں محنتی اور کاہل
ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روٹی نکموں کو ہرگز نہ ملتی
نکموں کے ہیں یہ سب دلکش ترانے　　سلانے کو قسمت کے رنگین فسانے
اسی طرح کے کر کے حیلے بہانے　　نہیں چاہتے دست و بازو ہلانے
وہ بھولے ہوئے ہیں یہ عادت خدا کی
کہ حرکت میں ہوتی ہے برکت خدا کی

تہذیب الاخلاق نے چند ہی سال کے عرصہ میں بہت شہرت حاصل کر لی۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ اس پرچہ میں استعمال کی گئی زبان کا نیا اور سلیس انداز تھا جس کے ذریعہ



ہر طرح کے مضامین اردو میں ادا کیے جانے لگے۔ اس کے علاوہ اسلام کی روشن تصویر تہذیب الاخلاق نے پیش کی کہ انگریزوں تک کو اس کا اعتراف کرنا پڑا۔ سرسید کے ایک انگریز دوست نے لکھا کہ:

''تہذیب الاخلاق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اردو زبان میں بھی ہر قسم کے
مضامین اور خیالات عمدگی اور سادگی سے ادا ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ثابت کیا کہ
مذہب اسلام ایسا تنگ و تاریک نہیں ہے جیسا کہ اب تک سمجھا جاتا رہا ہے۔''[۷]

قصہ مختصر یہ کہ سرسید نے شدید مخالفتوں کے باوجود تہذیب الاخلاق کے ذریعہ سوتوں کو جھنجھوڑنے کا کام اس وقت تک جاری رکھا جب تک قوم میں بیداری کے آثار نہ پیدا ہو گئے۔ یہ اسی پرچہ کا کارنامہ تھا کہ مسلمان قومی ہمدردی قومی خیر خواہی قومی ترقی جیسے الفاظ سے آشنا ہوئے۔ ان میں اپنی مدد آپ کر کے ترقی کرنے کا سلیقہ پیدا ہوا اور ایک ہزیمت زدہ قوم نے پھر سے عزت و وقار حاصل کرنے کے لیے نئے طریقے سے کوششیں کرنے کا حوصلہ اور راستہ پایا۔ مسلمان جدید علوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان میں اجتماعی قوت کا احساس پھر سے پیدا ہونے لگا جو ماضی کی پے در پے شکستوں کے سبب ان کے اندر سے ختم ہوتا جاتا رہا تھا۔ اس کے علاوہ مسلمانوں نے اپنے ادب اور شاعری کا تنقیدی نظر سے جائزہ لینا شروع کیا اور اس کی ترقی اور افادیت بڑھانے پر کمر بستہ ہوئے۔ مذہبی امور، غیر مذہبی وغیرہ مفید رسم و رواج میں تمیز کرنا بھی تہذیب الاخلاق نے ہی سکھایا۔

○

**حواشی:**

(۱) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص:۴۴
(۲) مضامین تہذیب الاخلاق، امید کی خوشی، ص:۱۱
(۳) حیات جاوید، ص:۳۴۹　　(۴) بحوالہ حیات جاوید، ص:۳۵۰
(۵) حیات جاوید، ص:۳۵۰
(۶) علی گڑھ میگزین، انتخاب نمبر ۷۶-۱۹۷۵ء، ص:۱۹۲
(۷) بحوالہ حیات جاوید، ص:۳۵۲

# مدرسۃ العلوم کا قیام

انتھک جدوجہد اور کوششوں کے بعد بالآخر ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم مسلمانان ہند کا افتتاح عمل میں آیا۔ یہ ایک بیج تھا جو ہندوستان کی سنگلاخ زمین میں کچھ انگریزوں اور خود مسلمانوں کی مخالفت کے باوجود سرسید کے مبارک ہاتھوں سے بویا گیا۔ جس کی آبیاری سرسید اور ان کے ہمنواؤں نے اپنے خون پسینہ سے کی۔ بادصرصر اور شدید مخالفتوں کے باوجود یہ مدرسہ ترقی کے مراحل طے کرتا گیا۔ دشمن زیادہ تھے اور دوست اور ہمنوا کم لہٰذا سرسید نے پنشن لی اور مستقل علی گڑھ میں سکونت اختیار کر لی کہ اب دور رہ کر اس نازک پودھے کی حفاظت و پرورش ممکن نہ تھی۔ پورے ۲۳ سال سرسید نے مسلسل جدوجہد اور دن رات محنت کر کے یگانوں بیگانوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر قوم کے لیے ایک بے مثال ادارے کی بنیاد ڈالی اور اس کو مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا۔ ایک ایسی ٹیم تیار کی جو ان کی طرح بے مثال قربانی دینے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتی تھی۔ یہ بلاشبہ تاریخ کا نادر کارنامہ ہے کہ سرسید اپنے انتقال کے وقت ایسے لوگوں کا ایک مجمع چھوڑ گئے جن کو سرسید کی ہی طرح ان کا مشن عزیز تھا، جس کی تکمیل ان حضرات نے پیش رو کی طرح اپنا سب کچھ قربان کر کے کی۔

۱۸۷۷ء میں یہ مدرسہ کالج میں تبدیل ہو گیا۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا افتتاح لارڈ لٹن وائسرائے و گورنر جنرل ہند کے ہاتھوں ہوا۔ سید محمود نے جو سپاسنامہ وائسرائے کی خدمت میں پیش کیا اس میں لکھا تھا کہ یہ صرف ایک کالج کی بنیاد نہیں ہے بلکہ اس کالج کو ایک مکمل یونیورسٹی مثل آکسفورڈ کے بنانا مقصود ہے۔ ۱۸۷۳ء میں بھی جو اسکیم سید محمود نے کمیٹی خواستگاران ترقی تعلیم مسلمانان ہند کے سامنے پیش کی تھی اس میں انھوں نے اس بات کی تصریح کی تھی کہ ہماری غرض صرف ایک مدرسہ یا کالج قائم کرنا نہیں ہے۔ بلکہ ایک



یونیورسٹی قائم کرنا ہے۔ مقصد نیک تھا اور کام کرنے والے مخلص لہٰذا خدا نے برکت عطا فرمائی اور ۱۹۲۰ء میں یہ کالج یونیورسٹی بن گیا۔

## چندے کی فراہمی

مدرسۃ العلوم کے لیے سب سے زیادہ مشکل کام چندے کا وصول کرنا تھا۔ مسلمان اول تو پہلے ہی سے انگریزی تعلیم اور سائنس سے نفرت کرتے تھے دوسرے جس وقت مدرسہ کی تحریک شروع ہوئی اسی کے ساتھ تہذیب الاخلاق جاری ہوا جس کے مضامین سے اکثر دینی علماء اور نتیجتاً مسلمان نفرت کرتے تھے اور مدرسہ میں چندہ دینا گناہ تصور کرتے تھے۔ اخباروں اور رسائل میں مدرسہ کے خلاف بے شمار مضامین چھپتے تھے۔ سرسید کے کفر پر فتوے شائع کیے جاتے تھے۔ مولوی وعظ کی محفلوں اور مسجدوں کے منبروں پر سے لوگوں کو چندہ دینے سے روکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ مدرسہ اسلام میں فساد پھیلانے کے لیے قائم کیا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ اس وقت تک مسلمان قومی کاموں میں چندہ دینے کے مفہوم سے ناواقف تھے۔ چہ جائیکہ لاکھوں روپے چندے کے ذریعہ جمع کرنے کا ارادہ کیا جائے جس کا پورا ہونا امر محال تھا۔ اکثر لوگوں کا خیال تھا کہ اتنا پیسہ سیکڑوں سال تک بھی جمع نہیں ہو سکتا۔ مولوی علی بخش خاں سرسید کو لکھتے ہیں:

> ''جب مدرسۃ العلوم کا قائم ہونا سو دو سو برس تک نظر نہیں آتا اور ایک امید موہوم ہے اور تھوڑے سرمایے سے اگر کوئی مدرسہ قائم ہوا تو کیا نہ ہوا تو کیا پھر وقف کرنا روپیہ کا فضول ہے، وہی روپیہ کسی دوسرے کار خیر میں صرف ہو سکتا ہے...... حکایت ایک شخص سر بازار کہہ رہا تھا کہ قیامت کے وعدہ پر لاکھ روپیہ مانگتا ہوں کوئی نہیں دیتا۔ ایک ظریف سن کر بولے کہ وعدہ نہایت قریب کا ہے اور روپیہ بھی بہت تھوڑا ہے اور زبان مبارک بھی ماشاءاللہ بہت شیریں ہے اب روپیہ مل جانے میں کیا شک ہے۔''[1]

اکثر لوگ اتنے پیسہ کا جمع ہونا ناممکنات میں سے سمجھتے تھے۔ مگر سرسید کی جانفشانی

محنت سے لاکھوں روپیہ کی عمارتیں بن کر تیار ہوگئیں اور ہزاروں روپیہ ماہوارا کی آمدنی کا ذریعہ پیدا ہوگیا۔ سات آٹھ لاکھ روپیہ کی مالیت کی عمارت تیار ہوگئی اور مدرسہ کی آمدنی اس حد تک پہنچ گئی کہ اسی ہزار روپیہ سال اس میں خرچ ہونے لگا۔ سرسید کی طرف سے اس بات کا اطمینان کہ جس کام کے لیے روپیہ دیا جاتا ہے وہ اسی میں صرف ہوگا سب سے زیادہ چندے کی فراہمی کا سبب بنا۔ پھر بھی جو مشکلات اور پریشانیاں سرسید نے چندہ جمع کرنے کے لیے برداشت کیں ان کی تفصیل ایک کہانی یا افسانہ معلوم ہوتی ہے کہ کوئی شخص صرف قومی بھلائی اور دوسروں کی ترقی کی خاطر کس طرح اتنی تکلیفیں برداشت کرسکتا ہے اور خاص طور سے اس زمانہ میں یقین کرنا مشکل ہے جب کہ ہر آدمی قومی بھلائی کے نام پر صرف اپنا بھلا کرنا چاہتا ہے اور ڈھونڈنے سے بھی مخلص حضرات نظر نہیں آتے۔ سرسید نے اپنے سماجی مقام و مرتبہ تک کی پروانہ کی اور نمائش میں دوکان لگانے سے لے کر اسٹیج پر ایکٹنگ کرنے تک ہر کام روپیہ کی فراہمی کا قوم کے لیے کیا۔

"کون ہے جو آج مجھے اسٹیج پر دیکھ کر حیران ہوتا ہوگا؟ وہی جس کے دل میں قوم کا درد نہیں وہی جسکا دل جھوٹی شیخی سے بھرا ہوا ہے۔ آہ اس قوم پر جو شرمناک باتوں کو اپنی شیخی اور افتخار کا باعث سمجھیں اور جو کام قوم اور انسانوں کی بھلائی کے لیے نیک نیتی سے کیے جائیں ان کو بے عزتی کا کام سمجھیں آہ اس پر جو اپنی قوم کو ذلت اور نکبت کے سمندر میں ڈوبتا دیکھے اور خود کنارے پر بیٹھا ہنستا رہے۔

اے رئیسو اور اے دولت مندو! تم اپنی دولت وحشمت پر مغرور ہو کر یہ مت سمجھو کہ قوم کی بری حالت ہوا کرے ہمارے بچوں کے لیے سب کچھ ہے۔ یہی ان لوگوں کا خیال تھا جو تم سے پہلے تھے؟ مگر انہیں کے بچوں کی وہ نوبت ہے جس کے لیے ہم آج اسٹیج پر کھڑے ہیں۔

اے صاحبو! ہر کوئی تسلیم کرتا ہے کہ تعلیم نہ ہونے سے قوم کا حال روز بروز خراب ہوتا جاتا ہے قوم کے بچے اخراجات تعلیم کے سرانجام نہ ہو۔ برباد ہوتے جاتے ہیں۔ میں نے کوئی پہلو ایسا نہیں چھوڑا



جس سے قوم کے غریب بچوں کے اخراجات تعلیم میں مدد پہنچے مگر افسوس کامیابی نہیں ہوئی خود لوگوں سے بھیک مانگی مگر قلیل ملی......

پس میں اسٹیج پر اس لیے آیا ہوں کہ قوم کے بچوں کی تعلیم کے لیے کچھ کرسکوں۔"

شبلی نے یہ منظر دیکھ کر قوم سے یوں خطاب کیا:

دوستوں کیا تمہیں سچ مچ تھا تھیٹر کا یقیں
کیا یہ سمجھے تھے کہ پردہ کوئی ہوگا رنگیں
نظر آئے گی سوئی ہوئی ایک زہرہ جبیں
آئے گا پھول کے لینے کو ارم کا گلچیں
قوم کی بزم کو یوں کھیل تماشا سمجھے
ہائے گر آپ یہ سمجھے تو بے جا سمجھے
نوحۂ غم ہے یہاں نغمۂ عشرت کیسا
ہے یہ حسرت کا سماں جوش مسرت کیسا
ہے عجب سیر اگر دیدۂ بینا دیکھے
دیکھا ہو جسے عبرت کا تماشہ دیکھے

مسلمانان ہند سرسید کی عظمت کا پورا پورا اندازہ آج تک نہ لگا سکے اور ہم سمجھتے ہیں کہ ان کی عظمت قید الفاظ میں نہیں آسکتی وہ الفاظ کی بندشوں سے آزاد ہے لیکن جو لوگ ذرا بھی کوششیں ان کے مشن کو آگے بڑھانے کی کر رہے ہیں بس یہی ان کا سرسید کے لیے خراج عقیدت اور احسان مندی کے جذبات کا اظہار ہے جو سرسید نے ہم پر ہماری گزری ہوئی اور آئندہ آنے والی نسلوں پر کیا۔ کفر کے فتوؤں سے ڈرایا گیا، نیچری، دہریہ اور کیا کیا نہ ان کو کہا گیا حتیٰ کہ مکہ و مدینہ تک سے ان کے واجب قتل ہونے تک کے فتوے لائے گئے۔ ایک بار ان فتوؤں سے تنگ آکر لاہور میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"فرض کرو میں بدعقیدہ ہوں مگر اے بزرگان پنجاب میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر ایک کافر مرتد آپ کی قوم کی بھلائی پر کوشش کرے

تو کیا آپ اس کو اپنا خادم نہ سمجھیں گے؟ آپ کی دولت سرا بنانے میں جس میں آپ آرام فرماتے ہیں آپ کے بچے پرورش پاتے ہیں آپ کے لیے مسجد بنانے میں جس میں آپ خدا کا نام لیتے ہیں چوہڑے چمار قلی کافر بت پرست بدعقیدہ سب مزدوری کرتے ہیں مگر نہ کبھی آپ اس دولت خانے کے دشمن ہوتے ہیں اور نہ کبھی اس مسجد کو منہدم کرنے پر آمادہ ہوتے ہیں پس آپ مجھ کو بھی اس مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے میں ایک قلی چمار کی مانند تصور کیجئے اور میری محنت اور مشقت سے اپنے لیے گھر بننے دیجئے اور اس وجہ سے کہ اس کا بنانے والا یا اس میں مزدوری کرنے والا ایک قلی چمار ہے اپنے گھر کو مت ڈھایئے کیا آپ مجھ بدبخت نامۂ سیاہ کی شامت اعمال سے اپنی قوم کو اور ان کی اولاد کو نسلاً بعد نسلاً ڈبونا اور خراب وخستہ حال میں ڈالنا چاہتے ہیں؟ برائے خدا اپنی قوم کی اپنی اولاد کی بھلائی اور بہتری کی فکر کرو۔'' [39]

کیسی بے بسی کا عالم ہوگا اور مخالفت کتنی شدید ہوگی کہ سرسید کو اپنے تئیں قلی چمار سے تشبیہ دینی پڑی۔ وہ وقت ضرور ایسا ہی تھا باطل اور گمراہ طاقتیں پورے شباب پر تھیں مگر آج حقیقت روز روشن کی طرح سارے زمانے پر عیاں ہے۔ سرسید کی ذات سے فیض یاب ہونے والے دنیا کے گوشہ گوشہ میں مل جائیں گے۔ لندن اور امریکہ کی بہترین یونیورسٹیوں میں اس مرتد بدعقیدہ کے فیض سے پیدا ہوئے مسلمان سائنٹسٹ اور ایجوکیشنسٹ ملت اسلامیہ کا نام روشن کررہے ہیں اور غلط مخالفتیں کبھی کی ختم ہوچکیں مخالفین کا نام تک لینے والا کوئی نہیں ہر گھر میں سرسید کی بے مثل قربانی کا چرچا ہے ہر محفل میں ان کے گیت گائے جاتے ہیں۔

سرسید ہر چندہ جمع کرنے سے پہلے اس میں اپنا حصہ ڈالتے تھے حتیٰ کہ اپنے بیٹے کی شادی میں ولیمہ تک اسی لیے نہیں کیا اور وہ پیسہ جو ولیمہ میں خرچ ہوتا کالج فنڈ میں جمع کردیا۔ آج ہم لاکھوں روپیہ صرف اپنی شان دکھانے کے لیے بے وجہ خرچ کردیتے ہیں



اور قومی کاموں میں خرچ کرنا ضروری نہیں سمجھتے حالانکہ اصلی فائدہ مند خرچ وہی ہے جو ایمانداری سے صحیح طریقہ سے قومی کاموں میں خرچ کیا جائے۔ سرسید نے کالج فنڈ کی وجہ سے ہر طرح کا خرچ بند کردیا تھا۔ خاندانی تقاریب نہایت سادہ طریقے پر مناتے تھے اور بچا ہوا روپیہ قومی کاموں میں دے دیتے تھے۔ اپنے پوتے راس مسعود کی بسم اللہ کی تقریب میں بھی خرچ ہونے والا پیسہ کالج فنڈ میں دے دیا۔

''دیکھو میں نے اپنے بیٹے سید حامد کو نہیں بلایا کسی عزیز رشتہ دار کو جو علی گڑھ میں موجود نہ تھے نہیں بلایا جو لوگ اتفاق سے یہاں موجود تھے انہیں کے شمول پر اکتفا کیا۔ یہ بڈھا شخص داڑھی منڈ (راجہ جے کشن داس کی طرف اشارہ کرکے) جن سے مجھے ایسی محبت ہے جیسی بھائی سے ہوتی ہے۔ اس تقریب کے لیے نہیں بلایا بلکہ میری خوش قسمتی ہے کہ کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے یہاں موجود تھے میری قوم کے بزرگ جو کثرت سے یہاں موجود ہیں انہیں کو اپنا بھائی سمجھا انہیں کے شمول کو اپنے دل کی خوشی سمجھا اور اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کی تقریبوں میں جہاں تک ممکن ہو تمام اخراجات کو بند کیا جاوے اور قوم کی فلاح میں روپیہ خرچ کیا جاوے۔''

سرسید کی یہ نصیحت کہ تقریبات کا تمام خرچ بند کردیا جائے صرف نصیحت نہ تھی بلکہ عمل بھی کرکے دکھایا اور آج کے مسلمانوں کے لیے سونے کے حروف میں لکھے جانے کی قابل نصیحت ہے اور ہم سب کی تنزلی سے نکلنے کی ایک عمدہ ترکیب ہے۔ سرسید نے ایسا عمل پیش کردیا کہ جو قابل تقلید اور ترقی کے لیے ضروری ہے۔ حد یہ ہے کہ جو دوست احباب سرسید کی دعوت کرنا چاہتے تھے ان سے دعوت کے بدلے نقد روپیہ لے لیتے تھے اور کالج فنڈ میں جمع کردیتے تھے۔ ایک بار حیدرآباد سے لوٹنے پر ان کے دوست احباب نے بیس بیس روپیہ جمع کرکے سرسید کو شکرگزاری کے طور پر دعوت دینا چاہی۔ سرسید نے کہا کہ اس کا انتظام میں خود کروں گا وہ سب روپیہ ان سے لے کر اور بیس روپیہ اپنے حصہ کا ملا کر دوسو چالیس روپیہ کی دو اسکالرشپیں دس دس روپیہ ماہوار کی غریب طالب علموں کو دے دیں۔ اپنے بیٹے

سید محمود کی شادی کا ولیمہ تک نہیں کیا اور وہ رقم بھی مدرسے کے چندے میں دے دی۔

''بعض دوستوں نے شکایت کی ہے کہ شادی میں دعوت ولیمہ نہیں کی مگر نہ ہم جاگیردار ہیں نہ رئیس ہیں اگر دعوت ولیمہ کرتے تو زیادہ سے زیادہ پانچ سو روپیہ لگا سکتے تھے سو ہم نے پانچ سو روپیہ مدرسہ میں دے دیا۔''۴؎

سرسید حیدر آباد کے آخر سفر میں نظام حیدر آباد کے مہمان تھے ان کے کچھ دوستوں نے دعوتیں کرنی چاہیں وہ تمام پیسہ بھی نقد لے کر مدرسہ کے چندہ میں جمع کر دیا اور کہا کہ یہی دعوت ہے۔ محسن الملک نے جب پارٹی کرنی چاہی تو ان سے بھی ہزار روپیہ نقد حاصل کر کے چندہ میں جمع کر دیا۔ غرض بقول حالی:

''اسی قسم کی بے شمار تدبیروں سے سرسید نے مدرسہ کے لیے سرمایہ جمع کیا ولایت سے آ کر وہ اٹھائیس برس زندہ رہے اس عرصہ میں برابر ان کو یہی ادھیڑ بن لگی رہی کہ کس طرح روپیہ فراہم ہو اور کیونکر مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کی تعلیم و تربیت کا سامان مدرسۃ العلوم میں مہیا کیا جائے۔''۵؎

جن لوگوں سے زیادہ قربت اور دوستی تھی سب سے پہلے چندے کی شروعات ان ہی سے کیا کرتے تھے۔ دوست احباب تنگ آ گئے کہ سرسید تو بغیر بتائے ہوئے ہی چندہ کی رقم خود ہی لکھ لیتے ہیں ان کے دوست دیتے دیتے تھک گئے مگر وہ مانگتے مانگتے نہ تھکے۔ سرسید ایک آرٹیکل میں لکھتے ہیں:

''ہمارا حال تو یہ ہو گیا ہے کہ ہمارے دوست بھی ہم سے ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ بھائی میری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا تھا سو اس لکھے کی بد ملاتا ہوں مگر شکر ہے کہ اپنے لیے نہیں بلکہ قوم کے لیے۔''۶؎



الغرض سرسید نے کوئی طریقہ بھی جو ممکن ہو سکتا تھا چندہ جمع کرنے کے لیے اختیار کرنے سے نہ چھوڑا لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے لے کر اسٹیج پر ایکٹنگ کرنے تک۔

○

**حواشی:**

(۱) علی گڑھ آرکائیوز ڈپارٹمنٹ آف ہسٹری، اے ایم یو، ص: ۲۶۰

(۲) سرسید نے یہ تحقیق کیا تھا کہ دہلی کے پاس تغلق آباد میں جو گھسیارے گھاس بیچ کر اپنا پیٹ پالتے تھے وہ سب شاہان تغلق خاندان سے تعلق رکھتے تھے زمانہ کی گردش نے ان کی یہ حالت بنا دی تھی۔ (بحوالہ حیات جاوید، ص:

(۳) بحوالہ نامورانِ علی گڑھ، پہلا کارواں، ص: ۴۰

(۴) بحوالہ حیات جاوید ص: ۱۹۸

(۵) حیات جاوید، ص: ۲۰۰

(۶) بحوالہ حیات جاوید ص: ۲۰۰

# تصورِ تعلیم

## طریقۂ تعلیم میں تبدیلی ضروری ہے

سرسید کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو بہت سے امراض نے دفعتاً گھیر رکھا ہے۔ دینی و مذہبی تعصّبات، ہندوؤں کی طرح فرقہ بندی، جہالت اور ماضی پر غرور، غیر مذہبی باتوں کو اسلام سمجھنا اور طرح طرح کی خرافات میں مسلمان گرفتار تھے۔ پرانا طریقۂ تعلیم مسلمانوں کو ان برائیوں سے باہر نکالنے میں ناکام رہا تھا۔ ہندوستان کے اکثر مسلمان نئے حقائق سے یکسر ناواقف اپنی پرانی بوسیدہ دنیا میں مگن تھے جہالت کے اندھیرے نے ان کی بینائی چھین لی تھی کہ آس پاس ہونے والی ترقی بھی ان کو نظر نہ آتی تھی انگریز ہزاروں میل دور سے آ کر مسلمانوں کو ہٹا کر ہندوستان کے حکمراں بن گئے تھے پھر بھی مسلمان اس کی وجوہات تلاش کرنے سے منہ چھپاتا پھرتا تھا اور پرانے طریقۂ تعلیم و مروجہ علوم کے سائے میں اپنے لیے سکون تلاش کرتا تھا۔ مسلمانوں کو ہندوؤں کی ترقی بھی نظر نہیں آتی تھی انگریزوں کی شاندار فتوحات کا بھی ان پر کچھ اثر نہ تھا۔ مسلمان عظمت رفتہ کا سوگوار پرانے بوسیدہ پیرہن میں ہی مگن تھا۔ سرسید کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے سب سے پہلے مسلمانوں کی حکمرانی سے بے دخلی اور مفلسی کے اسباب کا پتہ لگا کر اس کا علاج کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ انھوں نے سمجھ لیا تھا کہ مسلمان جب تک نئے علوم اور نئے فلسفہ کو نہیں اپنائیں گے یوں ہی ذلیل خوار اور محکوم رہیں گے۔ وہ حقیقت کو سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ مسلمان بھی اس حقیقت کو پہچاننے میں دیر نہ لگائیں کہ وقت کم ہے اگر کچھ دن اور غافل رہے تو چاہنے پر بھی کچھ نہ کر سکیں گے۔

"اے میری قوم کے لوگو! اپنے عزیز اور پیارے بچوں کو غارت نہ کرو



ان کی پرورش کرو ان کی آئندہ زندگی اچھی طرح بسر ہونے کا سامان کرو، مجھ کو تم کچھ بھی کہو میری بات سنو یا نہ سنو مگر یاد رکھو کہ اگر تم ایک قومی تعلیم کے طور پر ان کو تعلیم نہ دو گے۔ تو وہ آوارہ اور خراب ہوں گے۔ تم ان کی ابتر حالت دیکھو گے اور بے چین ہو گے روؤ گے اور کچھ نہ کر سکو گے............ ابھی وقت ہے تم سب کچھ کر سکتے ہو یاد رکھو میں یہ پیشن گوئی کرتا ہوں کہ اگر چند روز تم اسی طرح غافل رہے تو ایک زمانہ آوے گا کہ تم چاہو گے کہ تم اپنے بچوں کو تعلیم دو ان کی تربیت کرو مگر تم سے کچھ نہ ہو گا۔ مجھ کو کچھ کہو کافر ملحد نیچری میں تم سے خدا کے سامنے کچھ سفارش نہیں چاہتا۔ میں تم سے اپنی شفاعت کے واسطے خواستگار نہ ہوں گا میں جو کچھ کہتا ہوں تمہارے بچوں کی بہتری کے لیے کہتا ہوں تم ان پر رحم کرو اور ایسا کچھ کرو کہ آئندہ پچھتانا نہ پڑے۔"

سرسید کو سب سے زیادہ مشکلات مذہبی علماء کے طبقہ کی طرف سے پیش آئیں یہی طبقہ تھا جس نے سرسید پر ان کی مخلصانہ کوششوں کے عوض ملحد کافر و نیچری جیسے خطابات سے نوازا۔ سرسید نئی تعلیم اور سائنس سے مسلمانوں کو روشناس کرانا چاہتے تھے کہ اسلام کی تعلیمات کا بھی یہی تقاضا تھا مگر مذہبی علماء کو پرانے فرسودہ نظام تعلیم سے زیادہ دلچسپی تھی بمقابلہ مسلمانوں کی ترقی اور ان کو خوشحال بنانے اور دوسری قوموں کے برابر لانے کے۔ سرسید آئین نو کی تعلیم مسلمانوں کو دے رہے تھے اور یہ طبقہ طرز کہن پر اڑا ہوا تھا۔

نئے علم و ہنر کا زمانہ تھا نئے علوم اور سائنس ترقیات نے مغربی قوموں کے ہاتھوں میں وہ قوت دے دی تھی کہ دنیا ان کے لیے مسخر ہو کر رہ گئی تھی۔ سرسید مسلمانوں کو انہی علوم سے روشناس کرانا چاہتے تھے۔

لی ہے کروٹ ایک مدت سے زمانے نے بدل
راست تھا اگلوں کو جو موسم گیا کب کا نکل
کام کے ہیں اب نہ دنیا میں ہنر ان کے نہ فن
اور اب کارآمد زمانے میں ہے کس انکا نہ بل

ہیں نئی رسمیں نئے آئین نئی ہے چال ڈھال
اور نئے علم و ہنر کا ہے جدھر دیکھو عمل

جدید تعلیم اور علوم وفنون سے مسلمانوں کی بیزاری کا یہ سلسلہ بغیر روک ٹوک جاری تھا۔ان میں کسی کو یہ خیال تک نہ تھا کہ ہمسایہ قوم نے اس میدان میں کتنی عظیم سبقت حاصل کر لی ہے اور اس وجہ سے وہ اقتصادی طور سے بھی مضبوط ہو گئے تھے۔سرسید بڑے دکھ کے ساتھ یہ سب دیکھ رہے تھے کہ اگر یہ سب چلتا رہا تو کچھ دنوں کے بعد مسلمان بجز چپراسی اور خانساماں کے کچھ کرنے کے قابل نہ رہ جائیں گے۔اپنے ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''بھائی مہدی! تم پانیئر اخبار الہ آباد میں سے ایک آرٹیکل کا ترجمہ سنو، وہ لکھتا ہے آج کل ہندوستان میں خاندان مسلمانوں کے روز بروز گھٹتے جاتے ہیں۔ چنانچہ صرف بنگالہ میں تمام سلطنت کے ملازمین میں چند مسلمان ہیں وہ بھی ضعیف ہیں جلد پنشن لیں گے اور ان کی جگہ یقینی کوئی مسلمان نہیں ہونے کا اور آئندہ بجز چپراسی اور دفتری کے کوئی مسلمان معزز عہدے پر نہیں ہوگا......دیکھو جو میں کہتا تھا اور جس کا غم کرتا تھا اب سب لوگ وہی کہتے ہیں۔''[۲]

کچھ ہی دنوں بعد سرسید نے اس تکلیف دہ صورتحال کا ذکر ان الفاظ میں کیا:

''جس حساب سے یہ تنزل شروع ہوا ہے اگر اسی اوسط سے اس کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ چند برس ہی اس بات کو باقی ہیں کہ مسلمان سائنسی خانسامائی خدمت گاری کے سوا اور گھس کھدے ہونے کے علاوہ اور کسی درجہ میں نہ رہیں گے اور کوئی ایسا گروہ جس کو دنیا میں کچھ بھی عزت حاصل ہو مسلمانوں کے نام سے نہ پکارا جائے گا۔''[۳]

مسلمانوں کو اس حالت سے نکالنے کے لیے ضروری تھا کہ پرانے طریقۂ تعلیم میں دوررس تبدیلیاں کی جائیں اور جو نظام تعلیم مسلمانوں کو فائدہ پہنچائے اس کو رائج کیا جائے۔ بدقسمتی سے پرانے نظام تعلیم کو آج تک اسلامی نظام تعلیم اور اصل دین سمجھا جاتا



ہے۔سرسید یا دوسرے لوگ اسلام اور دین کی تعلیم کے ان سے بڑے حامی تھے جو اپنے آپ کو اس کا حامی بتاتے ہیں۔لیکن فرق صرف طریقۂ تعلیم کا ہے اور نئے فلسفہ کی روشنی میں اسلام کو طاقت ور بنانے کا ہے۔آخر پہلے مفکرین اسلام نے بھی تو یونانی فلسفہ کی بنیاد پر اسلام کی تشریحات کی تھیں۔دینی مکاتب اور مدارس کے سلسلہ میں اگر کہا جائے کہ ان میں جمہوری نظام انتظام رائج کرو تو بہت بڑا جھگڑا کھڑا ہو جائے گا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ تقریباً تمام ہی مدارس خاندانی وراثتیں بنے ہوئے ہیں۔ والد بزرگ ہیں تو اس کے بعد پسر محترم ہیں اس کے بعد آئندہ آنے والی نسلیں ہیں نسلاً بعد نسلاً نظامت خاندان میں منتقل ہوتی رہتی ہے۔ پسینہ عام مسلمانوں کا اور انتظام موروثی، لہٰذا سرسید بہت غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے کہ نئے حالات میں پرانی تعلیم کسی کام کی نہیں۔

''ہندوؤں کی پرانی تعلیم منگنا پنڈت پیدا کرتی ہے تو مسلمانوں کی قدیم تعلیم فاتحہ کی روٹی کھانے والا ملا۔''[۴]

## مروجہ علوم بے فائدہ ہیں

اسی خیال کے پیش نظر سرسید پرانے طریقۂ تعلیم کے خلاف ہو گئے اور مسلمانوں کے لیے سودمند طریقۂ تعلیم جاری کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔جس زمانے میں سرسید انگلستان میں تھے ان کو پتہ چلا کہ دہلی میں منشی امو جان کے مکان پر ایک قدیم طرز کا عربی مدرسہ قائم کیا گیا ہے۔اس پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے ایک خط میں محسن الملک کو لکھتے ہیں:

''جان من و جناب من! ایسے ایسے مدرسوں سے کچھ فائدہ نہیں ہے افسوس ہے کہ مسلمان ہندوستان کے ڈوبتے جاتے ہیں اور کوئی ان کو نکالنے والا نہیں ہائے افسوس مروت تھوکتے ہیں اور زہر نگلتے ہیں ہاتھ پکڑنے والے کا ہاتھ جھٹک دیتے ہیں۔اے بھائی مہدی کچھ فکر کرو اور یقین جان لو کہ مسلمانوں کے ہونٹوں تک پانی آ گیا ہے۔ اب ڈوبنے میں بہت ہی کم فاصلہ باقی رہ گیا ہے۔اگر تم یہاں آتے تو دیکھتے کہ تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور تعلیم اولاد کا کیا قاعدہ ہے

اور علم کیونکر آتا ہے؟ اور کس طرح کوئی قوم عزت حاصل کرتی ہے۔
انشاءاللہ تعالیٰ میں یہاں سے واپس آکر سب کچھ کہوں گا اور کروں گا
مگر مجھ کافر مردود و گردن مروڑی مرغی کھانے والے کفر کی کتابیں
چھاپنے والے کی کون سنے گا؟''۵

الغرض سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے باندھتے رہتے تھے اس رائے پر آکر ختم ہو گئے کہ ہندوستان میں چل کر قوم کی تعلیم کے لیے ایک کالج یا یونیورسٹی قائم کی جائے۔ تقلید اور جہالت مسلمانوں میں عام تھی اور جو مسلمان تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم قدیم علوم تک محدود تھی جن کا بے مصرف ہونا اب پوری طرح واضح ہو چکا تھا چنانچہ سرسید یہ کہنے پر مجبور تھے۔

''جو علوم مسلمانوں میں مروج ہیں وہ بلاشبہ غیر مفید ہیں اور حسب احتیاج وقت نہیں ہیں اور یہی باعث ان کی مفلسی اور محتاجی کا ہے کیونکہ مفلسی کا اصل سبب جہل ہے اور غیر مفید علوم کا عالم اور جاہل دونوں برابر ہیں اس لیے کہ ان سے نہ لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے اور نہ وہ خود اپنا بھلا سکتے ہیں جو تعلیم کہ حسب احتیاج وقت نہ ہو وہ غیر مفید ہوتی ہے اور جیسا کہ ایک عقل مند آدمی کا قول ہے کہ حسب احتیاج وقت لوگوں کی تربیت نہ ہو تو اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لوگ اول مفلس پھر محتاج اور پھر نالائق اور کاہل اور پھر ذلیل و خوار اور پھر چور بدمعاش ہوتے ہیں۔''۶

حالی اس صورت حال کو یوں واضح کرتے ہیں۔

نتائج ہیں جو مغربی علم و فن کے ۔۔۔ وہ ہیں ہند میں جلوہ گر سو برس سے
تعصب نے لیکن یہ ڈالے ہیں پردے ۔۔۔ کہ ہم حق کا جلوہ نہیں دیکھ سکتے
دلوں پر ہیں نقش اہل یوناں کی رائیں
جو اب وحی اترے تو ایماں نہ لائیں
اب اس فلسفہ پر جو ہیں مرنے والے ۔۔۔ شفا اور مجسطی کا دم بھرنے والے



ارسطو کی چوکھٹ پر سر دھرنے والے ۔۔۔ فلاطون کی اقتدار کرنے والے
وہ نیکی کے کچھ بیل سے کم نہیں ہیں
پھرے عمر بھر اور جہاں تھے وہیں ہیں
نہ سرکار میں کام پانے کے قابل ۔۔۔ نہ دربار میں لب ہلانے کے قابل
نہ جنگل میں ریوڑ چرانے کے قابل ۔۔۔ نہ بازار میں بوجھ اٹھانے کے قابل
نہ پڑھتے تو سو طرح کھاتے کما کر
وہ کھوگئے اور تعلیم پا کر

مرتے دم تک سرسید کی یہ کوشش رہی کہ مسلمان اپنے دوسرے ہم وطنوں کے شانہ بشانہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھیں لیکن مسلمان قوم ہزار برس سے زیادہ عرصہ سے ایک ایسی تعلیم کی پابند تھی جس میں عقلی اور نقلی دونوں تعلیموں نے مل کر ایک مقدس مذہبی تعلیم کی بلکہ خود مذہب کی شکل اختیار کر لی تھی ایسی قوم میں کسی نئے طرز تعلیم کا اجرا کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ کسی کٹر مذہب پرست قوم میں نئے مذہب کا رواج دینا۔ یہ صورت حال آج تک جاری ہے۔ مسلکی مدارس میں جاری طریقۂ تعلیم کو بہت سے لوگ آج تک مذہب کی حیثیت دیتے ہیں۔ لہٰذا زمانہ بدلا دنیا میں ہزاروں تغیرات آئے خود عربی زبان میں بہت تبدیلیاں ہوئیں لیکن نہ بدلا تو ان مدارس کا نصاب اور طریقۂ تعلیم کچھ حساب اور انگلش اور بنیادی سائنس کو بھی یہ مدارس نصاب میں شامل کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ حیرت یہ ہے کہ کچھ دن پہلے دارالعلوم دیوبند نے طبیہ کالج تک بند کر دیا۔ یہ خیال کر کے کہ اس میں تعلیم یافتہ لڑکے مکمل مولوی نہیں بن پاتے۔ مولانا سید سلیمان ندوی جیسے بڑے عالم ندوہ میں سب طلباء کو انگریزی زبان پڑھائے جانے کے خلاف تھے کہ یہ ان کے نزدیک انگریزیت کو بڑھاوا دیتی ہے اور طلباء کو مولوی نہیں بننے دیتی۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

''میں ندوہ میں ہر طالب علم کا انگریزی پڑھنا ضروری نہیں سمجھتا۔ یہی ناقص انگریزیت ان کو مولوی علماً اور عملاً نہیں بننے دیتی اور اسکول کالج کی راہ دکھا کر ان کو ہمیشہ کے لیے غارت کر دیتی ہے یعنی ان کے نقطۂ نظر کو بدل دیتی ہے۔''۷

## پرانے اور نئے علوم کا فرق

قدیم تعلیم بالکل اپنے پرانے طریقہ پر اسی طرح رواں ہے جیسی کہ صدیوں پہلے تھی۔ قدیم علوم میں دلیل کو دلیل سے حق یا باطل ثابت کیا جاتا ہے جبکہ جدید علوم میں صرف دلیلوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ سائنٹفک ثبوت ہر دعوے کا ہونا چاہیے جسے اگر ہو سکے تو تجربہ کر کے ثابت کیا جا سکے۔ اسی فرق کو واضح کرتے ہوئے سرسید نے ایک بار کہا تھا:

> ''ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ معبدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو دلائل سے اور عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہیں مگر اس زمانے میں نئی صورت پیدا ہوگئی ہے جو اس زمانے کے فلسفے اور حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربات سے ثابت کئے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیے جائیں۔''[۸]

سرسید نے پرانے تصورِ علم کو بالکل رد کر دیا تھا۔ ان کے ذہن میں علم قومی ترقی کا راستہ اور معاشی ترقی حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ علم برائے علم نہ ہو بلکہ سماج کی بہتری اس کا نصب العین اور مقصد ہو۔ علم خالی ذہنی آسودگی کا ذریعہ نہ ہو بلکہ دنیا میں کسی مفید کام میں آنے کا ذریعہ بنے۔ ایک مرتبہ کہا:

> ''افسوس یہ ہے کہ ہم یہ بھی نہیں جانتے کہ علم کیا چیز ہے جس سے قومی ترقی ہوتی ہے آج تک جو ہم نے جانا اور جو ہمارے بزرگوں نے جانا علم کی حقیقت کو اسی قدر جانا کہ ایک شے عقلی ہے جو خیال اور حافظہ میں رہتی ہے اور نفس کو اس سے بہت حظ اور روح کو خوشی حاصل ہوتی ہے مگر اس زمانے میں اصل علم اسی کو کہتے ہیں جو دیکھنے برتنے اور تجربے میں آوے اور انسان کے تمام کاموں میں مفید ہو یہی سبب ہے کہ ہمارے اگلے زمانے کے عالم فاقے مرتے تھے اور خیرات کے ٹکڑوں پر بسر اوقات کرتے تھے اور اس زمانے میں



> تربیت یافتہ ملکوں کے جو عالم ہیں وہ دولت اور حشمت سے مالا مال ہیں اور ان سے اپنی قوم کی بھلائی اور ترقی ہر دم ہوتی ہے۔''

○

حواشی:

(۱) ناموران علی گڑھ، ص:۱۲

(۲) مکتوبات سرسید، ص:۶۳

(۳) مجموعہ لکچرز، ص:۲۷۳

(۴) نقوی سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ص:۱۱۵

(۵) حیات جاوید، ص:۳۴۴

(۶) مضامین تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص:۴۲۹

(۷) عبدالماجد دریابادی، مکتوبات سلیمانی، ص:۱۴۲

(۸) فکر و نظر ناموران علی گڑھ پہلا کارواں، ص:۳۲

# سرسید کے مذہبی افکار

سرسید کے مذہبی عقاید کے سلسلہ میں طرح طرح کی بدگمانیاں مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ سرسید شیطان اور فرشتوں کے قائل نہ تھے۔ جنت و دوزخ کے قائل نہ تھے احکام معاد پر یقین نہ رکھتے تھے، معراج رسول کو غیر سائنسی خیال کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔ یہ تمام اور طرح طرح کے دوسرے گمراہ عقائد سرسید سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ یہ سوال بڑا اہم ہے کہ آخر ایسا پروپیگنڈہ کیوں کیا گیا؟ اور وہ کون لوگ تھے جنھوں نے یہ خیالات عوام میں حمایت اسلام کے نام پر پھیلائے اور سرسید کی امیج کو دھندلا کرنے کی کوشش کی؟ اس سلسلے میں جہاں تک ہم نے تحقیق کی ہے سب سے پہلے مولوی علی بخش خاں بہادر سب آرڈینٹ جج گورکھپور نے سرسید کے مذہبی خیالات کو نشانہ بنایا اور ایک رسالہ ''تائید اسلام'' تصنیف فرمایا۔ یہ ذکر پہلے ہی آچکا کہ سرسید کے تعلیمی مشن کی مخالفت میں سب سے اہم رول مولوی علی بخش خاں اور مولوی امداد علی کانپوری نے ادا کیا۔ مولوی علی بخش خاں انگریز حکومت کے ملازم تھے اور سرسید سے ذاتی رنجش رکھتے تھے۔ حالی نے حیات جاوید میں اس کی طرف کچھ نشاندہی بھی کی ہے کہ انگریزوں کے ایک طبقہ کی حمایت میں یہ ساری کارروائیاں کی جارہی تھیں جس میں ولیم میور خاص طور سے قابل ذکر ہیں جن کی کتاب ''لائف آف محمد'' کا مدلل جواب سرسید نے دے کر ان کی علمی حیثیت کو مشکوک کر دیا تھا۔ ہم یہاں ذاتی رنجشوں کا ذکر نہیں کریں گے بلکہ یہ سوال ہمارے نزدیک زیادہ اہم ہے کہ مولوی علی بخش خاں کی علمی حیثیت کیا ہے اور کیا ان کا نام ہندوستان کے مقتدر علما کی فہرست میں شامل کیا جاتا ہے۔

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ اگر خود مولوی علی بخش خاں کا کوئی خاص علمی درجہ نہیں تو کیا کوئی تحقیقی تصنیف ان کے خیالات کی حمایت میں کسی مقتدر عالم کی موجود ہے جس میں سرسید کی طرف اسی طرح کے عقائد منسوب کیے گئے ہوں؟ ہندوستان کے جانے پہچانے



مقتدر علماء کا نام تمام مسلمانوں کو معلوم ہے چند ان میں سے یہ ہیں، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا اشرف علی تھانوی، علامہ شبلی نعمانی، مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا مودودی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا قاری طیب صاحب، مولانا ابوالحسن علی ندوی۔ ہم نے بہت تحقیق کی مگر ہمیں آج تک ان میں سے کسی عالم کی کوئی تحقیقی تصنیف مولوی علی بخش خاں کی حمایت میں یا سرسید کے مذہبی عقائد کی گمراہی کے سلسلہ میں فراہم نہ ہوسکی۔ سرسری طور پر سرسید کو بدعقیدہ قرار دے دینا ایک الگ بات ہے اور تحقیق کے دائرے میں اس خیال کو شامل نہیں کیا جاسکتا بلکہ یہ ایک سنی سنائی بات مانی جائے گی۔ ایک وجہ سرسید کے بدعقیدہ ہونے کے سلسلے میں کسی تصنیف کے نہ ہونے کی یہ ہوسکتی ہے کہ مذہبی علماء نے سرسید کے اس پہلو کو اہمیت ہی نہ دی ہو اور یہ مان لیا گیا ہو کہ سرسید تو گمراہ تھے ہی اس کا کیا ذکر کرنا۔ لیکن یہ بات اور زیادہ خطرناک ہے کہ اس طرح بہتان کا الزام بہت آسانی سے لگ سکتا ہے جبکہ خود سرسید کی تحریریں اپنی صفائی میں موجود ہیں۔ خدا کے حضور ایسا شخص اپنے اوپر لگائے گئے بہتان کا جواب طلب کرسکتا ہے اور اس وقت جب انصاف کا بول بالا ہوگا جواب دینا بہت مشکل ہوگا۔

اس ضمن میں چند خطوط کا تبادلہ سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی صاحب کے درمیان ہوا۔ سرسید نے اپنے عقائد علماء سہارنپور کو پیش کیے وہاں سے بھی سرسید کے اوپر کوئی الزام نہ لگایا گیا۔ اور ان کو گمراہ قرار دینے کی کوئی تحریر اس میں نہیں پائی جاتی یہ خط و کتابت تصفیۃ العقائد کے نام سے مجتبائی پریس دہلی سے ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ پیر جی محمد عارف، سرسید اور مولانا قاسم نانوتوی دونوں کے دوست تھے۔ سرسید نے پیر جی کے توسط سے اپنی تفسیر کے پندرہ اصول مع وضاحت کے مولانا قاسم نانوتوی صاحب کو بھجوائے تھے۔ ہم یہاں اس علمی بحث میں پڑنا نہیں چاہتے بلکہ صرف یہ دکھانا مقصود ہے کہ سرسید اپنے مذہبی خیالات کے سلسلہ میں اپنے زمانے کے بڑے عالم سے رائے مشورہ طلب کرنا چاہتے تھے۔ فرمایا کہ:

> ''بزرگان سہارنپور نے جو نوازش و دل سوزی میرے حال زار پر کی جس کا ذکر آپ نے مجھ سے فرمایا میں دل سے ان کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اگر جناب مولوی محمد قاسم صاحب تشریف لاویں تو میری

سعادت ہے میں ان کی کفش برداری کو اپنا فخر سمجھوں گا مگر اس وقت
مرزا غالب کا ایک شعر یاد آرہا ہے۔

حضرت ناصح جو آویں دیدہ و دل فرش راہ
کوئی مجھ کو یہ تو سمجھاؤ کہ سمجھاویں گے کیا

جناب من میری تمام تحریریں جن کے سبب میں کافر و مرتد ٹھہرا ہوں اور وحدانیت و رسالت کی تصدیق کے ساتھ کفر جمع ہوا ہے، جو میرے نزدیک محالات سے ہے چند اصولوں پر مبنی ہیں۔ اگر آپ مناسب سمجھیں تو ان اصولوں کو بزرگان سہارنپور کی خدمت میں بھیج دیں۔ اگر ان میں کچھ غلطی ہے تو بلاشبہ نصیحت کارگر ہوگی ورنہ ایسا نہ ہو کہ ناصح ہی مجھ سے ہو جاویں۔"[۱]

اس کے بعد پندرہ اصول تفسیر سرسید نے نقل کیے ہیں۔ مولانا قاسم نانوتوی اور سرسید کے بیچ یہ خط و کتابت بہت سے مسائل کا حل پیش کرسکتی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ محقق حضرات اس کی روشنی میں سرسید کے مذہبی افکار کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ہوسکتا ہے کہ قوم کی بھلائی کا کچھ راستہ اس سے بھی نکل آئے کہ سرسید کا کوئی کام ملت اسلامیہ کی بھلائی سے خالی نہ تھا۔ مولانا قاسم نانوتوی کی کسی تحریر کا سرسید کے مذہبی عقائد کی مخالفت میں موجود نہ ہونا سرسید کے عقائد کی درستی کی بہت بڑی دلیل ہے کہ دونوں ایک ہی عہد کے تھے اور دونوں ایک دوسرے کے نظریات کو بہتر طور سے سمجھتے تھے۔ اگر قاسم نانوتوی صاحب کوئی خطرہ محسوس کرتے تو ضرور قوم کو اس سے خبردار کرتے کہ یہ ان کا دینی فریضہ ہو جاتا۔

آئندہ صفحات میں ہم سرسید کے ایک مشہور مضمون ''دافع البہتان'' کا خلاصہ پیش کررہے ہیں جس میں سرسید نے اپنے اوپر لگائے گئے الزامات کا جواب دیا ہے۔

حاشیہ: (۱) مکتوبات سرسید، ص: ۴۰۰

# دافع البہتان [۱]

## سرسید کا جواب در ''تائید اسلام''

''جناب حضرت سید الحاج مولوی علی بخش خان بہادر سب آرڈیننٹ جج گورکھپور نے ایک کتاب ''تائید اسلام'' تحریر فرمائی ہے جس میں مجھ پر بہت سے اتہام کیے ہیں اگرچہ میں ایسی باتوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتا مگر بہت سے دوست بضد ہیں کہ جن عقائد کو جناب سید الحاج نے تمہاری طرف منسوب کیا ہے ان کی نسبت بلا بحث و استدلال صرف اتنا لکھو کہ وہ حقیقت میں تمہارا عقیدہ ہے یا تم پر اتہام ہے میں ان کے ارشاد کی تعمیل کرتا ہوں۔''

اس تمہید کے بعد سرسید نے فرداً فرداً تمام اتہاموں کا جواب دیا ہے۔ ہم نے بہت مختصر کر کے صرف ان عقائد کا جواب یہاں نقل کیا ہے جو کہ عام فہم اور عوام کو غلط فہمی میں ڈالنے والے ہیں۔ خالص علمی اور فلسفیانہ مباحث کا یہاں ذکر نہیں کیا ہے ان معاملات سے دلچسپی رکھنے والے حضرت اس مضمون کو رسالہ تہذیب الاخلاق سے نقل کر سکتے ہیں۔

- جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ مجموعہ موجودہ اسلام مخاطب یعنی میرے نزدیک قطعاً باطل ہے۔

یہ محض اتہام ہے میرا یہ عقیدہ نہیں ہے میں نے ایک مقام پر جہاں بحث کی ہے کہ مذاہب مختلفہ میں کون سا مذہب سچا ہو سکتا ہے اور بعد ایک لمبی تقریر کے بیان کیا ہے کہ مذہب اسلام کے سوا کوئی مذہب سچ نہیں ہو سکتا وہاں میں نے لکھا ہے کہ اسلام سے مراد یہ مجموعۂ احکام نہیں ہے کیونکہ اس میں احکام منصوصہ اور اجتہادات و قیاسات سب شامل ہیں جن میں خطا کا احتمال ہے۔ اس مقام پر میری مراد مذہب اسلام سے صرف احکام منصوصہ ہیں پس یہ کہنا کہ میرے نزدیک مجموعہ موجودہ اسلام



قطعاً باطل ہے کیسا غلط اور کتنا بڑا اتہام ہے۔

مولانا سید الحاج فرماتے ہیں کہ مجموعہ اسلام مخاطب یعنی میرے نزدیک خلاف مرضی الٰہی ہے۔

- نعوذ باللہ میرے نزدیک کوئی مذہب سوائے مذہب اسلام کے مطابق مرضی الٰہی کے نہیں ہے۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ احکام معاد پر اعتقاد لانا اور صحیح ماننا مخاطب کے نزدیک مانع ترقی ہے۔

- لعنت خدا کی ہو اس پر جس نے یہ لکھا ہو اور جس کا یہ اعتقاد ہو۔ میں نے یہ لکھا ہے کہ جب اس سچے مذہب میں بھی لغو خیالات اور بدتعصّبات مل جاتے ہیں تو وہ ویسا ہی انسان کی ترقی کا حارج ہو جاتا ہے۔ کجا یہ الفاظ کجا یہ عقیدہ جو سید الحاج نے میری نسبت لکھا ہے جس وقت انھوں نے یہ لکھا شاید خود ان کو احکام معاد پر یقین نہ تھا کیونکہ اگر یقین ہوتا تو وہ ضرور خیال فرماتے کہ مرنا بھی ہے خدا کے سامنے جانا ہے میں کیونکر ایک شخص پر اتہام کروں۔

جناب موصوف فرماتے ہیں کہ ایجاد شریعت مخاطب یعنی میرے نزدیک ضروری ہے۔

- لعنت اللہ۔ میرے اعتقاد میں شریعت حقہ محمدیہ خاتم شریعت ہے جیسا کہ محمد خاتم النبوت ہیں۔

جناب سید الحاج نے پانچ اتہام ایک فقرے میں میری نسبت کئے ہیں ایک اتباع سواد اعظم و اتفاق جمہور مخاطب کے نزدیک باطل ہے۔ دوم کسی عالم کے قول کا اعتبار نہیں۔ سوم مسلمات مذہبی سے انکار کرنا نہ بدعت ہے، نہ کفر ہے۔ چہارم تقلید ائمہ اربعہ کی ظلمت و ضلالت ہے۔ پنجم فقہ و حدیث پر اعتقاد لانا بیجا ہے۔

- یہ سب جو کچھ لکھا ہے سب غلط ہے اور تمام تر مضامین کو تحریف کیا ہے۔

جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے احکام معاد مثل جنت و نار صراط و میزان و ضرر و حشر وغیرہ عذاب قبر وغیرہ جو محسوسات نہیں ہیں باطل ٹھہرائے ہیں۔

- یہ محض اتہام ہے میں نے ایک حرف بھی اب تک ان کی نسبت نہیں کہا۔ نعیم جنت و

وعید جہنم پر اور بعث بعد الموت پر میں اعتقاد رکھتا ہوں۔ باقی رہیں ان کی کیفیات وہ ہر شخص موافق اپنے مذاق کے بیان کرتا آیا ہے چنانچہ امام غزالی کی کتاب احیاء العلوم ان باتوں سے پُر ہے۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ صرف فرائض پر عمل کرنا وہ بھی جو نیچر کے موافق ہوں کافی ٹھہرایا ہے۔

○ اگرچہ اس میں بھی کچھ تدریس کی ہے مگر بلاشبہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ جس قدر فرائض مذہب اسلام ہیں وہ فطرت اللہ یعنی نیچر کے مطابق ہیں اور بلاشبہ صرف فرائض کا ادا کرنا اور گناہوں سے بچنا بہشت میں جانے کو کافی ہے۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ جو عبادت خلاف نیچر ہو اس کو میں نے باطل ٹھہرایا ہے۔

○ اس میں بھی تحریف کی گئی ہے کیونکہ میں نے کہا ہے کہ زہد و ریاضت کو صرف راتوں کو جاگنے اور ذکر و شغل اور نفل پڑھنے اور نفل روزہ رکھنے میں منحصر سمجھنا (قطع نظر اس کے کہ ان کا ایسا کرنا حد اعتدال سے گزر جانا قانون قدرت کے برخلاف ہے مقصود شارع ہے یا نہیں ہم تسلیم کرتے ہیں کہ وہ عبادت سہی) مگر اس کے سوا اور نیک باتوں کو عبادت نہ سمجھنا جو ان سے زیادہ مفید ہیں بڑی غلطی ہے۔ کجا یہ مضمون اور کجا یہ اتہام۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ جس قدر عبادات و حسنات خلاف نیچر ہوں ان کو میں نے باطل ٹھہرایا ہے۔

○ مگر جناب یہ نہیں سمجھتے کہ جس قدر نیک عادتیں و حسنات ہیں وہ نیچر یعنی فطرت اللہ کے برخلاف ہیں ہی نہیں۔ کیا جناب سید الحاج عادات خلاف فطرت کو احسن سمجھتے ہیں؟ وہ میرا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ مذہب خدا کا قول اور فطرت خدا کا فعل ہے دونوں ایک ہیں۔

○ کیا جناب سید الحاج کو اس میں شک ہے؟ کیا ان کے نزدیک خدا کہتا کچھ ہے اور کرتا کچھ ہے۔

○ کیا جناب سید الحاج کی خواہش اس کے برخلاف ہے کیا اپنی قوم کو تمام تہذیب یافتہ قوموں کے سامنے حقیر و ذلیل رکھنا چاہتے ہیں؟ کیا ان کی مرضی ہے کہ مسلمان ہمیشہ



ذلیل رہیں اور تربیت یافتہ قوموں کی نگاہ میں ان کی کچھ قدر و عزت نہ ہو؟

جناب سید الحاج میری نسبت الزام لگاتے ہیں کہ میں ترقی قومی کو دیگر حسنات پر ترجیح دیتا ہوں۔

○ جناب سید الحاج بلاشبہ میرا یہ عقیدہ ہے یہی مذہب ہے اور یہی قول ہے اور خدا اسی قول پر میرا خاتمہ کرے کہ بعد ادائے فرض کے کوئی عبادت قومی بھلائی میں کوشش کرنے سے بہتر نہیں ہے البتہ خود غرض نفس کے بندے قومی بھلائی میں کوشش کرنے کو بے فائدہ سمجھتے ہیں۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے تعلیم دینیات کی جو مروج ہے غیر مفید ٹھہرائی ہے اور اس کی دلیل میں میرا یہ قول نقل کیا ہے کہ ’’زمانہ حال میں دینیات کی تعلیم بھی مسلمانوں میں مفید طریقہ پر نہیں ہے۔‘‘

○ اے مسلمانو! انصاف کرو کہ میرے اس قول کا یہ مطلب ہے جو جناب سید الحاج نے نکالا ہے کیا انکا ایسا لکھنا اتہام نہیں ہے؟ اور کیا دیدہ و دانستہ انھوں نے یہ غلط نہیں لکھا ہے کجا طریقۂ تعلیم کو غیر مفید کہنا اور کجا تعلیم دینیات کو غیر مفید کہنا۔

جناب سید الحاج میرا قول نقل کرتے ہیں کہ احکام نیچر (یعنی فطرت اللہ) کبھی نہیں ٹوٹنے کا اور پھر اس پر تفریع فرماتے ہیں کہ مع ہذا احکام حشر و نشر و فنا باطل ٹھہریں گے۔

○ مگر میں نہایت ادب سے عرض کرتا ہوں کہ جناب میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ حضور نے قصداً یا خطاً غلطی فرمائی ہے۔ حشر و نشر و فنا خود نیچر و فطرت اللہ میں شامل ہے جب وہ ہوگا عین نیچر ہوگا افسوس ہے کہ جناب کو نہ قرآن کے لفظ فطرت اللہ کی تحقیق ہے اور نہ انگریزی لفظ نیچر کی۔ مگر قلم پکڑ کر جو دل میں آتا ہے اس کو تحریر فرما دیتے ہیں۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں کل احادیث کی صحت کا انکار کرتا ہوں۔

○ لاحول ولا...... یہ محض غلط اتہام میری نسبت ہے میں خود بیسیوں حدیثوں سے جو میرے نزدیک روایتاً و درایتاً صحیح ہوتی ہیں استدلال کرتا ہوں۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے ایڈیسن اور اسٹیل کو پیغمبر ٹھہرایا ہے۔

○ شاید جناب سید الحاج اس لیے خفا ہوئے کہ میں نے جناب ممدوح کو پیغمبر کیوں نہیں

ٹھہرایا۔ خیر معاف فرمایئے میں جناب ممدوح کا مرتبہ اس سے بھی زیادہ سمجھتا ہوں وہ تو پیغمبران سخن تھے میں سید الحاج کو خدائے بہتان واتہام جانتا ہوں۔

جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میں نے بمقابلہ فلسفیات جدیدہ کے قرآن و حدیث کو بیکار قرار دیا ہے۔

- لعنۃ اللہ......اس قدر کہنا بس ہے کہ کیا فائدہ ہے ایسے اتہامات سے اور کیا نتیجہ جناب سید الحاج نے اس میں سمجھا ہے۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے خاتم الانبیاءؐ کو نیچرلسٹ ٹھہرایا ہے۔

- میں نے تو یہ لفظ نہیں کہا اور اگر جناب سید الحاج نے بنظر تحقیر یہ لفظ جناب خاتم المرسلین کی نسبت ارقام فرمایا ہے تو اس کا مظلمہ خود جناب کی گردن پر ہوگا کیونکہ سید الحاج کے ہم مشرب علماء کی فتوؤں سے پہلے ہی یہ ثابت ہو چکا ہے کہ نبی کی نسبت کلمہ تحقیر کا بلا قصد نقل کرنا بھی کفر ہے۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک علاوہ مذہب اسلام کے دوسرے مذاہب بھی سچے ہو سکتے ہیں۔

- میں نہیں جانتا کہ یہ مطلب جناب سید الحاج نے کہاں سے استنباط فرمایا ہے میرا تو یہ مذہب ہے کہ مذہب اسلام ہی سچا مذہب ہے اور جو مذہب سچا ہوگا اسلام ہی ہوگا۔
- جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک اہل سنت وغیرہ جو فرقے اسلام کے ہیں سب باطل ہیں صرف ملت نیچریہ حق ہے۔
- میں چاہتا ہوں کہ جناب سید الحاج اور ہم دونوں مل کر کہیں کہ لعنت اللہ علی الکاذبین اور ہمارے اور ان کے دوست پکاریں بیش باد۔ معلوم نہیں کہ جناب سید الحاج نے ایسی لغو اور بیہودہ باتوں سے کیا فائدہ سمجھا ہے۔

جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک جو مسئلہ شرعیہ خلاف عقل ومخالف نیچر ہو وہ باطل ہے۔

- معلوم نہیں سید الحاج الٹی راہ کیوں چلتے ہیں یہ کیوں نہیں کہتے کہ میرے عقیدے میں کوئی مسئلہ شریعت حقہ محمدؐ کا خلاف عقل وخلاف فطرت اللہ نہیں ہو سکتا۔



جناب سید الحاج فرماتے ہیں کہ میں نے اصول وفروع اسلام سے اپنے اختلاف کا اقرار کیا ہے۔

- یہ الفاظ تو جناب کے دل کے بخارات ہیں مگر بلاشبہ اس زمانے میں جو مسائل مسلمانوں میں رائج ہیں ان میں سے چند مسائل سے مجھے اختلاف ہے اس لیے کہ وہ مسائل میرے خیال میں خلاف شرع ہیں اصول وفروع سے اختلاف ہونا جو جناب فرماتے ہیں یہ محض اتہام ہے۔

جناب سید الحاج مجھ پر یہ اتہام کرتے ہیں کہ اگر علوم جدیدہ میں مذہب اسلام خلل انداز ہو تو مذہب اسلام کا چھوڑ دینا لازم ٹھہرایا ہے۔

- سبحان اللہ کیا داد سخن فہمی دی ہے۔ جناب یہ مطلب نہیں ہے بلکہ یہ مطلب ہے کہ مذہب اسلام ایسا پختہ ہے کہ کتنے ہی علوم جدیدہ کیوں نہ پڑھائے جاویں مذہب اسلام سے بد اعتقادی نہیں ہو سکتی۔

جناب سید الحاج نے بغیر سوچے سمجھے ان الفاظ سے میرا عقیدہ بیان کیا ہے کہ ذات باری قانون فطرت کو توڑنے یا تبدیل اور تغیر کرنے پر اختیار نہیں ہے۔

- یہ بالکل اتہام محض ہے قانون فطرت کبھی نہیں ٹوٹتا کیونکہ جو کچھ خدا کرتا ہے وہی قانون ہے۔

قول: سوائے عقل کے کوئی رہنما نہیں ہے۔

- بے شک عقل رہنما ہے اور اسلام اور کفر میں جو تمیز کرنے والی ہے وہ بھی عقل ہے۔

جناب نے اس کتاب میں عقل سے کام نہیں لیا اسی واسطے غلطی میں پڑے۔

قول: قانون فطرت یعنی نیچر کے خلاف کوئی امر ظہور میں آنا ممکن نہیں ہے لہٰذ معجزات انبیاء پر یقین لانا صحیح نہ ہوگا۔

- یہ قول جناب کا محض غلط ہے۔ جو شخص کہ فطرت اللہ اور قانون قدرت اور نیچر کے معنی ہی نہ جانتا ہو اس کو دخل در معقولات کا ضرور ہے جناب سید الحاج نے خود اپنی غلطی سے سمجھ لیا ہے کہ معجزات انبیاء خلاف فطرت اللہ یا خلاف نیچر ہیں حالانکہ کوئی معجزہ کسی نبی کا خلاف نیچر اور خلاف فطرت اللہ نہیں ہے صرف ثبوت اس کے وقوع کا

درکار ہے اور جب ثابت ہو کہ فلاں امر واقع ہوا تو بلاشبہ اس پر یقین کیا جاوے گا کہ فطرت اللہ یعنی نیچر کے مطابق ہے گو کہ اس کی ماہیت ہماری سمجھ میں نہ آوے کیونکہ ہزاروں کام نیچر کے ایسے ہیں جن کی ماہیت ہماری سمجھ سے باہر ہے۔ سید الحاج صاحب نے بڑی غلطی کی ہے جو یہ لکھا ہے کہ سب باتیں یعنی معجزات انبیا قانون فطرت کے توڑنے والے ہیں حالانکہ وہ قانون فطرت کے پورا کرنے والے ہیں اور یہ بھی غلطی کی ہے کہ اگر معجزات انبیاء مان لیے جائیں تو عقلیات کے خلاف اقرار کرنا پڑتا ہے حالانکہ یہ محض غلط ہے۔

قول: ملائکہ سے مراد قوائے انسانی سے ہیں۔

- میرا یہ قول ہے کہ ملک کے لفظ کا قوائے انسانی پر بھی اطلاق ہوا ہے اور میں نے کسی ایسے وجود کا جو علاوہ انسان کے ہو ملک کا جس پر اطلاق کیا جاوے انکار نہیں کیا ہے۔

قول: شیطان کا وجود نہیں ہے۔

- شیطان کے وجود کا قائل ہوں مگر انسان میں ہی وہ موجود ہے خارج من الانسان نہیں۔ اگرچہ میرا ارادہ ہے کہ میں اس عقیدے سے رجوع کروں کیونکہ اس زمانے میں بہت سے شیطان مجسم دکھائی دیتے ہیں مگر مشکل یہ ہے کہ اور اکابر بھی وجود شیطان خارج من الانسان کے منکر ہیں۔

قول: قرآن کے معنی جس قدر نیچر اور فلسفہ کے خلاف ہوں اس کو خواہ مخواہ نیچر اور فلسفہ کے اقوال سے ملا دینا چاہیے۔

- یہ ایسی تقریر ہے جیسے کہ ایک جلا ہوا کسی شخص کی اچھی بات کو بھی برا کر کے دیکھتا ہے۔ فلسفۂ قدیم تو ایک لغو چیز ہے اس کے مطابق قرآن کا ہے کو ہونے لگا۔ مگر فطرت اللہ نہایت عمدہ اور مستحکم چیز ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ نہ قرآن اس کے برخلاف ہے اور نہ وہ قرآن کے برخلاف۔

عقیدہ: اس عقیدہ میں نعیم جنت اور وعید دوزخ کو بیان کر کے میرا یہ عقیدہ لکھا ہے کہ یہ سب چیزیں اپنی حقیقت پر محمول نہیں ہیں۔

- جناب کے نزدیک اگر حور کی وہی حقیقت ہے جیسی کہ ایک خوبصورت رنڈی اور غلمان



کی یہ حقیقت ہے جیسے کہ ایک خوبصورت لونڈا تو بلاشبہ میں یہ کہتا ہوں کہ اس حقیقت پر وہ محمول نہیں ہے۔

جناب سید الحاج ارقام فرماتے ہیں کہ میرا یہ عقیدہ ہے کہ بندہ اپنے ہر فعل میں مختار ہے۔ مسئلہ بین الجبر والاختیار کا غلط ہے۔

- اس مطلب کو بھی بگاڑ کر بیان کیا ہے۔ بیشک میرے نزدیک بین الجبر والاختیار تو کوئی چیز نہیں ہے بلکہ انسان اپنی جبلت اور فطرت میں مجبور اور اپنی قدرت میں مختار ہے۔

قول: تقلید کرنا کسی بشر کی کفر اور شرک ہے صحابہ ہوں خواہ اہل بیت خواہ ائمہ اربعہ کسی کی تقلید کرنا نہ چاہیے۔

- جو الفاظ تشدد کے سید الحاج نے ارقام فرماتے ہیں یہ سب دل کے بخارات ہیں میرا تو صرف یہ عقیدہ ہے کہ سوائے رسول خدا کے کسی کی تقلید واجب نہیں ہے اور سوائے رسول خدا کے کوئی شخص ایسا نہیں ہے جس کا قول فعل دینیات میں بلا دلیل و حجت ہو اور جو شخص کسی کو ایسا سمجھے مشرک فی النبوت ہے۔

جناب نے میرا یہ عقیدہ بیان فرمایا ہے کہ جس قدر کتب حدیث و تفسیر فقہ و اصول فی زمانہ پڑھائی جاتی ہیں۔ ان سے سوائے فساد مذہب اور بدتہذیبی اور خرابی دنیا اور عقبیٰ کے کچھ فائدہ نہیں لہٰذا ان کی تعلیم قطعاً موقوفی کے لائق ہے۔

- جو کلمات کہ جناب نے اس عقیدہ میں ارقام فرماتے ہیں وہ تو سب ان کے دل کے بخارات ہیں وہ الفاظ میرے نہیں ہیں۔ ہاں میرے نزدیک یہ بات مسلم ہے کہ علم کلام جو حکمت یونان کے مقابل بنایا گیا تھا اس زمانے میں محض بیکار ہے۔ اور علماء پر فرض ہے کہ علم کلام کو از سرنو اس طرح پر تدوین کریں کہ وہ بمقابلہ حکمت اور علوم جدیدہ کے جو اس زمانے میں رائج ہیں کار آمد ہو۔
- کتب تفسیر میں جو بے سند حدیثیں اور بے سند قصہ اور کہانیاں لکھی ہیں ان میں جو جو بھی غلط ہیں ان کی منقح ضرور ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ قرآن مجید اور احادیث کا پڑھنا صرف عمل کرنے کے لیے مقصود ہے مگر اس زمانے میں اس پر عمل کرنے کے لیے نہیں پڑھا جاتا...... میں کہتا ہوں کہ قرآن و احادیث عمل کرنے کے لیے پڑھو اور جو مسئلہ

اس میں یادَاس پر عمل کرو۔ خواہ وہ شافعی کے مطابق ہو خواہ حنفی کے اور اگر عمل کرنے کے لیے نہیں پڑھتے تو ان کا پڑھنا محض بے فائدہ ہے۔

عقیدہ معراج جسمانی بے اصل ہے صرف خواب میں مسجد اقصیٰ نظر آ گئی تھی۔ اور شق صدر آنحضرتؐ کا بھی بے اصل ہے۔

○ ضد سے ایک شخص دوسرے شخص کی بات کو بگاڑ کر اور اصلیت چھپا کر دوسرے پیرایہ میں بیان کر سکتا ہے۔ اصل اس کی صرف یہ ہے کہ نسبت معراج جناب رسول کے تین مذہب ہیں اول حضرت عائشہ صدیقہ اور بعض صحابہ کا جو اس بات کے قایل ہیں کہ معراج روحانی تھی نہ کہ جسمانی۔

دوسرا مذہب چند اکابرین دین کا ہے اور وہ ہے کہ معراج بیت المقدس تک جسمانی تھی اور وہاں سے ملاءِ اعلیٰ تک روحانی۔

تیسرا مذہب جو سب میں مشہور ہے کہ تمام معراج جسمانی تھی میری یہ رائے ہے کہ جہاں تک اس مسئلہ پر قرآن مجید و احادیث پر غور کیا جاتا ہے تو مذہب حضرت عائشہ صدیقہ کا ٹھیک اور درست معلوم ہوتا ہے۔ وہی مذہب میں نے اختیار کیا ہے۔ اس معاملہ میں جو الفاظ طنز میری طرف کہتا ہے درحقیقت حضرت عائشہ صدیقہ اور بعض صحابہ کی نسبت کہتا ہے۔

شق صدر کی نسبت بھی چند مذہب ہیں بعضوں کا قول ہے کہ پانچ دفعہ شق صدر واقع ہوا۔ اکثروں کا قول ہے کہ ایک دفعہ ایام طفولیت میں واقع ہوا، پادریوں نے ان روایات ضعیفہ غیر معتبرہ کی بنا پر یہ استدلال کیا ہے کہ نعوذ باللہ آنحضرت کو صرع کی بیماری تھی اور حالت صرع میں جو کیفیت واقع ہوتی ہے اسی کو راویوں نے شق صدر تعبیر کیا ہے۔ میں نے ان تمام روایتوں کی بقدر اپنی طاقت کے تحقیقات کی اور معلوم ہوا کہ وہ روایتیں محض نامعتبر ہیں۔ تیسرا مذہب محققین کا یہ تھا کہ واقع شق صدر ایک جزو تھا ان تمام واقعات کا جو شب معراج کو واقع ہوئے تھے۔ یہی روایت میرے نزدیک صحیح و معتبر ہے۔

○



حاشیہ:

(۱) تہذیب الاخلاق، ۱۵/شعبان ۱۲۹۱ھ، ص:۱۳۳

# سرسید کی مخالفتیں

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ عظیم شخصیتوں کو اپنے ابتدائی دور میں سخت مشکلات اور مخالفتوں کا سامنا کرنا پڑا ہے جتنے بھی نئی پیغمبر اور مصلحین دنیا میں آئے ان سب کی یہ مشترک سنت رہی ہے اور حیرت انگیز مماثلت ان کے مخالفین کے رویہ میں پائی جاتی ہے۔ اس کی سب سے اہم اور بنیادی وجہ یہ ہوتی ہے کہ عظیم انسانوں اور مصلحین کی نظریں ماضی، حال اور مستقبل سب دیکھتی ہیں جبکہ زمانہ ان سے محض نابلد ہوتا ہے خاص طور سے وہ لوگ نہیں جانتے جن سے کہ وہ مخاطب ہونا چاہتے ہیں۔ان کی آواز زمانے سے بدلی ہوئی آواز ہوتی ہے اور اکثر جمہور کو انتہائی ناگوار گزرتی ہے۔خاص طور سے بااثر اور صاحب اقتدار طبقہ سب سے پہلے مخالفت شروع کرتا ہے کیونکہ نئے قسم کے خیالات عام ہونے سے اس کے اقتدار کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ لاحق رہتا ہے۔نئے خیالات اور نظریات کے عام ہونے سے عوام الناس کے ذہن ودماغ سے پہلے سے موجود صاحب اقتدار طبقے کی عزت و وقار جاتا رہتا ہے اور نتیجتاً ان کا اثر سماج پر سے ختم ہو جاتا ہے یہی سب کچھ سرسید کے ساتھ پیش آیا۔سرسید کے مخاطب ہندوستان کے مسلمان تھے اور مسلمانوں پر مذہبی علماء کا طبقہ حکومت کررہا تھا لہٰذا اسی طبقہ کی طرف سے پہلے مخالفت شروع ہوئی۔کچھ نے ناسمجھی میں حمایت اسلام کے نام پر جوش پکڑا اور بہت سے ایسے بھی تھے جو انگریزوں سے سازباز کیے ہوئے تھے۔اس طبقہ نے مجموعی طور سے اس بات کی کوشش کی کہ سرسید کی تحریک کو شروع ہی میں خاک میں ملادیں لیکن وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے اور سرسید کی کوششیں کامیابی سے ہمکنار ہوتی چلی گئیں۔حتیٰ کہ کفر وارتداد کا فتویٰ لگانے والوں تک کو نئی تعلیم کی افادیت اور اہمیت کو تسلیم کرنا پڑا۔



ہماری باتیں ہی باتیں تھیں سید کام کرتا تھا
نہ پوچھو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں

لیکن سرسید کی مذہبی تصنیفات کے سلسلے میں اتنا غل ڈالا گیا کہ سرسید کو اپنے تعلیمی مشن کو جاری کرنے کے لیے اپنے مذہبی خیالات کو نظرانداز کردینا پڑا اس امید پر کہ شاید کوئی وقت آئے جب میری مذہبی تحقیقات مسلمانوں میں بحث کا موضوع بنیں اور امت اس سے مستفید ہو۔اس وقت اپنے دینی خیالات اور تحقیقات پر زور دے کر سرسید اپنے تعلیمی مشن کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتے تھے نتیجتاً آج سرسید کے مذہبی نظریات پر ایک دبیز پردہ پڑا ہوا ہے اور دینی علوم اصول تفسیر علم کلام وغیرہ میں سرسید کسی بڑی اصلاح کے کرنے میں ناکام رہے۔مذہبی علماء سے صلح کرنے کے لیے ان کو اپنے مذہبی نظریات اور تحقیقات کی تشہیر سے ہاتھ اٹھانا پڑا لیکن کیا سرسید اس قربانی کو دینے کے باوجود علماء کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب رہے؟ یہ ایک بہت اہم سوال ہے اور اس کا جواب نفی میں ہے۔اس کے برخلاف آج تک وہ فتوے واپس نہیں لیے گئے جو سرسید کے خلاف لگائے گئے تھے اور جو سرسید کو ملحد، نیچری، کافر دجال وغیرہ قرار دیتے ہیں۔آج بھی اکثر علماء کا رویہ سرسید کے تئیں ہتک آمیز خاموشی کا ہے اور زیادہ سے زیادہ جو گنجائش وہ سرسید کو دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ اب ان کے معاملے پر خاموش رہتے ہیں اور ان کے کفر پر اصرار نہیں کرتے۔

سرسید کے مشن کی سب سے زیادہ مخالفت خود مسلمانوں کی طرف سے ہوئی لیکن حکمراں انگریزوں کے ایک بہت بااثر طبقے اور بعد کے دور میں برادران وطن کی مخالفتیں بھی سرسید کو برداشت کرنی پڑیں۔انگریزوں میں ولیم میور اور ان کے ہمنواؤں کے علاوہ ایک طبقہ ایسا بھی تھا جو کہ سرسید کے مشن کو انگریزی حکومت کے لیے خطرہ کی گھنٹی سمجھتا تھا اور ان کو علی گڑھ کالج سے ''بغاوت کی بو'' آتی تھی۔خود علی گڑھ کا ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کالج کے لیے زمین دینے پر راضی نہ تھا اور بہت زمانہ تک مخالفت کرتا رہا۔سرسید کے دو بڑے مخالفین مولوی امداد علی اور مولوی علی بخش خاں بھی انگریز حکومت میں ملازمت کرتے تھے اور اہم عہدوں پر فائز تھے انکی مذہبی مخالفتوں کے پس پشت ذاتی رنجشوں کے علاوہ بہت سے انگریز افسران کا بھی ہاتھ تھا۔سرسید کے مذہبی عقائد کے سلسلے میں جتنی بھی افواہیں پھیلائی گئیں

انہی دونوں حضرات کا کرشمہ ہیں حتیٰ کہ آج تک کچھ بڑے بڑے علماء بھی بغیر کسی تحقیق کے مولوی علی بخش خاں اور مولوی امداد علی کے لگائے ہوئے الزاموں کو دہراتے رہتے ہیں۔

## مخالفت کے اسباب

ایک عام خیال یہ پایا جاتا ہے کہ سرسید کے مذہبی عقائد کی وجہ سے ان کی مخالفت ہوئی گویا سرسید سے پہلے مسلمان تعلیم حاصل کرنے میں مشغول تھے اور سرسید کے گمراہ عقائد کی وجہ سے اس راستہ سے ہٹ گئے۔ اس بات کی عام تشہیر کی گئی ہے کہ چونکہ سرسید کے عقائد درست نہیں تھے لہٰذا ان کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کی گئی۔ یعنی اگر سرسید کے عقائد ٹھیک ہوتے تو تمام علماء ان کا دل سے ساتھ دیتے۔ تاریخ میں ایسے بہت سے واقعات ملتے ہیں کہ غلط عقیدے والے مسلمان کے ساتھ یہ حضرات کام نہیں کر سکتے چاہے مشرکین کے ساتھ کام کر لیں۔ غیرت ایمانی کا تقاضہ یہ ہے کہ عقیدہ میں ذرہ برابر خرابی برداشت نہ کریں اور ایسے شخص کی مخالفت میں زمین آسمان ایک کر دیں۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کی مخالفت کو دینی حمیت اور جوش اسلامی کی حیثیت دی گئی ہے۔ یہ خیال حقیقت سے بہت دور ہے اور تاریخ کی گواہی اس مفروضہ کے خلاف جاتی ہے کہ علماء سرسید سے بہت پہلے ہی سے انگریزی و سائنسی تعلیم کو اسلام کے منافی خیال کرتے تھے اور وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس تعلیم سے مسلمان عیسائی بن جائیں گے۔ چنانچہ ۱۸۳۵ء میں سرسید کی تحریک کے آغاز سے ۲۵ سال پہلے جب حکومت نے انگریزی تعلیم پھیلانے کے لیے اقدامات کرنے چاہے تو تقریباً آٹھ ہزار علماء اور روسا نے حکومت میں عرضی ارسال کی کہ حکومت کا انگریزی تعلیم پر زور دینا ثابت کرتا ہے کہ وہ مسلمانوں کو عیسائی بنانا چاہتی ہے۔

> ”کلکتہ کے مسلمانوں نے جب یہ سنا کہ گورنمنٹ تمام ہندوستان میں انگریزی تعلیم پھیلانا چاہتی ہے تو انھوں نے ایک عرضی تیار کی جس پر آٹھ ہزار عالموں اور رئیسوں کے دستخط تھے اور جس کا ماحصل یہ تھا کہ گورنمنٹ کا انگریزی تعلیم پر زور دینا صاف دلالت کرتا ہے کہ اس کا ارادہ ہندوستانیوں کو عیسائی بنانے کا ہے۔“[1]



حالانکہ شاہ عبدالعزیز پہلے ہی یہ فتویٰ دے چکے تھے کہ انگریزی علوم حاصل کرنا جائز ہے لیکن یہ فتویٰ خود علماء کے طبقہ میں قبول عام کا درجہ نہ حاصل کر سکا بلکہ اس فتوے کی کوئی حیثیت ہی نہ رہی۔ اس فتویٰ کی موجودگی سے ایک بڑے عالم نے اپنی کتاب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ علماء سائنس کی تعلیم کے مخالف نہ تھے۔ اگر ایسا ہے تو اس زمانہ کا ذکر چھوڑیے آج دینی مدارس میں ذرا کچھ انگریزی اور بنیادی سائنس کے چند مضامین شامل کرا لیجیے؟ آج جب یہ حال ہے تو اس زمانہ میں یعنی آج سے سو سال سے بھی زیادہ پہلے اگر علماء اور ان کے اثر میں عوام الناس انگریزی زبان اور علوم کے حاصل کرنے کو اسلام کے لیے انتہائی نقصان دہ سمجھتے تھے تو کیا غلط کرتے تھے؟ لہٰذا یہ کہنا کہ سرسید کی مخالفت ان کے مذہبی خیالات کی وجہ سے ہوئی سراسر غلط ہے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ جیسے جیسے سرسید کے مذہبی عقائد لوگوں کے سامنے آتے گئے مخالفین نے اس میں ترمیم کر کے ان کو طرح طرح کے ہتھیاروں کی مثل استعمال کیا۔ ایسا نہ تھا کہ پہلے علماء ان کے تعلیمی مشن کے حامی تھے اور ان کے مذہبی خیالات پتہ چلتے ہی ان سے دور ہوتے چلے گئے۔ بلکہ یہ سلسلہ اس کے بالکل برعکس ہے کہ یہ لوگ تعلیمی تحریک بلکہ مسلمانوں میں کسی بھی طرح کی اصلاحی تحریک کے پہلے سے مخالف تھے اور سرسید کے مذہبی خیالات کو بہانہ بنا کر ان پر کافر ملحد زندیق وغیرہ کی اصطلاحیں بھی نافذ کر دی گئیں کہ ان کی مخالفت اسلامی حمایت کی تحریک سمجھی جائے۔

جہالت کا اندھیرا اس قدر دبیز تھا کہ عیسائیوں کے ساتھ کھانا کھانے والے بھی کرسٹان قرار دیے جاتے تھے۔ چنانچہ سرسید نے انگلستان جانے سے پہلے کہ اس وقت تک سرسید کے ذہن میں تعلیمی تحریک کا خاکہ بھی مکمل نہ ہوا تھا۔ رسالہ احکام طعام اہل کتاب لکھ کر شائع کیا تو ان کو کرسٹان کا خطاب دیا گیا اور مسلمانوں کے اخباروں میں مشتہر کیا گیا کہ سرسید کرسٹان ہو گئے۔ انگلستان جانے سے کچھ دن پہلے سرسید نے یہ معمول باندھ لیا تھا کہ اپنے ایک پڑوسی انگریز کے ساتھ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے۔ ایک دن محسن الملک سید مہدی علی خاں سرسید کے گھر پہنچے تو وہ انگریز کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ یہ پہلی دفعہ تھا کہ انھوں نے ایک مسلمان کو انگریز کے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے دیکھا تھا انہیں سخت نفرت ہوئی اور باوجود اصرار کے کھانا نہیں کھایا لیکن دوسرے

وقت سرسید کے اصرار پر شرعاً ممنوع نہیں ہے انھوں نے پہلی بار انگریز کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ یہ خبر الہ آباد میں ایک دوست کو ملی تو انھوں نے سید مہدی علی خاں سے استفسار کیا۔ سید مہدی نے مفصل واقعہ نقل کر کے ان کو بھیج دیا۔ آخر یہ خبر اٹاوہ پہنچی تو پورے اٹاوہ میں اعلان کر دیا گیا کہ مہدی علی کرسٹان ہو گئے۔

''بھائیو! افسوس ہے مولوی مہدی علی کرسٹان ہو گئے جو سنتا تھا افسوس کرتا تھا اور کہتا تھا خدا سید احمد خان پر لعنت کرے۔''۲

خبر کے مشہور ہوتے ہی ان کے گھر کا سوشل بائیکاٹ شروع ہو گیا عزیز رشتہ داروں اور خدمت گاروں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔

''اس خبر کا مشہور ہونا تھا کہ مولوی صاحب کے گھر پر حلال خور نے کمانا سقے نے پانی بھرنا اور سب لگے بندھوں نے آنا جانا چھوڑ دیا۔''۳

سید مہدی علی خاں نے اٹاوہ جا کر لوگوں نے سمجھایا کہ میں کرسٹان نہیں ہوا ہوں بلکہ تمہاری ہی طرح مسلمان ہوں تو لوگ راضی ہوئے۔

مندرجہ بالا واقعات سے چند باتیں واضح ہو جاتی ہیں:

(۱) سرسید کی تعلیمی تحریک کی شروعات سے پہلے ہی مسلمان انگریزی تعلیم حاصل کرنا غلط سمجھتے تھے۔

(۲) انگریزوں سے کسی بھی طرح کا میل جول حتیٰ کہ ان کے ساتھ کھانا کھانے کو غیر شرعی سمجھتے تھے اور ایسا کرنے والا ان کے نزدیک عیسائی ہو جاتا تھا۔

(۳) تعصب اور جہالت کے سبب غیر اسلامی اخلاق و عادات کو قطعی اسلامی سمجھتے تھے

دوران سفر انگلستان سرسید سفر کے حالات سائنٹفک سوسائٹی کو لکھ کر بھیجتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک بار لکھا:

''میں نے اور میرے ساتھیوں نے ان دونوں قسم کے گوشتوں کے کھانے میں کچھ تامل نہیں کیا اور خوب مزیدار گوشت مٹن، بیف اور مرغ و کبوتر کھائے۔''

اس تحریر کا چھپنا تھا کہ مخالفین کو ایک اور ہتھیار سرسید پر ہاتھ صاف کرنے کو ملا اور



عیسائیوں کے ہاتھ کی گردن مروڑی مرغی کھانے کو انھوں نے سرسید کے کافر ہونے کا بہت بڑا ثبوت قرار دیا۔ مسلمانوں کے تمام اخباروں اور رسائل میں سرسید کی گردن مروڑی مرغی کھانے والا کافر کہہ کر لمبے لمبے مضامین چھاپے گئے۔ کانپور، الہ آباد، رامپور، دہلی، آگرہ، لکھنؤ وغیرہ شہروں سے نکلنے والے اخبارات تمام کے تمام سرسید کی ان تحریروں کے خلاف جو سائنٹفک سوسائٹی کے اخبار میں چھپتی تھیں کالم کے کالم سیاہ کرتے تھے جس میں کوئی عیب برائی اور الزام ایسا نہ تھا جو سرسید کی ذات سے منسوب نہ کیا جاتا ہو۔ لندن سے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''اگرچہ میری اس دلسوزی کو میرے ہم وطنوں نے ناپسند ہی نہیں کیا بلکہ الٹا سمجھا اور کوئی الزام اور عیب اور برائی اور سخت کلامی نہیں چھوڑی کہ علانیہ اور خفیہ میری نسبت منسوب نہ کی ہو مگر چونکہ میری دلسوزی اپنے ہم وطنوں یا ہم قوموں سے کسی صلہ کی توقع پر نہ تھی بلکہ اس کا اجر خدا سے لینا ہے اس لیے میرے ہم وطنوں نے کوئی بات جو میرے ساتھ کی مجھ کو ناگوار نہیں گزری اور خدا نے مجھ کو اپنے ارادہ پر مستحکم رکھا۔ نہ کانپور کی مہیب آواز سے رنج ہوتا ہے نہ لکھنؤ کی نغمہ سرائی سے دل دکھتا ہے۔ نہ الہ آباد اور آگرہ کی لطف آمیز باتیں رنج دلاتی ہیں نہ مرادآباد اور رام پور کے فتوے اور دہلی کے اہل جبہ و خانقاہ حاجیان حرمین شریفین کی گفتار و رفتار دل کو دکھاتی ہے۔ عام بھلائی کے جوش نے کسی دوسری چیز کے سمانے کی دل میں جگہ نہیں چھوڑی۔''۴

## سرسید کا بائیکاٹ

قیام انگلستان میں ہی سرسید کو ان مخالفتوں کا اندازہ ہو گیا تھا جو وطن آ کر انہیں جھیلنی تھیں مگر انہیں اپنے مشن کی سچائی اور صداقت پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ لوگوں کی سخت سست باتیں اور ہر طرح کی مخالفتیں بھی ان کو اس راہ سے نہ ہٹا سکیں جو انھوں نے مسلمانوں کی

اصلاح کے لیے اختیار کی تھی۔ یہ خیال رہے کہ ابھی تک سرسید کے ان مذہبی عقائد کا ذکر نہیں آیا تھا جن کے لیے کہا جاتا ہے کہ ان کی وجہ سے سرسید کی تحریک کی مخالفت ہوئی۔ سرسید ابھی لندن میں ہی تھے اور لائف آف محمد کا جواب بعنوان ''خطبات احمدیہ'' لکھنے میں مصروف تھے وہاں کے طریقۂ تعلیم کا بغور مطالعہ کر رہے تھے آکسفورڈ اور کیمبرج کی لائبریریوں کو کھنگال رہے تھے اور وہاں کے طلبہ و اساتذہ سے ملاقاتیں کر رہے تھے۔ ابھی کالج کی اسکیم اور تہذیب الاخلاق کا نام و نشان تک بھی نہ تھا کہ ہندوستان میں علماء اور اس کے نتیجہ میں عوام کی مخالفت کا جوش بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ لندن سے واپس جب آئے تو ان کا استقبال مخالف مضامین اور اشتہارات نے کیا جن میں لکھا گیا تھا کہ کوئی شخص سید احمد سے نہ ملے اور جو ایسا کرے گا اس کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا۔

> ''جب سرسید لندن سے واپس آئے اور الہ آباد پہنچے تو ان کو معلوم ہوا کہ اضلاع شمال مغرب اور دہلی میں اس مضمون کے خطوط اور اشتہار جاری ہوئے ہیں کہ کوئی سید احمد سے نہ ملے اور نہ ان کے ساتھ کھانا کھاوے اور جو ایسا کرے گا وہ دائرہ اسلام اور جماعت اہل اسلام سے خارج ہو جائے گا۔''۵

لہٰذا ان کے آنے کے بہت دنوں کے بعد تک لوگ سرسید کے ساتھ کھانا کھانے تک سے پرہیز کرتے تھے لیکن رفتہ رفتہ پرہیز ختم ہوتا چلا گیا اور مسلمانوں نے نہ صرف سرسید بلکہ انگریزوں کے ساتھ بھی کھانا پینا شروع کر دیا اور میز کرسی کا استعمال ہونے لگا۔ لیکن ان مخالفتوں کو حالی ایک چھیڑ چھاڑ اور نوک جھونک سے منسوب کرتے ہیں۔ بمقابلہ ان مخالفتوں کے جو آگے چل کر سرسید کی ہوئیں۔ تہذیب الاخلاق اور کالج کی اسکیم لوگوں کے سامنے آتے ہی مخالفت کا ایک مہیب طوفان اٹھ کھڑا ہوا جس نے پورے مسلم معاشرہ کو اپنے اندھیرے میں ڈبو دینا چاہا لیکن تہذیب الاخلاق کی روشن کرن رفتہ رفتہ آفتاب بن گئی اور تمام مسلمانوں کو حق اور سچائی کا راستہ صاف صاف نظر آنے لگا۔ یہ ساری مخالفتیں اسلام کے نام پر ہوئیں اور نامی نامی علماء اس میں پیش پیش رہے حتیٰ کہ مکہ و مدینہ کے علماء بھی اس مخالفت میں شریک رہے اور سرسید کے واجب القتل ہونے تک کے فتوے صادر کیے



گئے۔ سرسید کی تحریروں اور تقریروں سے ایک کیس ان کے خلاف بنایا گیا اور بہت سی ایسی باتیں بھی سرسید سے منسوب کی گئیں جو ان کے وہم و گمان میں بھی نہ تھیں۔ آج ہمیں غور کرنا چاہیے کہ خدانخواستہ اگر مخالفین سرسید کامیاب ہو جاتے یا سرسید ان مخالفتوں سے گھبرا کر اپنے گھر بیٹھ رہتے یا تعلق دار بننا منظور کر لیتے تو کیا ہوتا؟ سرسید کا ذاتی نقصان کچھ بھی نہ ہوتا بلکہ وہ بہت فائدے میں رہتے اور بجنور میں جاگیردار بن جاتے لیکن ہاں ہندوستانی مسلمان جدید علوم اور سائنس سے ناواقفیت کی بنا پر بجز خدمت گار مثل قلی و چپراسی کے کچھ نہ رہ جاتے۔ لوگوں نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو بہکانے کی جو کوششیں کیں چاہے نا سمجھی میں کی ہوں یا وہ مخلص ہی رہے ہوں اس کا جو نتیجہ نکلتا وہ یقینی طور سے اسلام کی ہندوستان کی تاریخ میں سب سے بڑی دشمنی ہوتی۔ خلوص اور نیک نیتی کوئی ہوا میں تیرنے والا جذبہ نہیں ہے اس کا اظہار عملی زندگی میں ہونا چاہیے۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں نے آپ کو خودکشی کا مشورہ خلوص میں دیا ہے یا میری کم عقلی تھی۔ زہر کو تریاق سمجھ کر پلانے والے پر بہر حال قتل کا الزام عائد ہوگا۔ ہندوستان کے مسلم سماج میں آج بھی وہی صورت حال ہے جو اس زمانے میں تھی۔ وہی سائنس اور جدید علوم سے بیزاری اور پرانے فلسفہ اور طریقۂ تعلیم کو بذات خود مذہب سمجھنا عام مسلمانوں کا آج بھی وہی انداز فکر ہے علماء نئے زمانے کے چیلنجوں کا مقابلہ کرنے سے کتراتے سے نظر آتے ہیں انہیں خوف ہے کہ نئے علوم اور مذہب میں ٹکراؤ سے شاید نئے علوم حاوی ہو جائیں۔ یہ خوف جب تک دور نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان نئے علوم کی حقیقت دریافت کرنے کے لیے ان کو پوری طرح نہ سمجھ لیں پھر یہی علوم اسلام کی حقانیت ثابت کرنے کا ذریعہ بن سکتے ہیں۔

## خاص مخالفین

سرسید کی مخالفت کرنے والوں کی قیادت دو حضرات کر رہے تھے ایک مولوی امداد علی اور دوسرے مولوی علی بخش خاں۔ دونوں انگریزی حکومت کے ملازم تھے ایک کانپور میں ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے گورکھپور میں سب جج۔ مذہبی عقائد میں دونوں ایک دوسرے کی ضد تھے پہلے سخت قسم کے وہابی اور دوسرے سخت قسم کے بدعتی لیکن مدرسہ کی مخالفت میں دونوں

ہم زبان تھے۔ ہندوستان میں جتنی بھی مخالفتیں سرسید کی ہوئیں ان کا مرکز ہی دونوں حضرات تھے ان دونوں حضرات کی مخالفت شخصی بغض وعناد کی حیثیت رکھتی تھی اسلامی حمیت و جوش سے اس کا کچھ تعلق نہ تھا اور بہت سے انگریز دوستوں کو خوش کرنا مقصود تھا جو سرسید کے اس مشن کے سخت مخالف تھے کہ ان کی نظر میں یہ تحریک انگریز حکومت کے لیے مستقبل میں خطرہ بن سکتی تھی۔

''اگر ان کی مخالفت کا باعث مذہبی جوش اور حمیت اسلامی ہوتی تو ان کا کام نہایت تعریف کے لائق ہوتا مگر افسوس ہے کہ مسلمانوں کی تمام مخالفتوں کی طرح ان کی مخالفت بھی محض ذاتیات پر مبنی تھی جس کے بیان کرنے کی یہاں ضرورت نہیں۔ ایک اور وجہ ان کی مخالفت کی یہ تھی کہ بعض جلیل القدر انگریز مدرسۃ العلوم کے سخت مخالف تھے اور ان میں سے بعض کے ساتھ ان دونوں صاحبوں کو خاص تعلق تھا اس لیے سرسید کی مخالفت کو انھوں نے ایک ذریعہ ان کی خوشنودی اور اپنی سرخ روئی کا سمجھا تھا۔''۶

بہت سے اخبارات نے اپنی پالیسی محض اس وجہ سے سرسید کے خلاف رکھی کیونکہ وہ دیکھ رہے تھے کہ عام طور سے مسلمانوں کا رجحان سرسید کے خلاف ہے اس لیے وہ بھی اپنے اخبارات کی اشاعت بڑھانے کے لیے اس راستہ پر چل نکلے۔ سرسید کے خیالات کی مخالفت میں اخبارات اور رسائل کی بھرمار ہوگئی اور خاص طور سے ان کی کتابوں کے رد میں رسائل تصنیف کیے گئے کہ یہ مالی منفعت کا ذریعہ تھا۔ نور الآفاق نور الانوار، لوح محفوظ ستر ہویں صدی، امداد الآفاق، شہاب ثاقب اور تائید اسلام وغیرہ رسائل شائع ہونے شروع ہوئے۔ سرسید کو ملحد، لامذہب، کافر، دجال، کرسٹان، نیچری اور کیا کیا نہ خطاب دیے گئے ان کے کفر پر ہر شہر سے مولویوں کے دستخط کرائے گئے۔ معدودے چند مولویوں کے تمام ہی سرسید کے کفر پر متفق تھے جن لوگوں نے اس مسئلے پر خاموشی اختیار کی ان کو بھی کافر کہا گیا کہ جو سرسید کو کافر نہ مانے وہ بھی کافر۔

عام طور سے سرسید مخالفت میں چھپے مضامین کا جواب نہیں دیتے تھے لیکن دوستوں



کے مجبور کرنے پر اور اس بات کے پیش نظر کہ کہیں خاموشی کو اقرار نہ سمجھا جائے۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق میں ''دافع البہتان'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔ یہ مضمون مولوی علی بخش کی کتاب تائید اسلام کے جواب میں لکھا تھا آخری چند لائنیں سرسید کے ظریفانہ جواب کا عمدہ نمونہ ہیں۔

''جو کوئی میری اس تحریر کو دیکھے گا تعجب کرے گا کہ جناب سید الحاج نے کیوں ایسے سخت اور بعض غلط بہتان مجھ پر کیے ہیں؟ ظاہراً اس کا سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ جناب سید الحاج نے جب یہ رسالہ لکھا ہے قریب اسی زمانے کے حج کو تشریف لے جانے والے تھے۔ انھوں نے خیال کیا ہوگا کہ لاؤ حج کو تو جاتے ہی ہیں جتنے گناہ کرنے ہیں سب کر لیں حج کے بعد تو پاک ہو ہی جائیں گے...... مگر جناب سید الحاج کو معلوم ہونا چاہیے کہ گو حج میں سب گناہ آپ کے معاف ہو گئے ہوں اور شبلی وجنید کے مرتبہ پر آپ پہنچ گئے ہوں مگر حق العباد نہ حج سے بخشے جاتے ہیں نہ کسی بشارت سے آپ نے جو اتہام مجھ پر کیے ہیں جب تک میں ہی نہ معاف کر دوں معاف نہیں ہو سکتے پس متقاضائے ایمان یہ ہے کہ آپ حج دراحمد کا احرام باندھئے اور گناہوں کی معافی چاہیے ورنہ روز جزا اپنے کرتوتوں کا مزا آپ کو معلوم ہو جائے گا۔''۷

وہ تمام الزامات جو مولانا علی بخش خاں نے سرسید پر اپنی کتاب ''تائید اسلام'' میں لگائے سرسید ان کو محض تہمت قرار دیتے ہیں مگر پھر بھی وہ اپنے خیالات پر جو سرسید کے بارے میں انھوں نے جمالئے تھے ڈٹے رہے کہ نہیں حضور ہم کہہ رہے ہیں کہ آپ کے اعتقادات ایسے اور ایسے ہیں وہ صحیح ہے۔

''ہم کو ملحد اور زندیق اور لامذہب کہنا کچھ تعجب نہیں ہے کیونکہ ہماری قوم نے خدائے واحد ذوالجلال کے سوا باپ دادا کے رسم ورواج کو اور اپنے قدیمی چال چلن کو دوسرا خدا مانا ہے اور پیغمبر آخر الزماں محمد

رسول اللہؐ کے سوا بہت سے پیغمبر پیدا کیے ہیں............کتاب اللہ کے علاوہ انسانوں کی بنی ہوئی بہت سی کتابوں کو قرآن بنایا ہے اور ہم اس جھوٹے خدا اور فرضی پیغمبروں اور جعلی قرآنوں کو ایسا ہی برباد کرنے والے ہیں جیسے ہمارے جد امجد ابراہیم اپنے باپ آذر کے بتوں کو توڑنے والے تھے ہم سچے خدائے واحد کا جلال اور سچے پیغمبر محمد رسول اللہ کی نبوت اور سچی کتاب اللہ کی اطاعت دنیا میں قائم کرنا چاہتے ہیں پھر وہ لوگ ہم کو ملحد زندیق اور لامذہب نہ کہیں اور نہ سمجھیں تو کیا کہیں اور کیا سمجھیں؟ کیونکہ ہم ان کے خداؤں ، پیغمبروں اور قرآنوں کو نہیں مانتے۔''

دراصل دنیائے اسلام اور خاص طور سے ہندوستان میں ہم نے رسول اور قرآن کے علاوہ بہت سے علماء کرام کو اور ان کی لکھی ہوئی کتابوں کو خدا اور قرآن کا درجہ دے دیا ہے کہ ان سے اتفاق نہ کرنا خدانخواستہ اسلام سے اختلاف سمجھا جاتا ہے۔ سرسید نے ان خیالات سے اتفاق نہیں کیا اور نتیجتاً کافر اور ملحد قرار پائے۔

سرسید کو ان الزامات کا مطلق افسوس نہ تھا مگر اسلام کے نام پر جھوٹ اور مکر وفریب پھیلانے پر وہ افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے۔

''مگر طرفہ تماشہ یہ کہ ہم کرسٹان بھی کہتے ہیں......ہم کو اپنی قوم کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ اب ہماری قوم کا یہ حال ہوگیا ہے کہ اعلانیہ جھوٹ بولنے اور جھوٹ چھاپنے میں کچھ شرم وحیا نہیں آتی۔ قومی ہمدردی جو خدا کی ایک بڑی نعمت ہے خدا نے ہماری قوم کے دل سے کیسی مٹادی ہے اس شخص کو یہ بھی غیرت نہ آئی کہ میں ایک مسلمان کی نسبت کس دل اور غیرت سے ایسی جھوٹ بات چھاپ دوں۔ ان باتوں سے ہم کو بہ لحاظ اپنی ذات کے کچھ بھی رنج نہیں ہوگا مگر جو رنج وغم وافسوس ہوتا ہے وہ یہی ہوتا ہے کہ افسوس ہماری قوم پر خدا کی کیسی خفگی ہے جو ایسی حالتوں میں گرفتار ہے۔''۸



## سرسید کے خلاف فتوے

جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا سرسید عیسائیوں کے ذبیحہ کو جائز قرار دیتے تھے اور انگریزوں کے سامنے بیٹھ کر کھانے میں ان کے نزدیک کوئی برائی نہ تھی لیکن اس کے برخلاف دینی علماء کرام کا یہ حال تھا کہ انگریز سے اگر ہاتھ ملانا پڑ جاتا تو جب تک اس کو رگڑ رگڑ کر دھو نہ لیتے نجس خیال کرتے تھے۔ انگریزوں کے مقابلہ میں کتوں اور جانوروں تک کو اچھا خیال کرتے تھے۔ سرسید نے قرآن وحدیث اور فقہی روایات کی روشنی میں یہ ثابت کیا کہ عیسائیوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا چاہے انہیں کا ذبح کیا ہوا ہو سراسر جائز ہے بشرطیکہ دسترخوان پر شراب اور خنزیر کا گوشت اور کوئی دوسری حرام چیز نہ ہو۔ اس میں انھوں نے شاہ ولی اللہ کے فتویٰ سے بھی استدلال کیا تھا۔ یہ خیالات بالکل نئے تھے اور جیسا کہ پہلے ذکر آچکا اس کی شدید مخالفت ہوئی۔ مولوی امداد علی نے سرسید کے رسالہ ''احکام طعام اہل کتاب'' کے رد میں رسالہ ''امداد الاحتساب'' تالیف کیا اس میں انھوں نے سرسید کے خیالات کو باطل ثابت کرنے کی کوشش کی اس کے علاوہ ایک مختصر رسالہ ''مظاہر الحق'' لکھا اس کا مقصد مولف کے الفاظ میں:

''سید امداد علی اکبرآبادی کہتا ہے کہ جناب سید احمد خاں صاحب نے احکام طعام اہل کتاب میں جو مداہنت کا کام فرمایا تھا اس خیر خواہ انام نے امداد الاحتساب میں شرح بسیط اس مداہنت کو ظاہر کیا۔ اب یہ رسالہ بطرز مختصر کہ نام اس کا تاریخی مظاہر الحق ہے منع مواکلت میں ساتھ اہل کتاب کے عام فہم لکھا جاتا ہے اور اس میں بیان کرنا چند اغلاط جناب سید احمد خاں صاحب کا اس مراد سے کہ لوگ علم اور فضل ان کا اور بے احتیاطی ان کی دریافت کرکے احکام طعام اہل کتاب میں دھوکہ نہ کھائیں۔''۹

۱۸۷۰ء میں سرسید نے تہذیب الاخلاق کے ذریعہ اپنے تعلیمی خیالات نیز مذہبی خیالات کہ جن کی وہ ضرورت محسوس کرتے تھے کا اظہار کرنا شروع کیا۔ یہ رسالہ ان کی

تحریک کا ترجمان تھا اس کی مخالفت میں بہت سے پرچے نکلے اس میں ایک ''نورالآفاق'' پندرہ روزہ پرچہ تھا اس کا اولین شمارہ ۳۰ راگست ۱۸۷۰ء کو شائع ہوا۔ اس کی اشاعت کی غرض وغایت ان الفاظ میں ظاہر کی گئی تھی۔

''ان دنوں ہندوستان میں ایک قرن شیطانی ہوا، جس کے سبب سے عجب فتنہ ہویدا ہوا۔ درالحاد بار ہوا۔ دنبالۂ زمادقہ دراز ہوا۔ نچلی پینے کی عادت کے ساتھ سیرت انبیاء کی اہانت ہونے لگی۔ یہ تحریف کتاب سنت ائمہ دین پر بغاوت ہونے لگی۔ شعار اسلام، رسوم کفر قرار دیے گئے، گمراہی کے طریقے ٹھیٹ اسلام شمار کیے گئے۔ الحادی باتوں کے شائع کرنے کو ایک نیا پرچہ ایجاد کیا اور بمصداق مصرعہ برعکس نہد نام زندگی کافور وتہذیب الاخلاق نام نہاد کیا۔ پس حامیان اسلان کی طرف سے جواب شبہات ان ملاحدہ کا قلم بند ہونا اور اس کا شائع ہونا مناسب ہوا۔''۱۰

اس وقت کے دینی علماء کرام کو پورا یقین ہوگیا تھا کہ سرسید دائرہ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں۔ سرسید کے کفر وارتداد کے مجموعی طور سے تین فتوے ہیں جن پر ہر طبقہ فکر کے دینی عالموں نے اپنی رائے زنی فرماتے ہوئے سرسید کے کفر پر سند دی ہے۔

''مولوی امداد علی نے جو تین استفتے ہندوستان کے تمام بڑے بڑے شہروں میں بھیج کر سرسید کے کفر وارتداد کے فتوے حاصل کئے تھے ان میں سے ایک استفتا اس مضمون کا تھا کہ جس شخص کے ایسے اور ایسے عقائد واقوال وافعال ہوں وہ مسلمان ہے کہ نہیں؟ اور دوسرا اس مضمون کا تھا کہ جو مدرسہ ایسا شخص فلاں فلاں اغراض سے قائم کرنا چاہتا ہے اس میں چندہ دینا اور اس کی اعانت کرنی مسلمانوں کو جائز ہے کہ نہیں؟ اور تیسرا اس تاریخ ہندوستان کے ترجمہ کرانے کی بابت تھی جس میں مصنف نے آنحضرت کی نسبت اپنے عقیدہ کے موافق سخت اور نا ملائم الفاظ لکھتے تھے۔ یہ تمام فتوے



اور استفتۓ مولوی امداد علی نے اپنے ایک رسالہ کے آخر میں جس کا نام ''امداد الآفاق برجم اہل النفاق بجواب پرچۂ تہذیب الاخلاق'' ہے چھاپ کر اس رسالہ کو تمام ہندوستان میں مفت تقسیم کیا تھا۔ اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے جتنے فرقے ہندوستا میں ہیں کیا سنی کیا شیعہ کیا مقلد کیا غیر مقلد کیا وہابی کیا بدعتی سب فرقوں کے مشہور اور غیر مشہور عالموں اور مولویوں کی ان فتوؤں پر مہریں یا دستخط ہیں اور خاص کر سنی مولویوں نے بہت شرح وبسط کے ساتھ جواب لکھے ہیں۔''۱۱

ان فتوؤں میں سرسید کے مدرسہ کی مخالفت کرنے کے لیے دینی مدارس سے تقابل کیا گیا تھا اور چونکہ دینی مدارس سے یہ فتوے لیے گئے تو نتیجہ ظاہر ہے کہ کیا ہوا ہوگا ذیل میں دیے گئے اقتباسات پر غور کریں اور دیکھیں کہ کس طرح سرسید کے تعلیمی مشن کو دینی مدارس کے مدمقابل کھڑا کیا گیا ہے۔

## پہلا فتویٰ

''کیا فرماتے ہیں علماء شرع شریف کہ ان دنوں میں بعض مسلمانوں نے واسطے علوم دینی وعلوم دنیاوی مسلمانوں کے ایک مدرسہ قائم کرنا تجویز کیا ہے اور جو جو علوم اس میں پڑھائے جاویں گے اور جس طرح کہ مدرسوں اور طالب علموں کو تنخواہ ملے گی اس کی تجویز انھوں نے چھاپی ہے جو بجنسہ اس سوال کے ساتھ مرسل ہے۔ پس پہلا سوال یہ ہے کہ ایسے مدرسہ کا قائم وجاری ہونے کے لیے عموماً چندہ دینا یا اس طرح پر خاص کر کے چندہ دینا کہ ہمارا روپیہ خاص فلاں علم کی تعلیم میں صرف ہو اور فلاں علم کی تعلیم میں نہ صرف کیا جاوے شرعاً درست ہے یا نہیں اور دوسرا سوال یہ ہے کہ اس تجویز میں جو علوم پڑھانے مندرج ہیں ان میں سے کون سے علوم ایسے ہیں جن کے

پڑھانے کے لیے مسلمانوں کو چندہ دینا جائز ہے اور کون سے ایسے
ہیں جن کے لیے جائز نہیں۔''۱۲؎

پورے سوال میں کہیں بھی سرسید کے اعتقادات کا ذکر نہیں آیا صرف یہ پوچھا گیا ہے کہ فلاں فلاں علوم جو مدرسہ میں پڑھائے جانے تجویز ہیں اس کے لیے چندہ دینا جائز ہے۔؟

## دوسرا فتویٰ

''کیا فرماتے ہیں علماء دین اس میں کہ ان دنوں ایک شخص ان مدارس کو جن میں علوم دین اور ان علوم کو جو علم دین کی تائید میں ہیں تعلیم ہوتی ہے جیسے مدرسہ اسلامیہ دیوبند اور مدرسہ اسلامیہ علی گڑھ اور مدرسہ اسلامیہ کانپور لغو اور برا کہتا ہے اور ان مدارس کی ضد میں ایک مدرسہ اپنے طور پر تجویز کرنا چاہتا ہے اور اس شخص کا یہ حال ہے کہ صدہا امور کو بموجب آیات اور احادیث اور روایات فقہ باتفاق اہل اسلام میں ناجائز ہیں دین کے پیرایہ میں رواج دیتا ہے۔ اس لیے مسلمانوں کو اس شخص کے افعال اور اعتقادات پر اعتماد نہیں ہے۔ پس اس مدرسہ کے لیے جو ایسا شخص کہ اہل اسلام سلف دجال کے امور مذہبی میں مخالف ہے۔ اپنے طور پر ایک مدرسہ ضد میں مدارس اسلامیہ قائم اور حال کے تجویز کرنا چاہتا ہے اور ان میں کچھ علوم دنیاوی اور کچھ علوم مذہبی اپنے طور پر تعلیم کرانا اس کو منظور ہے مسلمانوں کو ایسے مدرسہ میں چندہ دینا درست ہے یا نہیں؟'' (ایضاً)

تیسرے فتوے میں سرسید کے اعتقادات کا ذکر ذرا تفصیل سے کیا گیا ہے اور پوچھا گیا ہے کہ ایک شخص جس کے ایسے اور ایسے عقیدے ہوں اس کی اعانت کرنا اور جاری کرنا ایک مدرسہ بواسطے تعلیم ہندوستان کے مسلمانوں کے جائز ہے کہ نہیں۔

## فتوے دینے کا غلط طریقہ

ان سوالات کے جواب پورے ہندوستان کے ہر طبقہ فکر کے دینی علماء کے پاس سے



منگوائے گئے اور سب نے فیصلہ دیا کہ ایسے کسی مدرسہ کی اعانت کرنا ناجائز ہے اور ایسے عقائد والا شخص کافر ہے۔ کمال یہ ہے کہ کسی بھی استفتیٰ میں سرسید کا نام کہیں نہیں آتا۔ بس یہ لکھا جاتا ہے کہ ایک ایسا شخص جس کے عقائد ایسے اور ایسے ہیں اس کے بارے میں دینی علماء کا کیا خیال ہے اور جب خیال صریح کفر کی شکل میں سامنے آتا ہے تو اس شخص پر چسپاں کر دیا جاتا ہے کہ یہ فتویٰ تو سرسید کے لیے آیا ہے۔ کیسا عجیب و غریب طریقہ ہے کہ جس شخص پر الزام لگایا جا رہا ہے اس کا نام تک نہیں لکھا جاتا۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ یہ طریقہ سراسر انصاف کے خلاف ہے کہ جس شخص کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ اس کے عقائد غلط ہیں اور اس بنیاد پر اس پر اتنا بڑا الزام لگایا جا رہا ہے کہ وہ مسلمان ہی نہیں رہا اور تمام زمانے اور قوم میں اس کو ذلیل کیا جا رہا ہے اس شخص سے کیوں نہیں پوچھا جاتا کہ آپ پر یہ الزامات ہیں آپ کیا کہتے ہیں ان کے سلسلہ میں دنیاوی عدالتوں تک میں یہ رواج ہے کہ جس شخص پر الزام لگایا جاتا ہے اس کو بلا کر پوچھا جاتا ہے اور اپنی صفائی کا موقع فراہم کیا جاتا ہے پھر دونوں پارٹیوں کا نقطۂ نظر سن کر فیصلہ دیا جاتا ہے یہاں آج تک انتہائی غیر منصفانہ طریقہ رائج ہے کہ بس انسان کا نام نہ لکھ کر اپنی طرف سے اس کے عقائد درج کر دیے جاتے ہیں اور ان عقائد کی بنیاد پر فتویٰ حاصل کر کے یہ اعلان کر دیا جاتا ہے کہ فلاں آدمی کے لیے یہ فتویٰ آیا ہے کیونکہ اس کے عقائد ایسے ہیں۔

اب وہ بے چارے لاکھ کہے کہ میرے عقائد ایسے نہیں ہیں یا مجھ سے انکوائری تو کی گئی ہوتی۔ کوئی نہیں سنتا۔ بس فتویٰ آ گیا اور بعد کو اس شخص پر جس کو کہ بدنام کرنا مقصود ہے جاری کر دیا گیا۔ بعینہٖ یہی سرسید کے ساتھ ہوا۔ کسی عالم فاضل نے ان سے یہ نہیں پوچھا کہ آپ ان الزامات کے بارے میں کیا کہتے ہیں۔ حالانکہ سرسید نے اور محسن الملک نے ان الزامات کے جوابات پوری تفصیل سے تہذیب الاخلاق میں چھاپے مگر کون سنتا ہے۔ خدا اور رسول شریعت اور قرآن پر پورا استحقاق اور دین کے پورے حقوق بنام دینی علماء کرام ضبط ہو چکے ہیں۔ چاہے جس کو کافر بنا دیں ملحد بنا دیں اور دوزخ کا حکم سنا دیں اور چاہے جس کو امام الہند اور نائب رسول بنا دیں۔ سرسید نے اپنے کئی مضامین میں جیسے کہ ''دافع البہتان'' اور حال خود دیاران خود اور محسن الملک نے اپنے مضامین ''تکفیر مسلمان'' اور سوال و

جواب میں خصوصیت کے ساتھ اور پوری تفصیل سے ان الزامات کے جواب لکھے ہیں جو ان پر لگائے گئے حال خود و یاران خود مضمون میں سر سید لکھتے ہیں:

''پرانے دل تو بعضے ہم کو برا کہتے کہتے ٹھنڈے ہوگئے ہیں اور بعضے نئے دل جوش پر ہیں اور ہم کو برا کہنے میں نہایت تیز زبان۔ مگر ہمارا دل اپنے کام سے ٹھنڈا نہیں ہے۔ ہم کو وہی جوش محبت و ہمدردی اپنی قوم کے ساتھ ہے۔ ان کی دین و دنیا کی بھلائی اور تہذیب و شائستگی کی دن رات فکر ہے ان کے غصہ سے ہم کو رنج نہیں ان کی سخت کلامی کا ہم کو غم نہیں کیونکہ ہم جانتے ہیں کہ وہ نہیں جانتے اور ہم سمجھتے ہیں کہ وہ نہیں سمجھتے...... ہم کو پچھلوں کے حالات سے اور خود اپنے دادا محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات سے بالکل تسلی ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جن لوگوں نے عام بھلائی پر کمر باندھی اور اپنی قوم کی بہترین و بہبودی میں کوشش کی ہے ان کو دنیا کے ہاتھ سے اور بالتخصیص اپنی قوم کے ہاتھ سے کیا ملا؟ کوئی سولی دیا گیا کوئی آرہ سے چیرا گیا کوئی جلاوطن کیا گیا پس ہم کو جو اپنی قوم کے ہاتھ سے ہونا چاہیے تھا اس کا کروڑواں حصہ بھی نہیں ہوا۔''[13]

ان استفتیٰ کے جواب میں علماء حضرات نے جو کچھ لکھا ہے اس میں سے چند فقرے بطور مثال ہم یہاں نقل کرتے ہیں۔

مولوی کریم اللہ صاحب دہلوی لکھتے ہیں:

''............معاونت کرنی ایسے طلباء کی اور اپنے مال معصوم کو غیر معصوم کرنا اور ہم پایہ ہونا اس خوش عقیدہ کے کہ جس کا حال بد اس سوال میں مذکور ہے۔ بالکل باطل، اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محمل تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے اور زمرہ حیوانیت میں داخل ہونا ہے...... الحاصل معاونت ایسے غارتی ایمان اور مال کی اور للہ سمجھنا اپنے مال کا خیال خام ہے۔...... یوں سمجھئے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں اور اپنے اعمال صالحہ کو مٹاتا ہوں۔ پس مرد دیندار بلکہ تمام سنی و شیعہ و خارجی و سائر ہندو و تمامی سکنائے اہل زمین پر واجب ہے کہ ایسے کلام واہی...... پر عقیدہ اپنا نہ جمادیں۔''[14]



حیرت ہوتی ہے کہ تمام ساکنان اہل زمین پر مع ہندوؤں کے یہ واجب کیسے ہوگیا کہ ایسے مدرسے کی مدد نہ کریں۔ مسلمان تو مسلمان غیر مسلموں پر بھی یہ فرض شرعی عائد کردیا کہ وہ ایسے مدرسے کی مدد نہ کریں۔ مسلمان تو خیر آپ کا فتویٰ مان لیں گے لیکن دوسرے مذاہب کے لوگوں پر بھی پابندی لگانے کی کوشش کرنا عجیب تر ہے۔ ان کے مذاہب کو اس مدرسے سے کیا خطرہ ہے؟ اسی طرح مولوی عبدالحئی صاحب فرنگی محلی جو ایک نامور عالم تھے فرماتے ہیں کہ:

''وجود شیطان اور اجنہ کا منصوص قطعی میں اور منکر ان کا شیطان ہے بلکہ اس سے بھی زائد کیونکہ خود شیطان کو بھی اپنے وجود سے انکار نہیں۔...... وجود آسمانی منصوص قرآنی ہے منکر اس کا مبتلائے وسواس شیطانی ہے...... مذہب نیچر خدا جانے کیا بلا ہے ہر متشرع اور متدین کو اس کے قبول سے ابا ہے...... ہر مسلمان کو حق جل شانہ اتباع شریعت محمدیہ پر قائم رکھے اور مذہب نیچر اور مشرب بدتر سے محفوظ رکھے۔ جو شخص کہ اعتقادات اس کے فاسد ہیں جو کہ سوال میں مسطور ہوئے ہیں وہ شخص مخرب دین ابلیس لعین کے وسوسے سے صورت اسلام میں تخریب دین محمدی کی فکر میں ہے اور بنام تجدید مدرسہ جدیدہ فساد شریعت اس کی منظور نظر ہے۔ جو چیزیں اس کے نزدیک موجب تہذیب ہیں اہل سنت کے نزدیک باعث تخریب ہیں............ ایسے شخص کی معاونت اقامت مدرسہ میں کہ فی الحقیقت وہ مدرسہ نہیں بلکہ مفسدہ ہے حرام ہے............ اگر احیاناً اس شخص نے کوئی مدرسہ قائم کیا تھوڑے عرصہ میں دین محمدی میں فتور واقع

ہو جائے گا اور تمام انتظام شریعت درہم برہم ہو جائے گا ہر شخص کو
لازم ہے کہ ایسے شخص کی معاونت سے اجتناب کرے۔"۱۵؎

جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ ان تمام الزامات کا جواب سرسید اور محسن الملک کی متفرق تحریروں اور خاص اسی مقصد کے تحت لکھے گئے مضامین میں تفصیل سے ملتا ہے ان تمام کا جواب لکھنا یہاں ضروری نہیں صرف ایک واقعہ نقل کرتے ہیں تا کہ ان الزامات کی حقیقت کا قارئین کو اندازہ ہو سکے۔ سائنٹفک سوسائٹی نے انگریزی کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرنے کی تحریک شروع کی تو اس کے تحت الفسٹن کی ہسٹری آف انڈیا کا ترجمہ بھی اردو میں کیا گیا۔ انگریز مصنف نے مسلمانوں کی تاریخ میں رسول اللہ کے پیدا ہونے کا حال بیان کیا تھا۔ اور وہاں آپ کی نسبت نعوذ باللہ پیغمبر باطل کا لفظ استعمال کیا تھا۔ لہٰذا ترجمہ میں بھی یہ لفظ آیا ہے۔ اس لفظ کے استعمال پر بھی مولوی امداد علی نے سرسید پر کفر کا فتویٰ عائد کیا اور مضمون کے آخر میں لکھا کہ جس شخص نے ترجمہ خود لکھا ہو وہ کیسا جہنمی ہے۔ سرسید نے اس کا جواب اس طرح لکھا کہ "مجھ میں اور امداد علی میں کیا فرق رہ گیا اگر صرف لکھنے سے ہی انسان کافر ہو گیا کہ میں نے انگریزی سے نقل کیا ہے اور انھوں نے اردو سے۔"

## قتل واجب ہے

تمام علماء ہندوستان کا اجماع اس پر ہو گیا تھا کہ سرسید کافر ہیں بلکہ ابلیس لعین ہیں بہر حال یہ بھی عام مسلمانوں کے لیے مقام شکر ہے کہ تاریخ میں پہلی بار تمام فرقوں کے دینی عالموں کو متفق دیکھا گیا۔ کیا سنی، وہابی، بدعتی، شیعہ، خارجی، اہل حدیث حتیٰ کہ قادیانی بھی۔ ہم یہ بھی سرسید کی ذات کا کرشمہ سمجھتے ہیں ہر دم باہم دست و گریباں رہنے والے حضرات کلیۃً اس مسئلہ پر متفق ہیں اور ہم فخر سے یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہمارے دینی علماء حضرات ہمیشہ لڑتے ہی نہیں رہے ہیں بلکہ ایک زمانہ ایسا بھی تھا جس میں یہ معجزہ ظہور پذیر ہوا۔ بات صرف انسانوں تک ہی محدود نہ رہی تھی بلکہ بقول حالی:

"صرف خدا کی طرف سے اس کی تصدیق اور تصویب باقی رہ گئی تھی



سو مولوی علی بخش خاں نے یہ کمی بھی پوری کر دی۔"۱۶؎

لہٰذا اسی غرض سے حج بیت اللہ کا ارادہ کیا اور مکہ مدینہ میں جا کر چاروں فقہوں کے عالموں سے سرسید کے کفر پر مہر لگوائی اس استفتے کا ملخص یہ ہے:

"اس مدرسہ کے جواب میں آپ کیا فرماتے ہیں جس کے بانی کے ایسے اور ایسے عقائد و اقوال ہوں اور جو یہ کہتا ہو کہ اہل اسلام کے اخلاق مہذب نہ ہوں گے جب تک کہ ستہ ضروریہ میں یورپ کے فلاسئہ جدیدہ کی پیروی نہ کریں گے اور یہ کہ تمام علوم دینیہ قدیمہ جو مسلمانوں نے مدون کیے ہیں بے فائدہ ہیں اس لیے ضرور ہے کہ ایک مدرسہ قائم کیا جائے جس میں علوم جدیدہ کی تعلیم ہو اور اہل یورپ کے طریقہ پر ستۂ ضروریہ سکھائے جائیں اور کتب دینیہ میں ایسے مضامین انتخاب کیے جائیں جو فلسفۂ جدیدہ کے خلاف نہ ہوں اور جب لوگوں نے اعتراض کیا کہ یہ مدرسہ تو الحاد و زندقہ کا مدرسہ ہوگا اور اس کی اعانت سے انکار کیا تو اس نے یہ جواب دیا کہ میں اپنے معتقدات سے تو رجوع نہ کروں گا اور اپنے ارادے سے بھی باز نہ آؤں گا مگر مدرسہ کا جو انتظام ہوگا وہ مجلس شوریٰ کی رائے کے موافق ہوگا حالانکہ اس مجلس کے اکثر رکن اسی کے گروہ کے ہیں اور ان کی رائیں ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں اور پچھلی پہلی کو منسوخ کرتی رہتی ہے پس ایسی حالت میں مسلمانوں کو اس کی اعانت کرنا جائز ہے کہ نہیں؟"۱۷؎

اس کا جواب چاروں فقہوں کے علماء نے الگ الگ لکھا ہے جس کا ماحصل یہ ہے:

"یہ مدرسہ جس کو خدا برباد اور اس کے بانی کو ہلاک کرے اس کی اعانت جائز نہیں ہے اور اگر مدرسہ بن کر تیار ہو جائے تو اس کو منہدم کرنا اور اس کے بانی سے اور اس کے مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے اور ہر شخص پر جس میں حمیت اسلامی ہو واجب ہے اس

مدرسہ کی مخالفت جہاں جہاں تک قدرت ہو اور ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ
اول سے مخالف ہو۔'' ۱۸؎

مدرسہ کے انہدام کی بات بہت خوب ہے قابل غور بات ہے کہ اسی طرح کے مدرسہ مکہ اور مدینہ میں اب قائم کیے جا رہے ہیں نہ صرف قائم کیے جا رہے ہیں بلکہ بڑی بڑی یونیورسٹیاں بن گئے ہیں ان علماء کرام کے جانشین شاید اب وہاں نہیں ہیں ورنہ ان مدرسوں کے انہدام کا فتویٰ آج بھی ضرور دیتے۔ شاید اب نئی تعلیم سے کفر والحاد جاری نہیں ہوتا کہ یورپ اور امریکہ کے عیسائیوں سے لے کر ہندوستان سے مشرکین تک کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر بلایا جاتا ہے کہ للہ ہماری نسلوں کو پڑھاؤ کہ یہ جاہل رہی جاتی ہیں۔ علم زندگی ہے، خوشی ہے اسلام کی سربلندی کا احساس علم سے پیدا ہوتا ہے کچھ لوگ مر کر بھی زندہ رہتے ہیں آج شاہان سعودیہ بلکہ دنیائے اسلام کے تمام سربراہان اسی تعلیم کو پھیلا رہے ہیں جس کو سرسید نے سو سال پہلے رائج کرنا چاہا تھا۔ اب وہ مفتیان کرام کہاں ہیں؟

سرسید ٹھنڈے مزاج کے آدمی تھے اور عام طور سے اپنے مخالفین پر برگشتہ نہیں ہوتے تھے اور نہ الزامات کا جواب دینا ضروری خیال کرتے تھے مگر جب پانی سر سے اونچا ہو جاتا تھا تو مجبوراً جواب بھی دیتے تھے۔ مولوی علی بخش خاں جو مکہ مدینہ سے فتوے لے کر آئے تھے ان کے بارے میں اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں:

''جو صاحب ہماری تکفیر کے فتوے لینے کو مکہ معظّمہ تشریف لے گئے تھے اور ہمارے کفر کی بدولت ان کو حج نصیب ہوا ان کے لائے ہوئے فتوے، ہم بھی دیکھنے کے مشتاق ہیں۔ سبحان اللہ ہمارا کفر بھی کیا کفر ہے کہ کسی کو حاجی بنادے اور کسی کو ہاجی اور کسی کو کافر کسی کو مسلمان بنادے۔'' ۱۹؎

مدینہ کے شیخ محمد امین یابی مسلک حنفیہ کے مفتی تھے۔ انھوں نے سرسید کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ صادر فرمایا:

''جو کچھ درمختار اور اس کے حواشی سے معلوم ہوتا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے یا



زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا...... اہل مذہب حنفی کے بیانات سے مفہوم ہوتا ہے کہ ایسے لوگوں کی توبہ گرفتاری کے بعد قبول نہیں ہوتی پس اگر اس شخص نے گرفتاری سے پہلے توبہ کر لی اور گمراہیوں سے رجوع کیا اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے ورنہ اس کا قتل واجب ہے۔ دین کی حفاظت کے لیے اور دلاتہ پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔'' ۲۰؎

آخری سزا سرسید کی تجویز ہو گئی۔ سرسید اور مفتی صاحب دونوں دنیا سے اٹھ گئے مگر دنیا نے دیکھا کہ اسی طرح کے ادارے مکہ و مدینہ میں آج قائم کیے جا رہے ہیں جو سرسید نے چاہے تھے اور کوئی فتوے دینے والا دنیا میں نہیں ہے حتیٰ کہ یورپ اور امریکہ تک سے ماہرین کو بلایا جا رہا ہے کہ علم پھیلائیں۔

○

**حواشی:**

(۱) حیات جاوید، ص: ۳۵۸
(۲) ایضاً، ص: ۵۳۶
(۳) ایضاً، ص: ۵۳۷
(۴) بحوالہ حیات جاوید، ص: ۳۵۹
(۵) حیات جاوید، ص: ۵۴۱
(۶) حیات جاوید، ص: ۵۴۲
(۷) بحوالہ حیات جاوید، ص: ۵۴۴
(۸) بحوالہ حیات جاوید، ص: ۵۴۶
(۹) بحوالہ ناموران علی گڑھ، ص: ۲۱۸
(۱۰) ایضاً
(۱۱) حیات جاوید، ص: ۵۴۷
(۱۲) بحوالہ ناموران علی گڑھ، ص: ۲۱۹
(۱۳) بحوالہ حیات جاوید، ص: ۵۴۵
(۱۴) حیات جاوید، ص: ۵۴۷
(۱۵) بحوالہ ناموران علی گڑھ، ص: ۲۲۰
(۱۶) حیات جاوید، ص: ۵۵۰
(۱۷) ایضاً، ص: ۵۵۲
(۱۸) ایضاً
(۱۹) بحوالہ ناموران علی گڑھ، ص: ۲۲۵
(۲۰) حیات جاوید، ص: ۵۵۲

# سرسید کی مصالحانہ کوششیں

باوجود شدید مخالفتوں اور توہین آمیز رویہ کے جو سرسید کے تئیں دینی علماء کا تھا سرسید نے آخر تک مصالحت کی کوششیں جاری رکھیں اور علماء وقت سے خط و کتابت اور صلح صفائی کا سلسلہ چلتا رہا۔ واضح ہو کہ یہ پیش قدمی ہمیشہ سرسید کی طرف سے ہوئی۔ مدرسہ بننے کے وقت علماء نے اس خدشہ کا اظہار کیا تھا کہ چونکہ سرسید گمراہ عقائد کے حامل ہیں اور دینی تعلیم مسلمان بچوں کے لیے ایک ضروری مضمون مدرسہ میں رکھنا چاہتے ہیں لامحالہ اس مضمون میں ایسی کتابیں پڑھائی جائیں گی جس سے طلباء کے عقیدہ میں بگاڑ آنا لازمی ہے لہٰذا مدرسہ کی مخالفت اور زیادہ زور و شور سے حمیت اسلامی کے نام پر کی جاتی رہی۔ سرسید نے اس سمت میں بہت بڑی پیش قدمی کی اور دینی تعلیم کا شعبہ اس وقت کے دینی علماء کیا ختیار یں دیدنے کا فیصلہ کرلیا کہ اس طرح علماء اور مسلمانوں کے ذہن سے اس بڑے خطرے کا ڈر نکل جائے گا اور مسلمان مدرسہ میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوسکیں گے اس سلسلہ میں مولوی علی بخش خاں، سرسید اور محسن الملک کے درمیان ہوئی خط و کتابت سے کئی انکشافات سامنے آتے ہیں۔

پہلا یہ کہ دینی علماء اس مدرسہ کا مقصد سرسید کے مذہبی عقائد کی تشہیر سمجھتے تھے وہ سمجھتے تھے کہ سرسید اپنے گمراہ عقائد کو پھیلانے کے لیے یہ مدرسہ قائم کررہے ہیں۔ مولوی علی بخش جو اس گروہ کے سرغنہ تھے سرسید کو لکھتے ہیں:

> ''یہ امر مخفی نہیں رہا کہ جناب والا کے خیالات مذہبی عموماً اہل اسلام کے خلاف ہیں اور ابتدائے اجرائے تہذیب الاخلاق سے ایک مدرسہ انہیں خیالات کے ترویج کی خاطر صراحتاً کنایتاً بعض تحریرات میں آپ نے ضروری قرار دیا ہے...... جب ہم لوگ خود ہی بناء ایک ایسے مدرسہ کی قائم کریں گے یا اس میں شریک ہوکر چندہ دیں گے اور ممبر اس کی تائید کے واسطے بنیں گے جس میں ہمارے مذہب کا استحصال یا انقلاب ہوجانے کا خطرۂ عظیم ہو اور ہماری نسل میں جو لوگ پیدا ہوں گے وہ اس طریقہ پر قائم ہوجائیں گے جس کی ہدایت تہذیب الاخلاق میں ہے اور جس کو آپ رحمت خدا کی سمجھ کر یقین دلاتے ہیں کہ آئندہ ضرور زمانہ اس کو قبول کرنے کا آئے گا...... اگر واقعی خدا تعالیٰ کے موافق مرضی ہمارا ہی مذہب ہے (اور یقیناً ایسا ہی ہے) نہ کہ آپ کا مذہب تو ایسا مدرسہ اور اس کی شرکت قیامت ہے۔''[1]



مولوی علی بخش خاں نے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ اس مدرسہ میں سرسید کے عقائد کے موافق کتابیں پڑھائی جائیں گی جس سے کہ موجودہ دینی طریقۂ تعلیم کی مخالفت ہونے کا خطرہ ہے ان کی نظر میں یہ طریقۂ تعلیم خدا اور رسول کی مرضی کے عین مطابق تھا اور سرسید کا مدرسہ اس کے برخلاف مولوی علی بخش خاں نے سرسید سے جاننا چاہا کہ آیا ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی آگئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو سرسید کو اس امر کا اعلان کرنا چاہیے۔

> ''اگر آپ کی رائے پلٹ گئی ہے اور تعلیم مذہبی موجودہ زمانۂ حال آپ کے نزدیک عمدہ اور نا قال تبدیل ہے اور اس سے جو اثر مسلمانوں کے دلوں میں ہوتا ہے اور ہوگا وہ مرضی خدا اور رسول اور موافق شریعت ہے اور آپ نے اپنی رائے سے رجوع فرمایا ہے تو صاف ارشاد ہوجائے کہ گو ہمارے سابقہ خیالات کیسے ہی کیوں نہ تھے مگر جمہور اہل اسلام کے ساتھ اب ہم کو موافقت ہے اور ہم خیالات سابقہ سے تائب ہوگئے ہیں۔'' (ایضاً)

علی بخش خاں کو مدرسہ کی مینیجنگ کمیٹی پر شدید اعتراضات تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ چونکہ یہ کمیٹی ایسے ہی لوگوں سے بھری ہے جو سرسید کے ہر طرح سے ہمنوا ہیں لہٰذا دینی تعلیم جو اس مدرسہ میں ہوگی وہ سرسید کے عقائد کے موافق ہوگی۔

> ''اہل اسلام کو کیوں کر یقین کامل ہو کہ کمیٹی بالاتفاق ان امور کے

ترویج وتعلیم کو منع کرے گی جو آپ کی خواہش قلبی کے خلاف نہیں ہیں
اور اگر اس کمیٹی کے ممبران نے اختلاف بھی کیا تو کس کام آئے گا۔
(ایضاً)

سرسید نے اس خط کا بہت معقول جواب مولوی علی بخش خاں کو بھیجا جس میں اس تجویز پر اپنی رضا مندی کا اظہار کیا کہ ایک کمیٹی الگ سے دینی تعلیم کی نگہداشت کے لیے قائم کی جائے اور وہ کمیٹی پوری طرح سے مختار ہو کہ دینی تعلیم کا جو چاہے نصاب قائم کرے۔ سرسید نے اس کمیٹی کی ساری ذمہ داری اپنے سب سے بڑے مخالف مولوی علی بخش خاں کو سونپنے کی پیشکش کی یہاں تک کہ اس کمیٹی کے ممبران بھی مولوی علی بخش خاں کی مرضی سے بنائے جانے کی تجویز رکھی لکھتے ہیں کہ:

''اگر میرے عقائد جیسا کہ آپ خیال فرماتے ہیں کفر وضلالت ہیں تو قومی ہمدردی اور محبت کا مقتضا یہ ہے کہ آپ اپنے اوقات خاص میں میرے حق میں دعا فرمادیں...... بہرحال اب مدرسۃ العلوم میں آپ کا مددگار ہونا اس بات پر منحصر ہے کہ میرے عقائد کی مداخلت کا اندیشہ جس کو آپ خلاف شرع سمجھتے ہیں اور کمیٹی کی دست اندازی کا خوف مسائل مذہبی میں نہ رہے اور اس کے رفع کرنے کے لیے یہ تجویز فرماتے ہیں کہ کمیٹی خزینۃ بضاعت تعلیم مذہبی میں کچھ مداخلت نہ کرے اور ایک کمیٹی جس پر عام اہل اسلام کو اطمینان ہوا امور متعلقہ تعلیم مذہبی کے لیے مقرر کی جائے میں نہایت خوش دلی سے جو امر کہ آپ نے پیش فرمایا ہے اس کو منظور کرتا ہوں اور مجھ کو کامل یقین ہے کہ کمیٹی کے کسی ممبر کو بھی اس میں کچھ عذر نہ ہوگا............ پس جو ہدایت آپ نے فرمائی ہے اس کو میں دل سے قبول کر کے یہ عرض کرتا ہوں کہ جو طریقہ تعلیمی کمیٹی میں پیش ہوا ہے اس میں ایک دفعہ اور بڑھائی جائے اور خاص مذہبی تعلیم کے لیے ایک جداگانہ کمیٹی مقرر ہو جس کے ممبروں کی تعداد اس قدر ہو جس قدر کہ آپ تجویز کریں اور



ان کا انتخاب بھی ابتداء صرف آپ کی رائے پر اور جس کو آپ اپنا شریک کرنا چاہیں اس کی شرکت رائے پر منحصر ہو اور جو ممبر اس کمیٹی کے مقرر ہوں وہ لائف ممبر اس کمیٹی کے ہوں تا کہ آئندہ کسی شخص اور کسی کمیٹی کو ان کی نسبت کچھ اختیار باقی نہ رہے اور یہ قاعدہ تجویز ہو کہ کوئی عہدہ اس کمیٹی کی ممبری کا خالی ہو تو باقی ممبران موجودہ کسی دوسرے شخص کو اپنی تجویز سے بلا مداخلت کسی اور کے خود مقرر کریں اور تمام امور متعلقہ تعلیم مذہب، اہل سنت و جماعت و سلسلۂ کتب درسیہ مذہبی سے علاقہ رکھتے ہیں اس کمیٹی کی رائے پر منحصر ہو اور کمیٹی خزینۃ بضاعۃ کو یا مجھ کو بھی اس میں مداخلت نہ ہو۔''۲؎

یعنی سرسید نے دینی علماء سے مصالحت کی کوشش میں یہاں تک ان کو اختیار دے دینا چاہا کہ مولوی علی بخش خاں خود دینی تعلیم کمیٹی کے ممبران کو چن لیں اور وہ ممبران لائف ممبر ہوں یہ کمیٹی ایسی بااختیار ہو کہ مدرسین کا تقرر و کتابوں کا تعین و نصاب تعلیم سب کچھ اس کمیٹی کے اختیار میں ہو یہاں تک کہ اس کمیٹی کے کاموں میں خود سرسید کو بھی مداخلت کرنے کا کچھ اختیار نہ ہو۔ ان قانونی تبدیلیوں کے لیے سرسید نے فوراً عملی قدم اٹھایا اور کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کے ممبران کے پاس اس بارے میں اپنی رائے لکھ کر بھیجی اور ان کی منظوری حاصل کرلی۔

''............ممبر کمیٹی کے اس وقت یہاں موجود ہیں ان کے دستخط منظوری کے میں نے اس پر ثبت کرالئے ہیں اور ممبروں کے پاس بھی میں ان خطوط کی نقل بھیج کر منظوری حاصل کرلیتا ہوں مگر اب آپ بخوبی سمجھ لیجئے کہ اہل سنت و جماعت کی تعلیم کا بوجھ اور اس کی کمیٹی کے ممبر مقرر کرنا یہ سب آپ کے سر ہے اور اب آئندہ سے آپ اس کے ذمہ دار ہیں اور علاوہ اس کمیٹی کی ممبری کے آپ کو کمیٹی خزینۃ البضاعۃ کا بھی ممبر مقرر کریں گے تا کہ اس میں جو کچھ غلط ہو اس میں آپ کی ہدایتوں سے فائدہ اٹھائیں۔ (ایضاً)

یہ سرسید کی قربانی اور خلوص کی انتہا تھی کہ جو شخص سرسید کی مخالفت میں اس قدر شدید تھا

کہ ان کے واجب القتل ہونے تک کے فتوے لے کر آیا اسی شخص سے مصالحت میں اتنا آگے بڑھ گئے کہ کمیٹی کی ممبری تک پیش کر دی علاوہ اس کے دینی تعلیم کا پورا انچارج بھی بنا دیا مگر اتنے پر بھی دینی علماء کا طبقہ سرسید کا مخالف ہی رہا اور کسی طرح بھی قومی ہمدردی کے کام میں ہاتھ بٹانے پر راضی نہ ہو سکا جب سرسید کی یہ تجاویز محسن الملک کو پہنچیں تو انھوں نے مولوی علی بخش خاں کی شرکت کو امید موہوم قرار دیا۔ محسن الملک کا خیال تھا کہ علی بخش خاں کی تجاویز کو ماننا اس امر کے مترادف ہے کہ سرسید اور کمیٹی کے سارے ممبران نے اپنے کافر ہونے پر اقرار کر لیا اور دینی علما کو صحیح مان لیا۔ سرسید کو لکھتے ہیں:

> ''جناب مولوی علی بخش خاں کے خط پر جو رائے آپ نے دی ہے وہ آپ ہی کا کا ہے اور کوئی مسلمان ممبر مجلس خزینۃ بضاعۃ کا تو آپ کی رائے سے غالباً اتفاق نہ کرے گا اس لیے کہ ہر لفظ سے مولوی صاحب کی نہ صرف آپ کے کفر وارتداد پر اشارہ ہوتا ہے بلکہ تمام ممبران کمیٹی اور معاونان مدرسہ کی بد دینی اور بے ایمانی پر مکہ کے فتوے کو سند پیش کی جاتی ہے میری غیرت اور حمیت اس بات کو قبول نہیں کرتی کہ ایسی حالت میں اپنا کفر وارتداد قبول کر کے اور تمام مسلمانوں کو جواب تک ہماری کمیٹی میں شریک ہوئے ہیں کافر اور مرتد ٹھہرا کر ایک امید موہوم پر آپ کی رائے سے اتفاق کروں۔ آپ تو مدرسہ کے خیال میں قد شغفھا حباً کے درجہ پر پہنچ گئے ہیں اور دین و دنیا سے ہاتھ دھو بیٹھے ہیں مگر میں ہنوز اس درجہ پر نہیں پہنچا ہوں میں یہ بات منظور کر سکتا تھا کہ مولوی علی بخش صاحب اس مجلس کے سکریٹری مقرر ہوں جو مذہبی تعلیم کے قواعد تجویز کرنے کے لیے مقرر ہو مگر یہ شرط کہ آپ اور کمیٹی خزینۃ البضاعۃ مذہبی تعلیم میں مداخلت نہ کرے جس سے شاید یہ مراد ہوگی کہ آپ اور کوئی ممبر کمیٹی کا استحقاق شرکت مجلس تعلیم مذہبی کا بوجہ کفر وارتداد کے نہیں رکھتا مجھے منظور نہیں۔''



لیکن سرسید کے زور دینے پر کمیٹی نے متفقہ طور سے ان کی تجویز کو منظور کر لیا اور علی بخش خاں کو اس فیصلہ کی اطلاع دے دی گئی لیکن اس پر بھی مولوی علی بخش خاں نے مدرسہ کے دینی تعلیم کے شعبہ کی سربراہی سے انکار کر دیا کہ ان کا مقصد مسئلہ کا حل نہیں تھا بلکہ مخالفت برائے مخالفت کرنا تھی سو وہ اپنا کام پوری تندہی اور لگن سے کرتے رہے اور دینی علماء کے قومی ہاتھ میں بٹانے کی تمام امیدیں ختم ہو گئیں۔

○

**حواشی:**

(۱) یوسف حسین: علی گڑھ آرکائوز ڈیپارٹمنٹ آف ہسٹری، ص:۲۵۱

(۲) ایضاً، ص:۲۶۱

(۳) ایضا، ص:۲۶۳

# سرسید کے سیاسی نظریات وکارنامے

یہ خیال عام کیا گیا ہے کہ سرسید مسلمانوں کے سیاست میں حصہ لینے کے خلاف تھے اور مسلمانوں کی ترقی کے لیے صرف اور صرف تعلیمی ترقی کی کوششوں کو ضروری خیال کرتے تھے۔اس خیال میں ایک بہت بڑی خرابی اور غلطی مضمر ہے۔پہلی تو یہ کہ لفظ سیاست کے معنی سمجھنے میں عام طور سے غلط کی جاتی ہے اور دوسرے علم حاصل کرنے کے مقاصد سمجھنے میں بھی غلطی کی جاتی ہے۔ سیاست جو آج کل کے معنی میں مستعمل ہے یقینی طور سے ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں ایک ناخوش گوار عمل ہے اور ہر شریف انسان سیاست کی گندگیوں سے بچنا اور اپنے دوستوں کو بچانا چاہے گا لیکن اگر صحیح معنوں میں سیاست کو سمجھا اور برتا جائے تو یہ ایک قابل تحسین فعل ہے اور قوم کو باعزت بنانے کا ذریعہ ہے۔سرسید کے تمام سیاسی اعمال اس بات کی طرف صاف نشاندہی کرتے ہیں کہ سیاست کا مقصد یہ ہے کہ اپنی قوم کو درپیش مسائل کو سمجھا جائے ان کے حل کی راہیں متعین کی جائیں،عام طور سے مسلمانوں کے سیاسی خیالات کی اصلاح کے لیے دوسری طاقتوں کی سازشوں کی بروقت اطلاع قوم کو دی جائے اور قومی اتحاد کے ذریعہ ان حضرات کا مقابلہ کیا جائے جو مسلمانوں کو درپیش آئیں۔ان مسائل اور پیچیدگیوں کو سمجھنے کے لیے تعلیم اور علم حاصل کرنا ازبس ضروری عمل ہے۔لکھنؤ میں ایک بار انھوں نے کہا تھا کہ تعلیم دینے سے میرا مقصد قوم کو قوم بنانا ہے۔

> ''اے دوستو! مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے۔میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔''[1]

سرسید کی تمام زندگی سیاسی اصلاحات جاری کرنے میں گزری۔اسباب بغاوت ہند سے لے کر میرٹھ اور لکھنؤ کی تقاریر میں مسلمانوں کو کانگریس کے خطرات سے آگاہ کرکے



اس سے مقابلہ کرنے کے لیے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن بنانے تک دراصل ان کی تمام تحریکیں بشمول تعلیمی تحریک و مذہبی اصلاحات کی تحریک مسلمانوں کی سیاسی اصلاح سے تعلق رکھتی ہیں اور ان کو دنیا میں باعزت اور طاقتور بنانے کی تحریکیں ہیں۔بقول حالی:

> ''اگرچہ بظاہر سرسید کے پولیٹیکل ورکس میں چند تحریروں اور اسپیچوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا مگر درحقیقت جیسا کہ ان کی بائیوگرافی سے ثابت ہوتا ہے۔۱۸۵۷ء کے بعد جو کچھ انھوں نے لکھا کہا یا کیا اس کا بہت بڑا حصہ مسلمانوں کی پولیٹیکل اصلاح سے تعلق رکھتا ہے۔''[2]

اسی طرح کے خیالات کا اظہار جذبی نے بھی کیا ہے:

> ''سرسید کی تحریک کے بارے میں مختلف رائیں ملتی ہیں کوئی اسے مذہبی سمجھتا ہے کوئی معاشرتی اور کوئی تعلیمی،ذاتی طور سے میں کچھ اس طرح سمجھتا ہوں کہ یہ تحریک بڑی حد تک سیاسی تھی جسے مسلمانوں کے عام سماجی حالات نے پیدا کیا تھا،اس پر مذہب،معاشرت اور تعلیم کے جتنے دبیز یا ہلکے پردے پڑے ہوئے ہیں اس سے عموماً دھوکا ہوتا ہے۔''[3]

بنیادی طور سے سرسید کی تحریک مسلم قوم کو پولیٹیکل بے وقعتی سے نکال کر حکومت میں دخیل بنانے کی تھی جو آگے چل کر خود حکمرانی کی دعویدار ہو سکتی تھی۔سرسید کے انتقال پر اخبار پایونیئر نے لکھا تھا کہ:

> ''سرسید احمد خاں جو ایک دوراندیش مدبر ہونے کی وجہ سے تعلیم کا نہایت سرگرم حامی تھا اس کے انتقال کے ساتھ اس نہایت مفید بارآور اور نہایت زبردست پولیٹیکل طاقت کا خاتمہ ہوگیا جس نے موجودہ صدی کے اخیر ربع میں ہندوستان کی اسلامک دنیا کو متحرک کردیا تھا۔''[4]

علامہ شبلی کو اعتراف ہے کہ:

> ''وہ پرزور دست وقلم جس نے اسباب بغاوت ہند لکھا تھا اور اس

وقت لکھا تھا جب کورٹ مارشل کی ہیبت ناک شعلے بلند تھے وہ بہادر
جس نے پنجابی یونیورسٹی کی مخالفت میں لارڈلٹن کی اسپیچوں کی
دھجیاں اڑادی تھیں اور جو کچھ اس نے ان تین آرٹیکلوں میں لکھا
کانگریس کا لٹریچر حقوق طلبی کے متعلق اس سے زیادہ پرزور لٹریچر نہیں
پیدا کرسکتا۔ وہ جانباز جو آگرے کے دربار سے اس لیے برہم ہو کر
چلا آیا تھا کہ دربار میں ہندوستانیوں اور انگریزوں کی کرسیاں برابر نہ
تھیں۔'' ۵؎

ہندوستانی مسلمان جس وقت تاریخ ہندوستان کے سب سے قیامت خیز سیاسی تغیر کے شکار ہوئے اس وقت سرسید کی عمر چالیس سال تھی۔ غدر کے وقت سرسید بجنور میں تعینات تھے۔ بجنور میں انھوں نے خود انگریزوں کا قتل عام دیکھا اور بدلہ میں انگریزی فوجوں کی انتقامی کارروائیاں دیکھیں۔ دہلی، مرادآباد، میرٹھ میں جتنے واقعات گزرے وہ ان کے عینی شاہد تھے۔

خود ان کا خاندان حتیٰ کہ ان کی والدہ تک اس سیاسی تغیر کا شکار ہوگئیں اور اس دوران انہیں تین دن تک پانی تک پینے کو نہ ملا اور کھانے کے نام پر گھوڑے کا دانہ کھانا پڑا۔ دہلی میں کوئی عزت دار مسلم خاندان نہ بچا غدر کی ساری ذمہ داری مسلمانوں اور بہادر شاہ ظفر پر عائد ہونے کے سبب مسلمانوں پر وہ عتاب نازل ہوا جس کا دائرہ تحریر میں لانا بھی مشکل ہے۔ شہزادوں کے سر بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے جس پر ذرا بھی شک گزرا اس کو بغیر کسی مقدمہ کی کارروائی کے سرعام سولی پر لٹکا دیا گیا۔

ایسے وقت میں جب کہ دنیا کا ہر جرم مسلمانوں سے منسوب کیا جارہا تھا سرسید نے مسلمانوں اور بالعموم تمام ہندوستانیوں کی خیرخواہی میں اسباب بغاوت ہند لکھ کر ایک عظیم الشان سیاسی کارنامہ انجام دیا۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس میں ان کی جان بھی جاسکتی تھی۔ دوستوں نے سمجھایا بھی کہ جان خطرے میں نہ ڈالو مگر حق بات کہنے اور کر گزرنے کا جو جذبہ سرسید میں پایا جاتا تھا وہ عدیم المثال تھا۔ جس کی بدولت سرسید نے بغاوت کی ساری ذمہ داری ہندوستانیوں پر سے ہٹا کر خود انگریزوں پر ڈال دی اور حکمرانوں کو عوام سے بے خبر اور



ان کی بہبودی کے کاموں سے دور رہنے کا الزام لگایا۔ اس کتاب سے ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوا کہ ہندوستانیوں کو وائسرائے اور پریزیڈنسیوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں شامل کیا گیا۔ برمنگھم ڈیلی گزٹ نے اس کتاب کا خلاصہ لکھ کر تحریر کیا تھا کہ:

''ان شکایتوں کو اس طرح رفع کیا گیا ہے کہ ہندوستان کی حکومت
ایسٹ انڈیا کمپنی سے لے کر تاج برطانیہ سے متعلق کی گئی اور
ہندوستانی ویورپین جو ملازم سرکار نہ تھے وہ وائسرائے اور
پریزیڈنسیوں کی لیجسلیٹو کونسلوں میں شریک کیے گئے۔'' ۶؎

اصلی سبب غدر کا جو سرسید نے تحریر کیا تھا وہ ہندوستانیوں کا قانونی کونسلوں میں شریک نہ کیا جانا تھا جس کے سبب گورنمنٹ کے خیالات رعایا پر اور رعایا کے خیالات گورنمنٹ پر ظاہر نہ ہو پاتے تھے، چنانچہ پہلی بار:

''جنوری ۱۸۶۲ء میں مہاراجہ نرندر سنگھ رئیس پٹیالہ راجہ دیونرائن سنگھ
رئیس بنارس اور راجہ دنکر راؤ دیوان ریاست گوالیار کو وائسرائے کی
کونسل میں شریک کیا گیا۔''

## سرسید کی رائے میں انقلاب

اردو کا مسئلہ:- اس وقت تک سرسید کے ذہن میں ہندو اور مسلمان کا جداگانہ مسئلہ نہ تھا اور وہ دل سے تمام ہندوستانیوں کی بھلائی چاہتے تھے اپنی اکثر تقریروں میں انھوں نے ہندو اور مسلمان کو دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی اور ہمیشہ آپسی نفاق سے بچنے کی صلاح دیتے رہے کہ دلہن بھینگی نہ ہوجائے۔ ایک تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ:

''ہندوستان میں رہتے سہتے دونوں کا خون بدل گیا دونوں کی رنگتیں
ایک سی ہوگئیں۔ دونوں کی صورتیں بدل کر ایک دوسرے سے مشابہ
ہوگئیں۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کی سیکڑوں رسمیں عادتیں لے
لیں۔ یہاں تک کہ ہم دونوں آپس میں ملے کہ ہم دونوں نے مل کر
ایک نئی زبان پیدا کرلی جو نہ ہماری زبان تھی اور نہ ان کی۔ پس اگر

ہم اس حصہ سے جو ہم دونوں میں خدا کا حصہ ہے قطع نظر کر لیں تو
درحقیقت ہندوستان میں ہم دونوں بہ اعتبار ہم وطن ہونے کے ایک
قوم ہیں۔''[7]

مگر یہی مشترکہ زبان آخر کار مستقل نزاع کا سبب بن گئی۔ سرسید سمجھتے تھے کہ یہ زبان ہم دونوں نے مل کر بنائی ہے مگر ہندوؤں نے آج تک اس بات کو تسلیم نہیں کیا اور ۱۸۶۷ء سے لے کر آج تک اس بات پر بضد ہیں کہ یہ زبان صرف مسلمانوں کی ہے لہٰذا اس کو آزاد ہندوستان میں تو کیا غلام ہندوستان میں بھی جینے اور پھلنے پھولنے کا حق نہیں دینا چاہتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں اردو کے خلاف ہنگامہ آرائیاں ہندوستان میں ہندو سیاست اور مسلمان سیاست کی بنیاد بن گئی اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ اس کی بہت سی اور وجوہات کے علاوہ اہم وجہ یہ رہی کہ انگریزی تعلیم کی طرف ہندو بہت پہلے متوجہ ہو چکے تھے اور تاریخ ہند میں جو اس زمانہ میں کیا بلکہ آج تک پڑھائی جاتی ہے نہایت تعصب سے مسلمانوں کے دور کو ظالمانہ رنگ میں پیش کیا گیا تھا اس تعلیم کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ہندو تعلیم یافتہ طبقہ کے دل میں جس کی اس وقت بھی ایک بہت بڑی تعداد تھی مسلمانوں کی طرف سے نفرت کا تخم جم گیا۔ اور رفتہ رفتہ وہ ایک نہایت تناور اور گھنا درخت بن گیا۔ تعلیم یافتہ ہندو مسلمانوں کو نہایت تحقیر کی نظر سے دیکھتا تھا کیونکہ بقول حالی:

''جو عزت اور جاہ و منصب اور امور سلطنت میں شرکت تعلیم کی بدولت ہندوؤں نے حاصل کی تھی مسلمان اپنے غرور تعصب یا غفلت و بے پروائی یا افلاس کے سبب اس سے محروم تھا اور واقعہ ۱۸۵۷ء نے ان کو اور بھی مٹا دیا تھا۔ ان تمام باتوں کا لازمی نتیجہ ہی تھا کہ غالب پارٹی اپنے نئے اقتدار کا جو اس نے مدت بعد حاصل کیا تھا اور جس میں بہت کچھ چاؤ وامنگیں بھری ہوئی تھیں مغلوب پارٹی پر امتحان کرے اور اگر کوئی حیلہ ہاتھ نہ آئے تو اسی بہانے کہ دریا میں خاک کیوں اڑاتے ہو، اس سے دست و گریباں ہو جائے۔''[8]



لہٰذا شمال مغربی اضلاع کے ہندوں نے الہ آباد اور بنارس کو صدر مقام بنا کر جگہ جگہ اردو کو ہٹانے اور اس کی جگہ ہندی کو رائج کرنے کی تحریک چلائی۔

چنانچہ لیفٹننٹ گورنر بنگال سے مل کر بہار اور بنگال سے اردو ہٹا کر بہاری زبان اور کیتھی حروف بہار میں اور بنگالی زبان بنگال میں جاری کرانے میں کامیاب رہے۔ اردو کو ان دو بڑے علاقوں سے ایک طرح سے ختم کرنے کی شروعات کی داغ بیل ۱۸۶۷ء میں ہی پڑ گئی تھی۔ سرسید کے اخیر زمانے میں ایک بار پھر الہ آباد اور بنارس کے ہندوؤں نے حکومت میں درخواست گزاری کہ ہندی کو نافذ کیا جائے۔

سرسید اس زمانہ میں مرض الموت میں مبتلا تھے اور بقول حالی مارے رنج والم و مایوسی کے ''نقش دیوار'' بن گئے تھے۔ انھوں نے اس درخواست کے خلاف ایک لمبا مضمون لکھا جو ۱۹ر مارچ کے انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان کے انتقال سے ۹ دن پہلے چھپا اور اس طرح اس مرد مجاہد نے مرتے مرتے بھی قومی خدمت کا حق ادا کیا۔

○

**حواشی:**

(۱) مجموعہ لکچرس، ص:۲۵۹
(۲) حیات جاوید، ص:۵۸۸
(۳) جذبی: حالی کا سیاسی شعور، ص:۴۸
(۴) بحوالہ حیات جاوید، ص:۵۹۲
(۵) بحوالہ نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ص:۱۵
(۶) بحوالہ حیات جاوید، ص:۳۲۵
(۷) لیکچر پٹنہ ۱۸۸۳ء، مجموعہ لیکچر، ص:۱۵۰
(۸) حیات جاوید، ص:۱۳۸

# اردو کے خلاف محاذ آرائی

تین سال علی گڑھ میں رہنے کے بعد سرسید مئی ۱۸۶۷ء میں ترقی پا کر بنارس چلے گئے۔ بنارس کا قیام سرسید کے ذہن پر ہمیشہ کے لیے ایک اثر چھوڑ گیا اور جو تجربات انہیں بنارس میں ہوئے اس سے ان کے دل میں یہ خیال جم گیا کہ اب ہندو اور مسلمان امن و آشتی سے ہندوستان میں نہ رہ سکیں گے۔ آج تک فسادات کا سلسلہ ہندو اور مسلمانوں کے بیچ جاری ہے اور کسی بھی طرح صورت حال کے بدلنے کے آثار نظر نہیں آتے جب کہ اس صورت میں ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں ہی کا برابر کا نقصان ہے۔ قیام بنارس کے دوران سرسید کو اردو مخالف تحریک کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ ۱۸۶۷ء میں بنارس کو ہیڈکوارٹر بنا کر یہ تحریک چلائی گئی کہ اردو کو سرکاری زبان کے درجہ سے ہٹا کر اس کی جگہ دیوناگری رسم الخط والی ہندی زبان کو رواج دیا جائے اور بڑا شور غوغا پورے شمالی ہندوستان میں مچایا گیا۔

اس تجربہ سے پہلے اور بعد کو بھی سرسید نے جو کام بھی کیے وہ دونوں قوموں کی مشترکہ بھلائی کے لیے کیے حالانکہ اس سے پہلے راجہ رام موہن رائے کی خاص ہندوؤں کی اصلاحی تحریک اور غدر میں ہندوؤں کا انگریزوں سے ملاپ دو ایسے اہم واقعات تھے کہ ان کا اثر ہر انسان پر پڑنا لازمی تھا مگر اس کے باوجود بھی سرسید نے صلح و آشتی کا راستہ نہ چھوڑا کیونکہ وہ تمام انسانوں سے بلاتفریق مذہب وملت محبت کرنے والے تھے مگر وہ دیکھ رہے تھے کہ کچھ لوگ ایسے حالات پیدا کرنا چاہتے ہیں کہ ہندو اور مسلمان امن سے نہ رہ سکیں۔

> ''سرسید ہمیشہ اس اصول کے پابند تھے کہ ہندوستان کی بھلائی بغیر اس کے کہ ہندو مسلمان بطور ایک قوم کے مل جل کر رہیں کسی طرح ممکن نہیں چنانچہ ان کے تمام پچھلے کاموں میں اس اصول کی جھلک نمایاں طور پر نظر آتی ہے مگر بدقسمتی سے ایسے اسباب جمع ہو گئے تھے کہ دونوں قوموں کا متفق رہنا ممکن نہ تھا۔''[1]



ہم یہاں حالی کی زبان میں اردو ہندی کے تنازعہ کے متعلق ان کا مضمون نقل کرنا چاہتے ہیں جس میں کہ آج کے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے بہت عبرتیں پوشیدہ ہیں جو قوم پرور مسلمان آج ہندوستان میں مسلمانوں اور خاص طور سے اردو کی زبوں حالی کی ذمہ داری تقسیم وطن پر ڈالتے ہیں (حالانکہ تقسیم وطن کی ذمہ داری بھی قوم پرور قیادت کے سر جاتی ہے) اور قیام پاکستان کو اصلی سبب قرار دیتے ہیں ان کی آنکھیں کھولنے کے لیے یہ مضمون کافی ہے بشرطیکہ تعصب نے آنکھیں بند نہ کر دی ہوں۔ اس کو پڑھنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ہمسایوں کے آج کے خیالات اور ڈیڑھ سو سال پہلے کے خیالات میں سرمو فرق نہیں ہے اس وقت بھی اردو کو ختم کرنے کے لیے تحریکیں چلائی تھیں اور آج آزاد ہونے کے بعد اردو کو بالکل ختم کر دیا گیا۔ انگریزی دور حکومت میں اردو کو ختم نہ کیا جا سکا مگر آزادی کی روشنی میں اردو اندھیروں میں ڈبو دی گئی۔ آج یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اردو کو اس لیے نہیں رہنے دیں گے کہ اس نے پاکستان بنوایا۔ ۱۸۶۷ء میں کون سے پاکستان کا ذکر تھا آزادی کا ہی کوئی تصور تھا۔ قوم پرور مسلمانوں نے جن کے سردار مولانا آزاد تھے حق اور انصاف سے ہمیشہ منہ موڑا اور نتیجتاً غلط بیانیاں کیں اور خلاف حقائق ایسی باتیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ذہنوں میں ڈالیں جن سے کہ ہندو مسلمان کا ٹکراؤ بڑھا، گھٹا نہیں ٹکراؤ میں ہندو اور مسلمان اور ملک کسی کا بھی بھلا نہیں ہے سب کا نقصان ہے۔

## جو زندہ رہے گا دیکھے گا[2]

انگریزی مدارس کی تعلیم میں جس سے زیادہ تر ہندو مفید ہوتے تھے تاریخ ہندوستان کی وہ کتابیں یا ان کے ترجمے داخل تھے جو نہایت تعصب آمیز طریقہ پر لکھی گئی تھیں اور جن میں مسلمانوں کی برائیاں اور ظالمانہ کارروائیاں دانستہ یا نادانستہ نہایت تفصیل کے ساتھ درج تھیں۔ اس تعلیم کا نتیجہ تھا کہ ہندوؤں کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے نفرت اور ناگواری کا تخم جم جائے اور وہ رفتہ رفتہ ایک نہایت گھنا اور عظیم الشان درخت ہو جائے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا...... اس کے سوا مسلمانوں کا وقار جو ہندوستان کی قوموں کے دل میں مدت سے چلا آتا تھا وہ باقی نہ رہا تھا...... اردو زبان جو درحقیقت ہندی بھاشا کی ایک ترقی یافتہ صورت ہے۔ اس کو ہمارے ہم وطن بھائیوں نے صرف اس لیے مٹانا چاہا کہ اس کی ترقی کی بنیادی مسلمانوں کے عہد میں پڑی تھی۔

چنانچہ ۱۹۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو تمام سرکاری عدالتوں سے اردو زبان اور فارسی خط کو موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

''سرسید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا جب کہ مجھے یقین ہوگیا کہ اب ہندو مسلمان کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں دنوں میں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے میں مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہوکر میری گفتگو سن رہے تھے۔ آخر انھوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے اس سے پہلے تم ہمیشہ ہندوستانیوں کی بھلائی کا ذکر کیا کرتے تھے میں نے کہا اب مجھے یقین ہوگیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہوسکیں گی ابھی تو بہت کم ہے آگے آگے اس سے زیادہ عناد اور مخالفت ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں بڑھتا نظر آتا ہے جو جو زندہ رہے گا دیکھے گا۔ انھوں نے کہا کہ اگر آپ کی پیشن گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے میں نے کہا مجھے نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشن گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔''

غرض کہ ہندوؤں کی ایک قومی مجلس جو اس وقت بابو فتح نرائن سنگھ کے مکان پر بنارس میں قائم ہوئی تھی اس بات کی چھیڑ چھاڑ شروع ہوئی اور رفتہ رفتہ جا بجا اس کے لیے کمیٹیاں مجلسیں سبھائیں مختلف ناموں سے قائم ہوگئیں اور ایک صدر مجلس الہ آباد میں قائم ہوئی جسکے تحت تمام مذکورہ بالا مجلسیں اور سبھائیں تھیں............ الہ آباد کی صدر مجلس میں چند جلسے اس مسئلہ کی تحریک کے لیے منعقد ہوئے اور آخر کار مجلس کے سکریٹری بابو سردو پرشاد سنڈیال نے اس باب میں سرسید سے خط و کتابت شروع کی سرسید بطور اختلاف رائے ہر ایک کا جواب دیتے رہے اور یہ مباحثہ اخباروں میں مشتہر ہوتا رہا آخر سرسید نے اس کمیٹی کی صریح مخالفت



کی اور سوسائٹی اخبار میں متعدد آرٹیکل شائع کیے۔ الہ آباد کمیٹی نے بھی کئی درخواستیں اور بڑے بڑے محضر جن پر بے شمار ہندوؤں کے دستخط تھے حکومت میں بھیجے۔

۱۸۸۲ء میں جب سرسید وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے ایجوکیشن کمیشن میں ہندوؤں کو اردو کی مخالفت کا موقع پھر ملا اس دفعہ پہلے سے بھی زیادہ زور وشور کے ساتھ اس شمال مغرب اضلاع اور پنجاب کے ہندوؤں نے اردو زبان اور فارسی خط کی مخالفت میں کوشش کی تھی۔ دونوں صوبوں میں بے شمار سبھاؤں اور انجمنوں کی طرف سے بڑے بڑے طولانی محضر اور میموریل کمیشن میں پیش کیے گئے چنانچہ سرسید کے بعض مسلمان دوستوں نے بھی پنجاب میں انجمن حمایت اردو قائم کی اور میموریل کمیشن میں بھیجے مگر کمیشن نے دونوں پارٹیوں کی درخواست پر کچھ رائے نہیں دی۔ سرسید نے کمیشن پر یہ ظاہر کردیا تھا کہ یہ مسئلہ ایجوکیشن کمیشن سے کچھ علاقہ نہیں رکھتا بلکہ ایک بہت بڑا پولیٹیکل مسئلہ ہے۔

اس کے بعد مارچ ۱۸۹۸ء میں جس کی ستائیسویں کو سرسید نے دنیا سے رحلت کی گورنر اضلاع شمال مغرب واودھ کی خدمت میں دونوں صوبوں کے بڑے بڑے معزز ہندوؤں نے پھر ایک میموریل اس عرض سے گزارا کہ تمام سرکاری عدالتوں اور کچہریوں میں بجائے اردو زبان اور فارسی خط کے ہندی بھاشا اور ناگری خط جاری کیا جائے۔ اگرچہ سرسید پر اس زمانہ میں ہجوم رنج والم کے سبب سکتہ کا سا عالم طاری تھا کہ وہ بالکل نقش دیوار بن گئے تھے مگر اسی حالت میں انھوں نے اس مضمون پر ایک آرٹیکل لکھا جو ۱۹/مارچ کے گزٹ میں سرسید کی وفات سے نو دن پہلے شائع ہوا اور جو کمیٹی مسلمانوں نے الہ آباد میں اردو کی حمایت کے لیے قائم کی تھی اس کو اس باب میں بذریعہ تحریر کے کچھ مشورے دیے تھے انکو یقین تھا کہ ہندوؤں کا یہ کام درحقیقت محض قومی تعصب پر مبنی ہے اس لیے وہ ہندو دوستوں کی ناراضگی کی مطلق پرواہ نہ کرتے تھے......

فرانس کے مشہور اورنیشلسٹ گارساں دتاسی جنھوں نے اردو زبان کی تحقیقات میں اپنی عمر صرف کی ہے وہ اس مسئلہ کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''ہندو اپنے تعصب کی وجہ سے ہر ایک ایسے امر کے مزاحم ہوتے ہیں جو ان کو مسلمانوں کی حکومت کا زمانہ یاد دلائے۔'' اسپین والوں نے بھی مسلمانوں کے زوال کے بعد اسی طرح ان کی نشانیاں مٹائی تھیں مگر انھوں

نے اپنی حکومت کے زمانے میں ایسا کیا تھا اور ہمارے ہم وطن بھائی محکوم ہونے کی حالت میں ایسا ارادہ رکھتے تھے۔''۳؎

۱۹۴۷ء میں ملک آزاد ہوا سیکولر جمہوری ملک میں بسنے والی تمام قومیں اس کی حکمراں ہیں مگر بعض لوگ اسے جمہوری ملک نہیں مانتے لہٰذا تمام زبانوں کو یکساں ترقی کے مواقع فراہم نہیں کیے گئے۔ اس تعصب کی سب سے زیادہ شکار اردو ہوئی جو کہ ملک کی بلا شبہ سب سے خوبصورت اور سب سے زیادہ سمجھی جانے والی زبان ہے۔ اردو ہندی کا جھگڑا بہت پرانا ہے اسے ۱۹۴۷ء کے واقعات سے جوڑنا محض تاریخی حقیقتوں سے ناواقفیت کا اقرار کرنا ہے یا عوام کو اندھیرے میں رکھنا ہے مگر زیادہ دنوں تک کذب نہیں چلتا اور آخر کار سچ کی فتح ہوتی ہے۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد اپنی مشہور تصنیف ''ہندوستان کا مستقبل'' میں اس تاریخی حقیقت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اپریل ۱۹۰۱ء میں صوبۂ متحدہ کی حکومت نے ایک تجویز پیش کی جس کی وجہ سے صوبہ میں اردو ناگری کی تحریک شروع ہوگئی۔ ہندوؤں نے حکومت کی اس تجویز کی تائید کی کہ عدالتوں کی کارروائی میں ناگری رسم الخط استعمال کیا جا سکتا ہے اور مسلمانوں کی طرف سے اس کی مخالفت ہوئی۔ کئی سال سے ہندو اس بات کی تحریک کر رہے تھے کہ ناگری رسم الخط کی اجازت مل جائے لیکن سرسید کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی نہ ہوتی تھی۔''۴؎

اردو کی مخالفت کی داغ بیل ۱۸۶۷ء میں ہی پڑ گئی تھی۔ شمالی ہند کے تمام سربرآوردہ ہندو اردو ہٹانے کی تحریک متحد ہو کر چلا رہے تھے۔ سرسید اسی زمانے سے اردو کو بچانے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے اور بقول راجندر پرشاد اردو کو ہٹانے کی تحریک سرسید کی مخالفت کی وجہ سے کامیابی سے ہمکنار نہ ہوتی تھی لہٰذا ۱۸۹۸ء میں سرسید کے انتقال کے بعد تحریک ایک بار پھر زور وشور سے اٹھی اور اس بار ہندوؤں کو کامیابی ملی کہ صوبۂ متحدہ وغیرہ سے اردو کو ہٹا کر ہندی رائج کر دی گئی۔ ایک بار پھر اس فیصلہ کی مخالفت کی ذمہ داری جانشین سرسید محسن الملک نے نبھائی۔ اردو کے تحفظ کے لیے کمیٹیاں بنائی گئیں۔ محسن الملک



ان کے روح رواں بنے۔ نتیجتاً محسن الملک کو حکومت کے دباؤ میں آکر کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دینا پڑا کہ انگریز پوری طرح ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے تھے اور علی گڑھ کالج کو بھی اردو کی حمایت کی تحریک کی وجہ سے ایک طرح سے ختم کر دینے کے درپے ہو گئے تھے۔ لہٰذا محسن الملک سے یہ کہا گیا کہ یا تو اردو کی حمایت بند کر دیں یا علی گڑھ کالج کی سکریٹری شپ سے استعفیٰ دیدیں۔ اردو کو سرے سے ختم کر دینے کی تحریکیں چلتی رہیں بالآخر آزادئ وطن کے بعد اس زبان کو کلیتاً ختم کر دیا گیا حالانکہ اردو ہندو اور مسلمان دونوں نے مل کر بنائی لیکن کیونکہ اس کی بنیاد مسلمانوں کے عہد میں پڑی لہٰذا برادران وطن کو اس کا وجود منظور نہیں۔ ہم جو آج زندہ ہیں سرسید کی پیشن گوئی کو حرف بہ حرف پورا ہوتے ہوئے دیکھ رہے ہیں۔ اردو کے خلاف تحریک اس قدر بڑھی کہ آزاد ہندوستان میں اس کا نام و نشان تک باقی نہیں۔ مسجدوں، مکتبوں اور مسلمانوں کے مدرسوں میں یہ زبان باقی بچ گئی ہے حکومت کی یونیورسٹیوں و کالجز میں دور دور تک اس کا نام ونشان نہیں۔ اردو کا روزی روٹی سے تعلق بالکل ختم کر دیا گیا۔ اب سیکڑوں ہزاروں میل کا سفر کرتے ہوئے چلے جایئے کہیں اردو کا ایک حرف بھی لکھا ہوا نظر نہیں آئے گا۔ بعض پرائمری اسکولوں میں یہ زبان آج بھی پڑھائی جاتی ہے مگر اس کا پروپیگنڈہ اس قدر کیا جاتا ہے گویا حکومت سارا زور اردو کی ترقی پر لگائے ہوئے ہے۔ پورے ملک میں کہیں بھی اردو کو سرکاری زبان کا درجہ نہ مل سکا حالانکہ حامیان اردو اب محض دوسرا درجہ دینے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ مسلمان اب اس پر بھی بہت زیادہ خوش ہو جائے گا اگر اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ ہی دے دیا جائے اتر پردیش جہاں مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد رہتی ہے آج تک باوجود یاددہانیوں اور الیکشن کے موقعوں پر وعدوں کے اردو کو کوئی سرکاری درجہ نہیں مل سکا ہے۔۵؎

○

**حواشی:**

(۱) حیات جاوید، ص:۱۳۷ (۲) مضمون حالی، حیات جاوید، ص:۱۳۷

(۳) راجندر پرشاد، ص:۲۱۲ (۴) مضمون حالی ختم ہوا

(۵) حیات جاوید، ص:۲۰۰

# ہندوستان میں بہت سی قومیں بستی ہیں

# لوکل سلف گورنمنٹ بل پر سرسید کی ترمیم

غدر کے بعد ہندوستان ۱۸۵۸ء میں باقاعدہ تاج برطانیہ کی حکومت قائم ہوئی اور بجائے ایسٹ انڈیا کمپنی کے برطانوی پارلیمنٹ کی حکمرانی ہندوستان پر قائم ہوگئی۔ ہندوستان میں پہلی بار کسی عوامی نمائندہ مجلس کو اختیارات حاصل ہوئے چاہے وہ نمائند جماعت کسی دوسرے ملک کے عوام نے بنائی تھی۔ اس کا لامحالہ اثر ہندوستانی نظام پر بھی ہوتا تھا۔ لہٰذا اسباب بغاوت ہند کی اشاعت اور اس پر برطانوی پارلیمنٹ میں بحث کے بعد ہندوستان میں وائسرائے کی کونسل میں ہندوستانیوں کو شامل کیا گیا اور بڑے بڑے عہدوں کے دروازے غیر انگریزوں کے لیے کھول دیے گئے۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی میونسپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ کونسلوں میں عام نمائندگی کی شروعات تھی۔ اس خیال کو قانون بنانے کے لیے اٹھارہ مئی ۱۸۸۲ء کو وائسرائے کی کونسل میں لوکل سلف گورنمنٹ بل پیش ہوا۔ اس بل پر سرسید نے اپنی زندگی کی بہت اہم تقریر کی اور اس میں پہلی بار اپنے نظریۂ قومیت کی وضاحت کی کہ ہندو مسلمان اور دوسری قومیں ملک میں رہتی ہیں اور ایک کی بالادستی دوسری قوم کے لیے نقصان دہ ہوگی یہ واقعہ کانگریس کے قیام سے تین سال پہلے کا ہے۔ جب سرسید نے ان خیالات کا اظہار کیا اس وقت کانگریس کا تصور تک نہ تھا لہٰذا یہ کہنا کہ سرسید کے سیاسی خیالات کانگریس کی مخالفت میں قائم ہوئے غلط ہے بلکہ سرسید کے نظریہ کی مخالفت میں جب کانگریس نے اپنے مشن کی شروعات کی تو لامحالہ سرسید کو اس کی مخالفت میں کمربستہ ہونا ہی تھا۔

اپنے ان خیالات کی بنیاد پر کہ ہندوستان میں تمام قوموں کی تعلیمی و اقتصادی پوزیشن



برابر نہیں ہے اور تعداد میں بھی بہت زیادہ فرق پایا جاتا ہے۔ سرسید نے اس بل پر ایک بہت مدلل تقریر کی اور انھیں کی کوششوں سے ایک بہت اہم ترمیم اس میں پاس ہوئی جس کی رو سے ایک تہائی ممبروں کا تقرر حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا تاکہ مسلمان جو کہ اپنی تعداد کم ہونے کی وجہ سے ان انجمنوں میں زیادہ نہیں آپائیں گے ان کو نامزد کیا جاسکے۔

> ''گورنمنٹ کو لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں کے واسطے ممبروں کے مقرر کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ جس کی تعداد کل ممبروں کی ایک ثلث سے زیادہ نہ ہو۔ مسودہ کی اس دفعہ کو میں بالکل پسند کرتا ہوں اور چوں کہ یہ اول ہی موقع ہے جبکہ لوکل سلف گورنمنٹ کا معاملہ قانونی کونسل میں پیش ہوا ہے اس وجہ سے میں اس امید کے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ اس پالیسی کا اظہار ہے جو گورنمنٹ قانون بنانے کے باب میں اور صوبوں کے واسطے بھی اختیار کرنا چاہتی ہے۔''[1]

سرسید کے ذہن دوررس میں یہ اشکال ابھرنے لگا تھا کہ چوں کہ حکومت لوکل بورڈوں میں ریپریزنٹیشن کا اصول جاری کررہی ہے۔ لہٰذا آئندہ یہ اصول پورے طور سے ملک کی ہر انجمن میں رائج ہوگا۔ لہٰذا اسی وقت سرسید نے اس کی نشاندہی کی اور کہا کہ اس اصول کو برطانیہ کی طرح رائج کرنے میں بہت خرابیاں بھی ہیں اور چونکہ برطانیہ کی طرح ہندوستان میں ایک قوم نہیں رہتی اس لیے برطانیہ کا سادہ اصول ریپریزنٹیشن ہندوستان پر لاگو نہیں ہوسکتا۔

> ''مجھ کو یقین ہے کہ ہندوستان کا کوئی حصہ اب تک اس درجہ کو نہیں پنچا ہے جب ریپریزنٹیشن کا اصول معاملات مختص المقام کے لحاظ سے بھی پورا پورا ہندوستان میں جاری کیا جاوے۔ ریپریزنٹیٹو اداروں کے ذریعہ سے سلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے عمدہ سبق ہے جو انگلستان کی فیاضی ہندوستان کو سکھا دے گی۔ لیکن انگلستان سے اس اصول کو مستعار لینے میں ان سوشل اور پولیٹکل معاملات کو یاد رکھنا

نہایت ضروری ہے جس کے لحاظ سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان امتیاز پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی موجودہ سوشل اور پولیٹیکل حالت کئی صدیوں کی خود مختار حکومت اور ایک قوم کی دوسری قوم پر ایک مذہب کے دوسرے مذہب پر غلبہ حاصل کرنے کا نتیجہ ہے۔''۲؎

مختلف قوموں کے مذہبی وتمدنی اختلافات اوران کے باہمی تعلیمی فرق کوواضح کرتے ہوئے ظاہر کیا کہ ان حقائق کو مدنظر رکھنا بہت ضروری ہے۔

''ہندوستان فی نفسہ ایک براعظم ہے اور اس میں مختلف اقوام اور مختلف مذاہب کے آدمی کثرت سے رہتے ہیں مذہبی دستورات کی سختی نے اب تک ہمسایوں کو بھی ایک دوسرے سے جدا رکھا ہے اور ذات کا قاعدہ اب تک بڑے زوروشور سے جاری ہے۔ ممکن ہے کہ ایک ہی ضلع میں مختلف مذاہب اور مختلف فرقوں کے باشندے ہوں اور جس حالت میں کہ باشندوں کا ایک گروہ دولت منداو رصاحب تجارت ہوتو دوسرا گروہ باعلم اور ذی رعب ہو۔ ممکن ہے کہ ایک گروہ بلحاظ تعداد کے دوسرے گروہ سے بڑا ہو...... ایک قوم بخوبی اس سے واقف ہو کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں ان کی طرف سے ممبروں کا شریک ہونا نہایت ضروری ہے اور دوسری قوموں کو مطلق اس کی پرواہ نہ ہو۔ پس ان صورتوں میں اس بات سے انکار کرنا شاید ہی ممکن ہے کہ ہندوستان میں ریپریزنٹیشن کے جاری کرنے سے بڑی مشکل اور پولیٹیکل وسوشل خطرات پیدا ہوں گے۔''۳؎

## ہندوستان میں ایک قوم نہیں بستی

سرسید نے ظاہر کیا کہ جس ملک میں اس طرح کے اختلافات نہ پائے جاتے ہوں، ریپریزنٹیشن کا اصول نہایت مناسب ہے لیکن ہمارے ملک کی حالت ایسی نہیں ہے جیسی کہ برطانیہ میں رہنے والے وطن اور مذہب کے متحد ہونے سے ایک قوم ہوگئے ہیں۔ عیسائیوں کو یہودیوں کی بھلائی کے کسی کام میں ان کا ساتھ دینے سے انکار نہیں ہوتا اور حقیقتاً یہ



کہا جاسکتا ہے کہ سوشل و پولیٹیکل معاملات میں کل برطانیہ کے باشندے ایک قوم ہیں مگر ہندوستان میں رہنے والے مذہبی، سوشل و پولیٹکل اختلافات کی وجہ سے مختلف قوموں میں بٹے ہوئے ہیں۔

''قوم و مذہب کے متحد ہونے سے انگریزی قوم ایک قوم ہوگئی ہے اور تعلیم کی ترقی سے خفیف اختلافات ان معاملات میں جو بیشتر ملک کی بہبودی سے متعلق ہیں بالکل ناچیز ہوگئے ہیں۔ عیسائیوں کو پارلیمنٹ میں اپنے مطلب کی حمایت کے واسطے یہودیوں کی نسبت ووٹ دینے میں کچھ عذر نہیں ہوتا اور درحقیقت سوشل و پولیٹیکل مقاصد کے واسطے یہ کہا جاسکتا ہے کہ انگلستان کی کل آبادی ایک ہی قوم ہے۔ بلاشبہ یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کی نسبت ایسا نہیں کہا جاسکتا ............ ان ملکوں میں جہاں کہ آبادی صرف ایک قوم اور ایک مذہب سے مرکب ہوئی ہے یہ قاعدہ بلاشبہ سب سے عمدہ ہے جو جاری کیا جاسکتا ہے۔''۴؎

## سادہ جمہوری اصول غلط ہے

ہندوستان میں رہنے والی قوموں میں تعلیمی واقتصادی نابرابری کو دیکھتے ہوئے سرسید نے ریپریزنٹیشن کے سادے اصول کو جاری کیے جانے کی مخالفت کی اور کہا کہ اگر ایسا کیا گیا تو ملک میں بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے اور قوم و مذہب کا اختلاف نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

''لیکن مائی لارڈ ایک ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے جہاں کہ ذات کے اختلافات اب تک موجود ہیں اور جہاں مختلف قومیں خلط ملط نہیں ہوئی ہیں اور جہاں کہ مذہبی اختلافات اب تک زوروشور پر ہیں اور جہاں کے علم نے اپنے جدید معنی کے لحاظ سے باشندوں کے تمام فرقوں میں ایک مساوی مناسبت کے ساتھ ترقی نہیں کی ہے۔ مجھ کو یقین ہے کہ لوکل بورڈوں اور ضلع کی کونسلوں میں مختلف مطالب کی حمایت کی غرض سے الیکشن کے خالص اور سادہ

اصول کے جاری کرنے سے محض تمدنی خیالات کی نسبت زیادہ تر بڑی خرابیاں پیدا ہوں گی جب تک کہ قوم اور مذہب کے اختلافات کا امتیاز ہندوستان کی سوشل و پولیٹیکل حالت میں ایک جزو اعظم رہے گا۔..........اس وقت تک الیکشن کا خالص قاعدہ طمانیت کے ساتھ جاری نہیں کیا جا سکتا۔''۵

الیکشن کے خالص اور سادے اصول سے مراد وہ طریقہ ہے جو کہ آج بھارت میں رائج ہے یعنی بغیر مسلمانوں اور دوسرے طبقوں کو بسبب ان کی تعداد کی کمی اور تعلیمی پسماندگی کے، برابری پر لانے کے لیے نمائندہ اداروں میں رزرویشن کا نہ دیا جانا اور ہر انسان کے ووٹ کی قیمت برابر ہونا۔ سرسید نے کہا کہ اگر سادہ اصول جاری ہوا تو بڑی قوم چھوٹی قوم پر حاوی آجائے گی اور مذہبی اختلافات پہلے کی نسبت اور بڑھ جائیں گے جس میں کہ تمام قوموں کا نقصان ہے۔

''بڑی قوم چھوٹی قوم کے مطالب پر بالکل غالب آجاوے گی۔ قوم اور مذہب کے اختلافات بہ نسبت سابق کے اور بھی زیادہ سخت ہو جاویں گے۔ مائی لارڈ! میں نے اس معاملے کی نسبت اس قدر تفصیل کے ساتھ اس امر کی تشریح کرنے کی غرض سے گفتگو کی ہے کہ میں نے ریپریزنٹیٹو طریقے کا سچا حامی ہو کر کس وجہ سے اس مسودہ کے ان احکام کی دلی تائید کی ہے جو الیکشن کے خالص طریقہ کے برخلاف معلوم ہوتے ہیں۔ گورنمنٹ نے جو لوکل بورڈوں اور ضلع کونسلوں کے ایک ثلث ممبروں کے مقرر کرنے کا اختیار اپنے ہاتھ میں رکھا ہے اس سے گورنمنٹ نے یہ تدبیر اختیار کی ہے جو ہندوستانی رعایا کے مختلف فرقوں کی طرف سے ممبروں کے تقرر میں اس قسم کی مناسب اور واجبی مساوات قائم رکھے جو الیکشن کے خالص قاعدے کے ذریعہ سے حاصل نہ ہوگی۔''۶

سرسید نے سادہ اصول کے مقابلے میں رزرویشن کے اصول کو پسند کیا ایک تہائی



ممبروں کا تقرر اپنے ہاتھ میں رکھنے کا مطلب یہ ہی تھا کہ جو طبقات تعداد کی کمی کی وجہ سے نمائندہ انجمنوں میں اپنی پسند کے ریپریزنٹیٹو نہ بھیج سکیں ان کا نومنشین حکومت اپنی طرف سے کر دے تاکہ کونسلوں میں ہندو مسلمانوں اور دیگر اقوام کی تعداد برابر برابر ہو سکے اور ملک میں تفرقہ پیدا نہ ہو۔

سرسید کی یہ مسلمانوں کے لے ایک عظیم خدمت ہے کہ انھوں نے ہی یہ ترمیم اس بل میں پیش کی تھی تا کہ مسلمانوں کی نمائندگی بڑھ سکے ورنہ حکومت خالص اور سادہ اصول کو ہی لاگو کرنا چاہتی تھی اور یہ فطری بھی تھا کیوں کہ برطانیہ میں اس طرح کا کوئی مسئلہ نہ تھا اور وہیں کا یہ اصول ہندوستان میں رائج کیا جا رہا تھا۔ لہٰذا سرسید اگر قومی اختلافات کی نشاندہی نہ کرتے تو سادہ اصول ہی جاری ہوتا اور مسلمانوں کی نمائندگی اپنی تعداد کے لحاظ سے زیادہ سے زیادہ پندرہ فیصد ہوتی جس میں آدھے سے زیادہ ایسے ہوتے جیسے کہ آج کل ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر راجندر پرشاد کو اعتراف ہے کہ:

''۱۸۸۲ء میں جب کہ لوکل سلف گورنمنٹ بل کونسل میں پیش ہوا تھا تو انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ چوں کہ ہندوستان میں مختلف مذہبوں کے اور مختلف رسم و رواج کے لوگ آباد ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ بورڈ کی کچھ نشستیں حکومت کی نامزدگی کے ذریعہ پُر کی جائیں اور یہ طے پایا کہ ایک تہائی نشستیں اس طریقے پر پُر کرنی چاہئیں تا کہ ایسے آدمیوں کو حکومت منتخب کر کے کمی پوری کر دے تا کہ جو کسی مخصوص فرقے کے نمائندے تو ہیں لیکن انتخابات میں نہیں آئے ہیں۔''۷

○

**حواشی:**

(۱) مجموعہ لکچر مرتبہ امام الدین گجراتی، ۱۹ء، ص:۱۴۰ (۲) ایضاً
(۳) ایضاً (۴) ایضاً، ص:۱۴۱
(۵) ایضاً (۶) ایضاً
(۷) راجندر پرشاد، ہندوستان کا مستقبل، ص:۱۹۵

# قیامِ کانگریس

ابھی سرسید کے مدرسہ کو بنے ہوئے صرف دس سال کا عرصہ گزرا تھا اور مسلمانوں کی ایک نسل بھی تعلیم یافتہ ہو کر نہ نکلی تھی کہ ملک میں ایک بہت اہم مجلس کا وجود عمل میں آیا۔ یہ مجلس انڈین نیشنل کانگریس تھی جو ۱۸۸۵ء میں ارڈ فرن وائسرائے ہند کے مشورہ پر سرہیوم نے قائم کی۔ سرسید کی زندگی میں غدر کے بعد یہ سب سے اہم واقعہ تھا کہ اس مجلس کے ذریعہ اگر مسلمان جوشیلی سیاست میں شامل ہو جاتے تو سرسید کی زندگی کے سارے منصوبے فیل ہو جاتے۔ بڑی مشکل سے ۱۸۵۷ء کی لٹی پٹی قوم کو سرسید نے کسی طرح اس قابل بنایا تھا کہ وہ دوبارہ سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔ پوری زندگی کی کوششوں کا حاصل یہ تھا کہ کسی طرح لٹتے پٹتے علیگڑھ میں ایک مدرسہ قائم کیا تھا۔ بڑی مشکلوں اور کاوشوں سے مسلمانوں کو نئی تعلیم حاصل کرنے پر رضامند کیا تھا کہ ہندوستان میں انگریزوں اور ہندوؤں نے مل کر ایک زبردست سیاسی پیش قدمی کی کہ ملک کی پہلی سیاسی انجمن تشکیل دی۔ حالانکہ اس انجمن کا مقصد محض حکومت کو رعایا کے مطالب سے آشنا کرانا تھا اور حکومت پر صحتمند نکتہ چینی کرنا تھا۔ مگر جیسا کہ ۱۸۸۲ء کے لوکل سلف گورنمنٹ بل سے ثابت ہے کہ حکومت ملک میں نیابتی ادارے قائم کرنا چاہتی تھی اور زیادہ سے زیادہ مراعتیں ہندوستانیوں کو دینا چاہتی تھی۔ جس طریقہ سے الیکشن کے سادے اصول کو رائج کیا جا رہا تھا اور جو مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے وہ سب کے سب مسلمانوں کے لیے شدید نقصان دہ تھے۔ سرسید چاہتے تھے کہ قوم پڑھ لکھ کر تیار ہو جائے بعد کو پھر کسی سیاسی عمل میں شریک ہو مگر کانگریس کا قیام ایک ایسا واقعہ تھا جس نے سرسید کی راہ بدل دی اور انھیں وقت سے پہلے ہی اپنے سیاسی نظریات کو مشتہر کرنا پڑا کہ مسلمان سیاست میں کیا کریں۔ اس وقت سوائے سرسید کوئی مسلمان اس پائے کا نہ تھا جس کی بات مسلمان کان دھر کر سنتے۔



سرسید کی کاوشیں رائیگاں نہیں گئیں اور مسلمانوں نے بالعموم سرسید کے مشورے کو مانا اور کانگریس کے شوروغوغا سے الگ رہے۔

بنگال، مدراس اور بمبئی میں انگریز زیادہ عرصہ سے حکومت کر رہے تھے۔ لہٰذا انھیں علاقوں میں انگریزی تعلیم کا اثر پہلے ہوا۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے برخلاف بڑے اشتیاق اور جوش سے نئی تعلیم حاصل کی تھی۔ اسی وجہ سے ان علاقوں کے ہندوؤں میں انگریزی سیاست و نیابتی طرز حکومت کے فوائد ان کی سمجھ میں آنے لگے تھے۔ انھوں نے حکومت میں یہ درخواستیں گزارنی شروع کیں کہ ہندوستان میں بھی پارلیمانی طریقے رائج کیے جائیں۔ حکومت عام بے چینی کی اطلاعات پہنچ رہی تھیں اور شکایتیں جمع ہوتی جا رہی تھیں۔

> ’’مسٹر ہیوم ایک برطانوی عہدیدار تھے۔ ان کو یہ معلوم ہوا کہ ملک میں سیاسی بے چینی اور خفیہ سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہندوؤں کے مذہب گرو اور چیلے ان سازشوں کو آگے بڑھا رہے ہیں۔ ان کے مدنظر یہ ہے کہ یکا یک شورش پھیل جائے قابل نفرت لوگ کم ہوں، ساہوکاروں کو لوٹا جائے اور پھر لوگوں کے تعاون سے قومی بغاوت کی جائے۔ دکن میں واقعی کاشتکاروں نے بلوے کیے اس پر ہیوم کو یہ خیال پیدا ہوا کہ کوئی ایسا نظام چاہیے جس کے ذریعہ ہندوستانیوں کے دلوں کا بخار نکلتا رہے تا کہ وہ خفیہ سازشوں کی طرف مائل نہ ہوں۔‘‘[1]

ہندوؤں کے پاس پہلے سے بت سی مقامی انجمنیں تھیں مثلاً انڈین ایسوسی ایشن، بمبئی ایسوسی ایشن، ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن، مدراس میں مہاجن سبھا تھی اور پونا میں سروجنک سبھا اور ان میں ایسے تعلیم یافتہ لوگ بھی تھے جو کہ یہ انجمنیں قائم کر رہے تھے اور چلا رہے تھے مگر سب صوبائی انجمنیں تھیں اور پورے ہندوستان کی کوئی انجمن نہ تھی۔ غالباً اس وجہ سے کہ ہندوؤں میں اس وقت تک پورے اور متحدہ ہندوستان کا تصور ہی نہ تھا۔ ہیوم نے وائسرائے سے مل کر ایسی آل انڈیا انجمن کا خاکہ مرتب کیا جس میں ہندوستانی اپنے معاشرتی مسائل پر گفتگو کریں اور اس کے سالانہ جلسوں کی صدارت صوبائی گورنر کیا کریں۔

''مسٹر ہیوم شملہ گئے، وہاں انھوں نے وائسرائے سے مشورہ کیا۔ کئی روز ہیوم کی اسکیم پر غور کرنے کے بعد لارڈ ڈفرن نے ہیوم کو طلب کیا اور کہا کہ یہ اسکیم کچھ زیادہ مفید نہیں ہوگی۔ اس ملک میں کوئی ایسی جماعت موجود نہیں ہے جو اس قسم کی خدمات انجام دے جو انگلستان میں ہز مجیسٹی کی ضرب اختلاف کر رہی ہے۔ اخبارات اگر لوگوں کی ترجمانی کرتے بھی ہیں تو وہ قابل اعتماد نہیں ہوتی اور انگریز اس سے بے خبر ہیں کہ ہندوستانی حلقوں کا ان کے اور ان کی پالیسی کے متعلق کیا خیال ہے۔ انگریزوں اور رعایا دونوں کے مفاد کے لیے یہ بہتر ہوگا کہ ہندوستانی اہل سیاست سال میں ایک مرتبہ جمع ہوں اور گورنمنٹ کو یہ بتائیں کہ انتظامات میں کیا خرابیاں ہیں اور ان کی کیوں کر اصلاح ہوسکتی ہے اور یہ کہ ایسی انجمن کی صدارت لوکل گورنروں کو نہیں کرنی چاہیے کیوں کہ ان کی موجودگی میں لوگ اپنے دل کی بات نہ کہہ سکیں گے۔''۲؎

مسٹر ہیوم لارڈ ڈفرن کے دلائل سے متاثر ہوئے انھوں نے اپنی اور لارڈ ڈفرن دونوں کی اسکیمیں کلکتہ، بمبئی اور مدراس کے اہل سیاست کے سامنے پیش کردیں انھوں نے بھی لارڈ ڈفرن کا مشورہ متفقہ طور سے پسند کیا۔ لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم سے یہ عہد لے لیا تھا کہ جب تک وہ ہندوستان میں رہیں یہ ظاہر نہ کیا جائے کہ یہ ان کی اسکیم ہے۔ چنانچہ اہل سیاست کے علاوہ جن سے ہیوم نے مشورہ کیا تھا اور کسی پر یہ بات ظاہر نہیں کی گئی۔

اسی وقت سے کانگریس کے قیام کی کوششیں شروع ہوگئیں۔ وائسرائے کی منظوری لینے کے بعد ہیوم انگلستان گئے۔ وہاں انھوں نے انگریز لیڈران اور عمائدین سے کانگریس قائم کرنے کے متعلق مشورہ کیا اور انگلستان میں انڈین پارلیمنٹری کمیٹی قائم کی، جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی پارلیمنٹ کے انتخابات میں جو انگریز امیدوار ہوں ان سے یہ حلف لیا جائے کہ وہ ہندوستان کے معاملات میں دلچسپی لیں گے یہ بھی قابل توجہ بات ہے کہ انگریزوں نے کانگریس قائم کرنے کے لیے مسلمانوں سے مشورہ تک نہیں کیا شامل کرنا تو دور کی بات



ہے۔ کانگریس کا پہلا اجلاس ۲۸؍دسمبر ۱۸۸۵ء کو گوکل داس تیج پال سنسکرت کالج بمبئی کے ہال میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں انگریزوں سے وفاداری کو ہندوستانی رعایا کے لیے ضروری قرار دیا گیا اور اس کے علاوہ جو مبہم اغراض و مقاصد منظور ہوئے ان میں یہ ایک خصوصیت سے قابل توجہ ہے۔

''اور قومی وحدت کے اس جذبے کی پوری پوری ترقی اور استحکام جس کی بنیاد ہمارے محبوب لارڈ رپن کے اس عہد میں پڑی دواماً قابل یادگار رہے۔''۳؎

کانگریس اور اس کے باغیوں کی طرف سے یہ اس حقیقت کا بالکل صحیح اعتراف ہے کہ اس سے قبل ہندوؤں میں نہ قومی وحدت کا کوئی تصور موجود تھا اور نہ یہ جذبہ ان میں موجود تھا۔ اس کے لیے وہ لارڈ رپن کے عہد حکومت کے مرہون منت ہیں۔ اس کو ترقی دینے کا سامان لارڈ ڈفرن اور ان سب انگریز ماہرین سیاست نے کیا جو اس مشورے میں شریک تھے۔ کانگریس انگریزوں نے پیدا کی۔ اس کی پرورش انگریزوں نے کی اور عرصہ دراز تک اس کی قیادت بھی انگریز ہی کرتے رہے۔ سر ولیم ویڈر برن دوسری کانگریس کے سالانہ اجلاس کے صدر ہوئے۔ کانگریس کے چوتھے اجلاس کی صدارت مسٹر ڈیوڈ ویلی نے کی اس کے ساتھ ہی یہ ایک معمول تھا کہ کانگریس کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لیے انگلستان سے با اثر انگریز آتے تھے جو عموماً پارلیمنٹ کے ممبر ہوا کرتے تھے۔

### سر سید پر الزام وفاداری اور وفادار کانگریس

سر سید پر وفاداری کا الزام لگانے کا مقصد محض آج کی مسلمان نسلوں کو احساس کمتری میں مبتلا کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ درحقیقت اس تھیوری کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ اس کی بہت سی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں۔ جبکہ سر سید نے اپنی جان تک کی بازی لگا کر انگریز حکمرانوں کے سامنے کلمۂ حق ادا کیا اور ہندوستان کی تمام عوام کو راحت پہنچائی۔ مثال کے طور پر ہم صرف دو واقعات کی طرف اشارہ کرنا کافی سمجھتے ہیں۔ پہلا اسباب بغاوت ہند کی تصنیف اور دوسرا آگرہ دربار سے محض اس لیے اٹھ کر چلے جانا کہ انگریزوں کی کرسیاں ہندوستانیوں کی کرسیوں سے اوپر بچھائی گئی تھیں۔ وہ تو مطلق العنان

حکومت تھی اور گولی کے زور پر حاصل کی گئی تھی۔ آج کیا ہے؟ جمہوری ہے سیکولرزم ہے اور برابر کے حقوق ہیں پھر بھی کلمۂ حق کہنا ایسا جہاد بن کر رہ گیا ہے جس کو عمل میں لانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

''آگرے کے دربار کے موقع پر وہ صرف اس وجہ سے اٹھ کر باہر چلے آئے تھے کہ وہاں یورپین لوگوں کے لیے ڈائس پر کرسیاں بچھائی گئی تھیں اور ہندوستانیوں کے لیے ڈائس کے نیچے۔''[۴]

اب ذرا کانگریس کی وفاداری پر نظر ڈالتے چلیں۔ کانگریس کے پہلے صدر مسٹر بنرجی نے خطبۂ صدارت ۱۸۸۵ء میں فرمایا۔

''برطانوی حکومت کا پورا پورا اور مستقل خیر خواہ مجھ سے زیادہ اور میرے دوستوں سے زیادہ جو میرے گرد بیٹھے ہیں اور کوئی نہیں ہے۔''[۵]

دادا بھائی نوروجی دوسرے سال کے خطبۂ صدارت میں رقم طراز ہیں:

''ہم کو مردوں کی طرح بولنا اور اعلان کرنا چاہیے کہ ہم اپنی ریڑھ کی ہڈی تک وفادار ہیں۔ ہم ان فوائد کو سمجھتے ہیں کہ انگریزی حکومت نے ہم کو عنایت کیے ہیں ہم ان کی تعلیم کی دل سے قدر کرتے ہیں جو ہم کو دی گئی ہے اور اس نئی روشنی کو جو ہم پر ڈالی گئی ہے۔ ہمارے اندھیرے کو اس نے اجالا کر دیا ہے اور ہم کو یہ نیا سبق دیا ہے کہ بادشاہ رعایا کے لیے بنائے گئے ہیں۔ رعایا بادشاہ کے لیے نہیں بنی ہے اور یہ نیا سبق ہم نے آزاد انگریزی تمدن کی روشنی میں پڑھا ہے۔''[۶]

سر فیروز شاہ متہ نے ۱۸۹۰ء میں کہا:

''ہماری وفاداری کا مسئلہ ہمیشہ کے لیے طے ہو گیا ہے۔ ہاؤس آف لارڈز میں لارڈ کراس کے انڈیا رفام بل پر بحث کے دوران میں ایک کے بعد ایک کتنے وائسرائے تھے جنھوں نے ہمارے وفادارانہ اور پر امن مقاصد اور کوششوں کی پرزور شہادت دی۔ گزشتہ چند روز



کے اندر ہمارے وزیر ہند نے اس شہادت کی تصدیق کر دی۔''[۷]

اسی اجلاس میں مسٹر گوکھلے نے نمک کے محصول کی قرارداد پر اپنی تقریر میں کہا۔

''ہم حکومت برطانیہ کی صلاحیت انصاف سے اپیل کرتے ہیں۔ ہم ان کے تدبیر اور پاک باطنی سے اپیل کرتے ہیں۔ نہیں میں اس سے بھی آگے بڑھتا ہوں ہم ان کے جذبۂ ترحم سے اپیل کرتے ہیں۔''[۸]

کانگریس کی تاریخ لکھنے والے مصنف پٹابی سیتارامیا کانگریس کی شروع سے چلی آرہی وفادارانہ روش پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ابتدائی زمانہ میں کانگریس کو اپنی وفاداری کے مظاہرے کرنے سے عشق تھا جب ۱۹۱۴ء میں لارڈ پینٹ لینڈ گورنر مدراس کانگریس کے پنڈال میں آئے تو صرف یہی نہیں کہ ایوان کے تمام آدمی ان کے استقبال کے لیے کھڑے ہو گئے اور انھوں نے تالیاں بجائیں بلکہ مسٹر اے پی پیڈرو کو جو مہم پر جانے والی ہندوستانی فوج کے بھیجنے پر تقریر کر رہے تھے روک کر سریندر ناتھ بنرجی سے کہا گیا کہ تاج سے وفاداری کے رزرویشن کی تحریک کریں اور انھوں نے بڑی وضاحت و بلاغت کے ساتھ وفاداری کے جزبات کا اظہار کیا۔

ایسا ہی ایک واقعہ اس وقت پیش ایا جب سر جیمس مسٹن لکھنؤ کانگریس کے اجلاس ۱۹۱۶ء میں آئے۔ تمام حاضرین اجلاس ان کی تعظیم کے لے کھڑے ہو گئے۔''[۸]

سر سید اگر مسلمانوں کی وفاداری انگریزوں پر ثابت کرنا چاہتے تھے تو اس کی واضح وجہ موجود تھی کہ ۱۸۵۷ء کی ساری ذمہ داری انگریز مسلمانوں پر رکھتے تھے اور ہندو اس سے بری تھے بلکہ بنگالی اخباروں نے بڑھ چڑھ کر انگریزوں کا ساتھ اس مہم میں دیا تھا۔ لہٰذا مسلمانوں پر سے یہ الزام ہٹانے کے لیے ضروری تھا کہ وہ ایسی روش اختیار کریں۔ لیکن کانگریس کیوں بیسویں صدی کی اول ربع تک انگریزوں کی وفادار بنی ہوئی تھی اور اس کے ثبوت دیتی رہتی تھی اس کی وجہ صاف ہے۔

## سرسید کی کانگریس مخالفت

ہندو برطانوی پارلیمنٹری طرز حکومت کے فوائد بخوبی دیکھ رہے تھے اور انھیں اندازہ تھا کہ اگر یہ طریقۂ حکومت ہندوستان میں رائج ہو جائے تو وہ پورے ہندوستان کی قسمت کے بغیر شرکت غیرے مالک ہوں گے۔ ان کو ان مقاصد کے پورے کرنے میں انگریزوں کا پورا تعاون حاصل تھا۔ لہٰذا کانگریس انگریزوں سے وفاداری کو فرض اولین سمجھتی تھی جس کا اظہار ہر سالانہ جلسہ میں قرارداد پاس کر کے کیا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں اس وقت صرف ایک سرسید احمد خاں ایسے تھے جو ان کے مقاصد کو سمجھ رہے تھے۔ پوری کی پوری قوم انگریزی اور انگریزی علوم سے بہرہ ور نہ ہونے کے سبب ان کے طرز حکومت اور سیاسی تغیرات سے کلیتاً نابلد تھی۔ سرسید کے مدرسہ کو قائم ہوئے ابھی صرف دس سال ہوئے تھے کہ کانگریس کا قیام ہوا۔ مسلمانوں کی ایک نسل بھی ابھی پوری طرح تعلیم یافتہ ہو کر نہ نکلی تھی کہ ملک میں ایک ایسی انجمن کا قیام عمل میں آیا جو کہ آنے والی صدیوں تک ملک کے حالات کو کنٹرول کرنے والی تھی۔ ہندو ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے سے تعلیم کی طرف ہمہ تن متوجہ تھے۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی وغیرہ شہروں میں بڑی بڑی درس گاہیں چل رہی تھیں۔ دوسری طرف مسلمان تعلیم سے بے بہرہ انگریزوں سے متنفر عظمت رفتہ کے سوگوار، نان شبینہ کے لیے محتاج، قرضوں میں دبے ہوئے، حاکموں کی آنکھوں میں خار، مقہور مرعوب اور معتوب کہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا قیام عمل میں آیا۔ ۱۸۵۷ء کی مصیبت زدہ قوم کو کانگریس پھر سے سیاست میں داخل کر کے اشتعال دلانا چاہتی تھی۔ سرسید کو خوف ہوا کہ بنگالیوں کی آزاد روش مسلمانوں کو پھر بغاوت پر آمادہ نہ کر دے جس طرح کہ ۱۸۵۷ء میں ہوا تھا۔

> ''وہ غدر میں یہ تماشا اپنی آنکھ سے دیکھ چکے تھے کہ کارتوس کی مخالفت جو بغاوت کی بنیاد تھی ہندوؤں سے شروع ہوئی اور مسلمانوں پر تھپ گئی۔ ان کو اب بھی یہی خوف تھا کہ جو چیز بنگالیوں کی لبرٹی سمجھی جاتی ہے وہ مسلمانوں میں آکر میوٹنی نہ بن جائے۔ چنانچہ گورنر مدراس نے صاف ایک اسپیچ میں کہا تھا کہ عقاب چڑیوں کی چائیں چائیں



> کی مطلق پروا نہیں کرتا لیکن باز اجرہ اس کو آگے چوں بھی کرتا ہے تو فوراً اس کی گردن توڑ دیتا ہے۔''[9]

لہٰذا سرسید نے مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ تعلیم یافتہ لوگوں کے ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہیں۔ حالانکہ سرسید ملکی معاملات میں کبھی ہندو اور مسلمان کا سوال نہیں پیدا کرتے تھے مگر اردو کو ہٹانے کی تحریک اور بنگالی اخباروں کا مسلمانوں کے خلاف رویہ سرسید کے ذہن پر حقیقت کا انکشاف کرتا جا رہا تھا۔

> ''بنگالی اخباروں کو نکتہ چینیاں اور اعتراضات جو کہ وہ ہمیشہ گورنمنٹ کی ان جزوی رعایتوں پر کرتے رہتے ہیں جو کبھی کبھی مسلمانوں کے ساتھ ان کی حالت کے لحاظ سے کی جاتی ہیں اور ان کی وہ مخالفانہ اور دل شکن تحریریں جو مسلمانوں کے برخلاف ان میں چھپتی رہتی تھیں اور بھی مایوس کرنے والی تھیں۔''[10]

اپنے پہلے اجلاس میں کانگریس نے یہ مطالبہ کیا تھا کہ وزیر ہند کی کونسل کے ممبر منتخب ہوا کریں اور صوبوں کی قانون ساز مجلسوں میں منتخب ممبران کی تعداد بڑھائی جائے۔ صوبہ متحدہ اور پنجاب میں بھی ایسی انجمنیں قائم کی جائیں۔ سول سروس کا امتحان ہندوستان میں ہوا کرے اور تمام معتمد عہدوں کے لیے مقابلے کا امتحان کرایا جایا کرے۔ کیونکہ یہ سارے مطالبات ملکی انتظام میں دور رس تبدیلیوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ لہٰذا سرسید کو مجبوراً کانگریس کی سرگرمیوں کی طرف توجہ کرنی پڑی اور لکھنؤ میں منعقدہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسے میں بتاریخ ۲۸/دسمبر ۱۸۸۷ء کو اور میرٹھ میں اسی کانفرنس کے جلسے میں بتاریخ ۱۶/مارچ ۱۸۸۸ء کو دو بہت طویل تقریریں کانگریس کے اغراض و مقاصد کے خلاف کیں اور مسلمانوں کو متنبہ کیا کہ وہ کانگریس سے اور کانگریس کے نظریۂ نیشنلزم سے دور رہیں کیوں کہ اس میں صرف ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ یوں تو سرسید کی زندگی کا ایک ایک لمحہ مسلمانوں کے لیے اہم ہے لیکن ۲۸/دسمبر ۸۷ء اور ۱۶/مارچ ۸۸ء کی دو تاریخیں خصوصی طور پر اہمیت رکھتی ہیں کہ ان نظریات نے جن کا کہ سرسید نے اظہار کیا ہندوستان کے مستقبل پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے۔ سرسید نے اس خیال کو بیہودہ قرار دیا کہ

کانگریس کے مطالبات مان لیے جاے پر مسلمانوں کا بھی فائدہ ہوگا لہٰذا مسلمانوں کو اپنی حالت اور فائدہ کو مدنظر رکھتے ہوئے کسی بھی سیاسی جال میں پھنسنے سے بچنا چاہیے۔ کانگریس کی حکومت سرسید کی نظر میں ہندوؤں کی حکومت کے مترادف ہوئی اور اس کے خیال میں یہ کسی بھی طرح مناسب نہ تھا کہ مسلمان انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجاتے۔ علی گڑھ کی سرزمین پر ہی گوکھلے نے یہ اعتراف کیا تھا کہ مسلمانوں کے لیے یہ واقعی مشکل بات تھی کہ وہ انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت قبول کر لیتے۔

> ''چوں کہ مسلمانوں کا گروہ تعداد میں ہندوؤں سے کم ہے لہٰذا ان کو خوف ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کی حکومت سے نکل کر ہندوؤں کی حکومت میں آجائیں۔ یہ خیال ایسا نہیں ہے کہ جس کا مذاق اڑایا جائے جو حالت بالحاظ مردم شماری کے اس وقت مسلمانوں کی ہے اگر یہی حالت ہندوؤں کی ہوتی تو کیا عجب ہے کہ یہی اعتراض ہمارے دلوں میں بھی آتا اور ہم بھی اسی خیال کو پیش نظر رکھتے اور اسی پالیسی پر عمل کرنے کو تیار ہوتے جس پر کہ اس وقت مسلمان عمل کر رہے ہیں۔''[۱۱]

جواہر لال نہرو بھی سرسید کی اس پالیسی کے حامی ہیں کہ مسلمانوں کو تعلیم کی طرف توجہ کرنی چاہیے تھی۔ جس کے بغیر مسلمان ہندوؤں کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غلام بن کر رہ جاتے۔

> ''سرسید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً درست اور صحیح تھا۔ میرا خیال ہے کہ بغیر اس تعلیم کے مسلمان جدید طرز کی حکومت کی تعمیر میں کوئی قابل قدر حصہ نہ لے سکتے تھے بلکہ اندیشہ تھا کہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہندوؤں کے غلام بن کر رہ جاتے جو تعلیم میں ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط۔''[۱۲]



## حواشی:

(۱) پٹیالی سیتارامیاڈی ہسٹری آف کانگریس، جلد اول، ص:۸

(۲) پٹیالی سیتارامیاڈی ہسٹری آف کانگریس، جلد اول، بحوالہ انٹروڈکشن ٹو انڈین پالٹکس از مسٹر بنرجی، ص:۱۵

(۳) ایضاً

(۴) راجندر پرشاد ہندوستان کا مستقبل، ص:۱۹۶

(۵) دی ہسٹری آف کانگریس، ص:۵۰

(۶) ایضاً

(۷) پٹیالی سیتارامیاڈی ہسٹری آف کانگریس، جلد اول، ص:۶۱

(۸) ایضاً ص:۱۰۱

(۹) حیات جاوید، ص:۲۵۵

(۱۰) ایضاً ص:۲۵۶

(۱۱) بحوالہ نورالحسن نقوی، سرسید اور ہندوستانی مسلمان، ص:۶۳

(۱۲) جواہر لال نہرو، میری کہانی، جلد دوم، ص:۳۱۵

لکھنؤ تقریر

# مسلم سیاست کی شروعات

۲۸/دسمبر ۱۸۸۷ء کو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا دوسرا اجلاس لکھنؤ میں اور کانگریس کا تیسرا اجلاس مدراس میں منعقد ہوا۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے دوران ہی اعلان کیا گیا کہ آج شب سرسید اپنے سیاسی خیالات کا اظہار کریں گے اور بتائیں گے کہ مسلمان کیا سیاسی مسلک اختیار کریں لہٰذا مسلمان جوق در جوق اس جلسہ میں شریک ہوئے اور قیصر باغ بارہ دری میں ایک عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں سرسید نے وہ تقریر کی جس کی صدائے باز گشت صدیوں تک سنائی دیتی رہے گی۔

نیشنل کانگریس نے ۴۹ درخواستیں حکومت میں گزاری تھیں ان میں دو انتہائی اہم مطالبات شامل تھے ایک یہ کہ کونسلوں میں مخلوط انتخاب کے ذریعہ نمائندے بھیجے جائیں اور دوسرے تمام سرکاری نوکریوں کے لیے مقابلہ کے امتحان کا طریقہ رائج کیا جائے اور یہ امتحانات ہندوستان میں ہی ہوں۔ سرسید نے کہا کہ:

> ''کانگریس نے ۴۹ درخواستیں گورنمنٹ میں گزاری ہیں۔ ان میں جو مقدم ہیں وہ یہ ہیں جو امتحان ولایت میں ہوتا ہے موقوف ہو اور ہندوستان میں اس کی جگہ امتحان ہو۔ علاوہ اس کے غیر معتہد عہدوں کی نسبت یہ خواہش کی جاتی ہے کہ وہ کل کمپٹیشن یعنی مقابلے کے امتحان سے دیے جاویں۔ اس درخواست کا نتیجہ یہ ہے کہ جو عہدے تحصیل داری سے اوپر ہیں اور سب آرڈینٹ کہلاتے ہیں یعنی سب ججی اور منصفی، ڈپٹی کلکٹری اور اکسٹرا اسٹنسٹی وغیرہ وہ بھی بذریعہ امتحان مقابلہ کے ملیں اور جو امتحان میں غالب آوے اسی کو ملیں۔''[1]

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کی ان تجاویز کی مخالفت پولیٹیکل ہونے کے



علاوہ مسلمانوں کی اقتصادیات سے بلاواسطہ تعلق رکھتی تھی کہ زمینداری کے علاوہ مسلمانوں کا گزارہ صرف نوکریوں پر تھا۔

> ''ہر شخص اس اصول کو سمجھ سکتا ہے کہ سب سے اول وہ ملک کمپٹیشن کے امتحان کے لیے مناسب ہے جس ملک میں ایک قوم بستی ہے اور تمام لوگ موچی سے لے کر ڈیوک تک ایک قوم کے ہیں۔ ان میں کمپٹیشن کا امتحان جاری کرنا کچھ مشکلات پیدا نہیں کرتا کیونکہ کوئی متغیث بنے یا حاکم کسی شخص کو اس سے ناراضی نہیں ہو سکتی...... مگر ہمارے ملک کی جس میں مختلف قومیں آباد ہیں یہ حالت نہیں ہے ایک طرف ہندو دوسری طرف مسلمان اور تیسری طرف پارسی ہیں۔ ہندوؤں میں بھی ہمارے ملک کے ہندو اور مشرقی ملک کے بنگالی اور دکنی ملک کے مرہٹے ایک نہیں ہیں۔...... ہمارا ملک کمپٹیشن کے امتحان کے قابل نہیں ہے۔''[2]

ان کا خیال تھا چونکہ ہندوستان میں بہت سی قومیں بستی ہیں اور انڈین سوسائٹی مساوی نہیں ہے۔ مسلمان ہیں، پارسی ہیں اور ہندوؤں میں بھی بہت سی قومیں ہیں لہٰذا مقابلہ کا امتحان اس لیے ٹھیک نہیں ہے کہ خاص قومیں دوسروں پر حاکم ہو جائیں گی۔ آگے چل کر کہا کہ مختلف قومیں بھی اگر ایک سی تعلیمی لیاقت کی ہوتیں تو کچھ مضائقہ مقابلہ کے امتحان میں نہ تھا۔ لیکن چونکہ مسلمان تعلیمی میدان میں انتہائی پسماندہ ہیں لہٰذا ان کے حاکم بننے کا کوئی موقع نہیں ہے۔

> ''اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی تعلیم و تربیت اور انگلش لٹریچر میں ان کا علم جو گورنمنٹ کے اعلیٰ عہدوں کے لیے ضروری ہے اس درجہ پر پہنچ گیا ہے کہ ہندوؤں کے مساوی ہو؟ نہیں ہرگز نہیں اب میں مسلمانوں اور ہندوؤں کو اکٹھا کر کے پوچھتا ہوں کہ بنگالیوں سے دونوں برابری کر سکتے ہیں؟ ہرگز نہیں۔ جب یہ صورت ہے تو کیونکر اس ملک میں مقابلے کا امتحان جاری ہو سکتا ہے۔ اگر یہ امتحان مقابلہ جاری ہوا تو غور کرنا چاہیے کہ ملک کا کیا نتیجہ ہوگا۔ تمام

قومیں نہ صرف مسلمان بلکہ تمام ہندو اس ملک کے معزز راجہ اور بہادر راجپوت جن کو اپنے باپوں کی تلواریں یاد ہیں ایک بنگالی جو چھری کو دیکھ کر کرسی کے نیچے گر پڑے گا اپنے پر حاکم دیکھیں گے؟ پس مقابلہ کا امتحان نہ صرف ملک کی کسی خاص قوم کے لیے مضر ہے بلکہ امن کے لیے بھی مضر ہے۔'' (ایضاً)

سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ بنگالی تعلیم میں سب سے زیادہ ہیں تمام دوسرے ہندوؤں اور مسلمانوں سے، لہٰذا بنگالی جن کو سرسید بزدل خیال کرتے تھے تمام ملک پر حاکم ہو جائیں گے اور بہادر قومیں ان کی حکومت کسی طرح برداشت نہ کر سکیں گی اور ملک میں بدامنی پھیل جائے گی۔ اس زمانے میں مدراس میں کانگریس کا تیسرا جلسہ ہونے والا تھا اور بدرالدین طیب جی کو اس کا صدر مقرر کیا گیا تھا۔ اس کے سلسلہ میں کہا کہ:

''پس اگر کسی شریف آدمی کو رئیس کو اوسط درجے کے آدمی کو اچھے خاندان والے آدمی کو...... اگر اس کو قبول کرے کہ بنگالیوں کی حکومت سہے جوتیاں کھائے تو بسم اللہ ریل پر سوار ہو اور چلے مدراس چلے مدراس۔'' (ایضاً)

لہٰذا سرسید نے مقابلہ کے امتحان کی مخالفت کر کے مسلمانوں کی ایک بہت اہم خدمات انجام دی۔ ان کے نزدیک مسلمانوں پر دوسری قوموں کی حکمراں ہونا پورے ملک کے لیے نقصان دہ تھا۔

کانگریس کا دوسرا مطالبہ تھا کہ وائسرائے اور گورنروں کی کونسلوں میں توسیع ہو اور منتخب نمائندوں کا اضافہ کیا جائے۔ سرسید نے اپنی تقریر میں اس مطالبہ پر بہت مدلل بحث کی ہے اور ہر طریقۂ الیکشن پر روشنی ڈال کر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ کسی بھی طرح کے الیکشن کا رواج دینا از بسکہ مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہے۔ کانگریس کی منتخب ممبروں کی تجویز نے سرسید کو بہت مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ حکومت کانگریس کے اس مطالبہ کو تسلیم کرتی سرسید نے ہر طرح کے الیکشن کے نتائج مسلمانوں اور حکومت پر واضح کر دیے ان کے نزدیک چار طریقوں سے نمائندوں کا انتخاب ممکن تھا۔



پہلا یہ کہ مخلوط ووٹ کے ذریعے نمائندے چنے جائیں اور اکثریت کی بنا پر نمائندے منتخب ہوں۔ اس طریقہ پر سرسید نے جو اپنی رائے پیش کی وہی آگے چل کر جداگانہ انتخاب کی اساس بن گئی اور مسلمانوں کا ایک بہت اہم مطالبہ بن کر حکومت کے سامنے آئی۔ انھوں نے فرمایا:

''سب سے پہلے یہ فرض کیجئے کہ وائسرائے کیکونسل اس قاعدے سے ہو جس کی خواہش ہے یعنی رعایا کے انتخاب سے ممبر مقرر ہوں اور انتخاب کی صورت یہ فرض کیجئے کہ تمام مسلمان ایک مسلمان ممبر کے لیے ووٹ دیں اور ایک ہندو کے لیے کل ہندو ووٹ دیں اور گنیے کہ مسلمان کے کتنے ووٹ ہوئے اور ہندو ممبر کے کتنے ووٹ؟ یقینی ہندو ممبر کے چوگنے ووٹ ہوں گے کیونکہ وہ آبادی میں مسلمانوں سے چوگنے ہیں...... ایک ووٹ مسلمان ممبر کے لیے ہوگا اور چار ووٹ ہندو ممبر کے لیے...... جوئے کے اس کھیل کے مطابق چار پانسے ہندوؤں کے لیے ایک پانسہ ہمارے لیے ہوگا۔''[۳]

دوسرا طریقہ یہ کہ الیکٹر مقرر ہوں یعنی ووٹرز آمدنی کی بنیاد پر طے کیے جائیں اور وہ نمائندوں کا انتخاب کریں۔ ایسی صورت میں بھی چونکہ مسلمان ہندوؤں کے مقابلہ میں انتہائی غریب ہیں اور اقتصادی پسماندگی اپنے عروج پر ہے بلکہ ہندوؤں میں بھی راجپوت بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ لہٰذا ایسی صورت میں بھی مسلمان ہندوؤں سے بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ فرمایا کہ:

''دوسری صورت انتخاب کی یہ فرض کیجئے کہ انتخاب کے الیکٹر مقرر ہوں۔ ان کے لیے تقرر میں یہ ضروری ہوگا کہ کوئی حد مقرر کی جائے کہ اس درجے کے آمدنی کے لوگ الیکٹر ہوں گے...... اگر فرضاً یہ درجہ مقرر ہو کہ پانچ ہزار روپے کی آمدنی والے الیکٹر مقرر ہوں تو بتلاؤ کہ کتنے مسلمان نکلیں گے جن کی آمدنی اس قدر ہوا کہ کس کے حق میں ووٹ دینے والے زیادہ ہوں گے؟ ہم پوچھتے ہیں کہ اے مسلمانو! تم اپنی قسمت کو روؤ کہ تمہارے پاس ایسی جائداد اور دولت ہے جو ملک کے ہندوؤں کے پاس ہے؟ ہرگز نہیں...... عقلی قاعدے

سے کسی ایک مسلمان کو بھی موقع نہ ملے گا کہ وائسرائے کی کونسل کا
ممبر ہو سکے۔ پس کل وائسرائے کی کونسل میں بابو فلاں گھوش اور فلاں
چکرورتی کے سوا نہیں ہوگا پھر کیا حال ہوگا ہمارے ملک کے ہندوؤں
کا جن کی حالت گو مسلمانوں سے اچھی ہے لیکن عموماً ان کی حالت
بھی ایک ہی جیسی ہے؟ کیا حالت ہوگی ان راجپوتوں کی جن کے
باپ دادا کی تلواروں سے ابھی خون نہیں دھویا گیا ہے۔ ایسی حالت
میں ملک کے امن کا کیا حال ہوگا؟ کیا یہ توقع ہے کہ ہم اور ہمارے
بہادر بھائی راجپوت خاموش بیٹھے رہیں گے؟''

تیسری صورت سرسید نے یہ بتلائی کہ مناسب تعداد ہندوؤں کی اور مناسب تعداد مسلمانوں کی لی جائے اور اس کا پیمانہ سوائے آبادی کے کچھ اور نہیں ہوسکتا پس ایسی حالت میں بھی مسلمان بہت کم پہنچیں گے۔

''مناسب تعداد ہندوؤں کی مناسب تعداد مسلمانوں کی ہو۔ ہم
حیران ہوں گے کہ کس مناسبت سے یہ تعداد ہو؟ لازماً مردم شماری کی
مناسبت سے۔'' (ایضاً)

چوتھی صورت انتخاب کی یہ بتائی کہ ہندو کو ہندو منتخب کریں اور مسلمان کو مسلمان یعنی جداگانہ انتخاب کا اصول جاری ہو۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ شملہ ڈیپوٹیشن سے بہت پہلے ہی سرسید نے اس نظریہ کو پیش کیا تھا درحقیقت شملہ ڈیپوٹیشن کا جداگانہ انتخاب کا مطالبہ سرسید کے ہی خیالات پر مبنی تھا۔ سرسید نے یہ فرض کرتے ہوئے کہ جداگانہ انتخاب جاری ہوا اور یہ بھی کہ ہنوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہو یہ کہہ کر مسترد کر دیا کہ مسلمانوں کی علمی لیاقت ایسی نہیں ہے کہ وہ ہندوؤں کے مقابلہ میں وائسرائے کی کونسل میں دانشمندی سے کام کر سکیں۔

''اب ہم چوتھی صورت انتخاب کی یہ فرض کرتے ہیں کہ ہندو ممبر کو
ہندو اور مسلمان ممبر کو مسلمان منتخب کریں اور یہ بھی فرض کرتے ہیں کہ
دونوں کی تعداد مساوی ہو۔ مگر آپ مجھ کو معاف کریں اگر میں
دلسوزی سے کچھ کہوں۔ تمام قوم میں ایک بھی مسلمان نہ نکلے گا جو



وائسرائے کی کونسل میں بمقابلہ ہندوؤں کے کام کرنے کے لائق
ہو۔ میں نے چار برس کونسل میں کام کیا ہے اور ہمیشہ یہ سمجھا ہے کہ
مجھ سا ذلیل اور نالائق اور مجھ سے زیادہ بدتر کوئی ممبر نہیں ہوسکتا۔''

اس کے علاوہ سرسید کے نزدیک مسلمانوں میں سیاسی جوش پیدا کرنے کا مطلب خطرناک ہوسکتا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے یہ ملک اپنی تلوار سے فتح کیا ہے اور اگر سیاسی جوش بہادر راجپوتوں اور پٹھانوں میں پیدا کر دیا جائے تو وہ صرف قلم اور زبان سے ہی کام نہ لیں گے بلکہ تلوار اٹھائیں گے جس میں سب کا نقصان ہوگا۔

''ہماری قوم اس خون کی ہے کہ جس نے یہ صرف عرب بلکہ ایشیا اور
یورپ کو لرزا دیا تھا۔ ہماری ہی قوم ہے جس نے تمام ہندوستان کو اپنی
تلوار سے فتح کیا.......... جو جوش بنگالہ میں پیدا ہوا ہے وہی جوش
راجپوتوں یا پشاور کے پٹھانوں میں پیدا کر دو تو وہ لوگ کیا صرف قلم
کی گھس گھس اور زبانی بک بک پر بس کریں گے۔''

مسلمانوں کو مخاطب ہو کر کہا کہ جب ان کی یہ حالت ہے کہ علم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں اور تعداد میں کم ہیں تو یہ غلط خیال کر کے کہ کانگریس کے مطالبات سے سب کو فائدہ ہوگا اپنی حالت کو بھول کر نقصاندہ جماعت میں شرکت کریں ایسا کرنا ہرگز مناسب نہیں۔

''...... جب یہ حال ہماری قوم کا ہے تو آیا یہ مناسب ہے کہ تم ایسے
امور میں شامل ہو اور اس بے ہودہ خیال سے کہ اگر یہ درخواستیں
منظور ہو جاویں گی تو ہندوستان کی تمام قومیں ان سے فائدہ اٹھاویں
گی اپنی حالت کو نظر سے گرادو اور آئندہ کے نتائج سوچے بغیر چلاتے
پھرو کہ چلو مدراس! چلو مدراس ہرگز مناسب نہیں۔' (ایضاً)

○

## حواشی:

(۱) مجموعہ لیکچرز، مرتبہ امام الدین گجراتی، لاہور، ۱۹۰۰ء، ص:۳۰۴

(۲) ایضاً (۳) ایضاً ص:۳۰۷

میرٹھ لیکچر:

# کانگریس کو مسلمانوں کی نمائندگی کا حق نہیں

سرسید نے لکھنؤ تقریر کے ایک سال بعد میرٹھ میں جلسۂ عام میں دوسری اہم سیاسی تقریر فرمائی۔ یہ دونوں تقاریر ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کی اساس بن گئیں۔صدیوں تک ان تقاریر کا اثر ہندوستان کی سیاست پر پڑتا رہے گا۔ وقتی طور پر کچھ سالوں کے لیے ضرور ان خیالات کو مسلمان بھول گئے جو سرسید نے اپنی ان دونوں تقاریر میں ہی ظاہر کیے تھے لیکن یہ محض عارضی حادثہ ہے۔مسلمان پھر سے پریشانیوں کے دور میں پھنس رہے ہیں لہٰذا صحیح نظریات اور راہ عمل کی تلاش انہیں در سرسید تک لے جا رہی ہے۔

کانگریس کے بنتے وقت کوئی مسلمان اس میں شریک نہ تھا اور نہ کسی مسلمان سے اس کے اغراض و مقاصد کے بارے میں مشورہ کیا گیا تھا۔صرف انگریزوں اور ہندوؤں نے یہ مجلس قائم کی تھی اور دعویٰ یہ کیا تھا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی جماعت ہے۔ سرسید نے اس خیال کی زبردست مخالفت کی اور کانگریس کو خالص ہندوؤں کی جماعت مانا اور اس کے مقاصد کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ثابت کیا۔لیکن کانگریسی اخبارات اور بنگالی ہندو ہمیشہ یہ پروپیگنڈہ کرتے رہے کہ اس جماعت میں مسلمان بھی شریک ہیں اور یہ ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کے حقوق کی بھی علمبردار ہے۔لہٰذا اس بات کی ضرورت تھی کہ یہ خام خیال دور کیا جائے۔ دراصل یہ پروپیگنڈہ ایک نہایت دانشمندانہ سیاسی چال تھی کہ ہندو اکثریت کے ساتھ مسلم اقلیت بھی ان مطالبات میں شامل ہو جائے جو مسلمانوں کے لیے حد درجہ مضر تھے۔۱۴/مارچ ۱۸۸۸ء کو سرسید نے جو تقریر میرٹھ میں مسلمانوں کے جلسۂ عام میں کی اس کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ اس غلط خیال کو رفع کیا



جائے۔سرسید نے صاف الفاظ میں ظاہر کیا کہ اول تو کوئی مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہے اور جو چند لوگ اس میں شریک ہوئے ہیں وہ کسی لالچ یا انگریزوں اور ہندوؤں کے دباؤ کی وجہ سے ایسا کر رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کے بارے میں سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ سوائے طیب جی کے اور تمام لوگ کرائے کے آدمی ہیں۔

> ”آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ مدت سے ہمارے بنگالی دوست پولیٹکل معاملات میں نہایت گرم جوشی ظاہر کر رہے ہیں۔تین برس ہوئے کہ انھوں نے بہت بڑی مجلس قائم کی ہے۔ جس کا جابجا اجلاس ہوتا ہے اور اس کا نام انھوں نے نیشنل کانگریس رکھا ہے۔ہم نے کبھی کسی آرٹیکل میں یا کسی اسپیچ میں یا کسی مقام پر زبانی بات چیت میں ان کے کاروبار میں جو وہ کر رہے تھے ہرج نہیں ڈالا لیکن ہمارے بنگالی دوستوں کی طرف سے ہماری قوم پر بے جا اور ناواجب دست اندازی ہوئی ہے۔اس لیے ہمارا فرض ہے کہ اس بے جا دست اندازی کو ظاہر کریں اور اپنی قوم کو اس کی مضرتوں سے محفوظ رکھیں........... ہماری قوم اب تک چپ چاپ بیٹھی تھی اس کو غرض نہیں تھی کہ بنگال کے بابو اور شمال مغربی اضلاع کے ہندو کیا کر رہے ہیں۔ مگر انھوں نے بعض اضلاع میں مسلمانوں پر کانگریس میں شریک ہونے کے لے دباؤ ڈالا ہے۔کسی ضلع میں حکومت کے دباؤ سے وہ (مسلمان) مجبور ہوئے۔کسی ضلع میں ان کو اس طرح دبایا گیا کہ بغیر ان کی (ہندوؤں کی) شرکت کے ان کا کام جو وہ چلانا چاہتے ہیں چل نہیں سکے گا یا ان لوگوں نے خود یہ سمجھا کہ بغیر ان کی شرکت کے روٹی ملنی مشکل ہے روپے کا لالچ دینے سے بھی انھوں نے کوتاہی نہیں کی......کون شخص ہے جو اس بات کو نہیں جانتا کہ دو چار مسلمان جو ممالک مغربی و شمالی کے ان کے ساتھ ہوئے وہ کون ہیں......ان کی حقیقت بغیر اس کے کچھ نہیں کہ

وہ کرائے کے آدمی ہیں۔ سوائے بدرالدین طیب جی کے جو نہایت بزرگ ہیں اور جن کا میں نہایت ادب کرتا ہوں کوئی سربرآوردہ رئیس اس میں شریک نہیں ہوا۔''[1]

سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ نیشنل کانگریس کے لوگ آسمان کے تارے بن جائیں تو ہمیں کوئی غم نہیں ہے مگر شرم آمیز طریقوں سے مسلمانوں کو اس میں شامل کرنے کی کوشش کرنا نازیبا حرکت ہے اور ہندوؤں کو سمجھنا چاہیے کہ وہ ضرور مسلمانوں سے اچھی حالت میں ہیں لیکن دوڑ کر مسلمانوں سے آگے نہیں نکل سکتے۔

''نیشنل کانگریس کے ممبر آسمان کے تارے ہو جاویں یا وہ سورج بن جاویں ہم خوش ہیں لیکن ہماری قوم کے دو چار آدمیوں کو ناواجب طور سے اور شرم آمیز دباؤ اور لالچ سے اپنے ساتھ لے کر یہ دکھلانا چاہیں کہ مسلمانوں کی قوم کی قوم ان کے ساتھ ہے تو اس کا دفع کرنا ہم پر ضرور واجب ہے...... ہمارے ملک کے ہندوؤں کو سمجھنا چاہیے کہ ان کی حالت گو مسلمانوں سے کسی قدر اچھی ہے لیکن ایسی نہیں ہے کہ وہ دوڑ کر ہم سے آگے نکل جاویں گے۔''(ایضاً)

سرسید یہ سمجھتے تھے کہ انگریز ہندوستان سے چلے جائیں تو کیا ہونا ہے سوائے اس کے کہ ہندو اور مسلمان ایک دوسرے سے دست و گریبان ہو جائیں اور دونوں مل کر سکون سے حکومت نہیں کر سکتے۔

''فرض کرو انگریز چلے گئے تو ہندوستان میں کون حاکم ہوگا؟ کیا ایسی حالت میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک گدی پر بیٹھ کر برابر درجہ پر رہ سکیں گی؟ ہرگز نہیں ضرور ہوگا کہ دونوں میں سے ایک دوسری کو مغلوب کر لے یا دبا لے اور یا یہ ہو کہ دونوں برابر رہیں۔ یہ امر ناممکن اور امر محال ہے...... جب تک ایک قوم دوسری قوم کو زیر نہ کر لے گی اور تابعدار نہ بنا لے گی ملک میں امن نہ ہوگا...... اے میرے دوستو! مسلمان بھائیو! تمہارے بزرگوں نے ملک فتح کیے



ہیں غیر قوموں پر حکومت کی ہے یورپ پر حکومت کی ہے تم جان سکتے ہو کہ حکومت کیوں کر قائم رہ سکتی ہے۔''(ایضاً)

آگے چل کر سرسید نے بیان کیا کہ شمالی ہند کے ہندو ہمارا ساتھ چھوڑ رہے ہیں اور بنگالی ہندوؤں کے ساتھ مل کر کانگریس میں شریک ہو رہے ہیں۔ ہمیں انگریزوں کا ساتھ مذہب کی رو سے دینا چاہیے۔ سرسید نے شاید پہلی مرتبہ قرآنی آیت کا حکم بیان کر کے مسلمانوں پر یہ فرض بتایا کہ بمقابلہ ہندوؤں کے ان کو عیسائیوں کا ساتھ دینا چاہیے کہ قرآن فرماتا ہے کہ مسلمان پائیں گے عیسائیوں کو زیادہ دوست اور ہمدرد مشرکوں اور یہودیوں کے مقابلے میں اور کوئی مسلمان قرآن کے حکم ماننے سے انکار نہیں کر سکتا۔

''بنگالیوں کی کارروائیوں کو ہم اپنے مسلمان بھائیوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے ہمارے ملک کے ہندو بھائی ہم کو چھوڑتے اور بنگالیوں کے ساتھ شریک ہوتے ہیں پس ہم کو اس قوم کے ساتھ شریک ہونا چاہیے جس کے ساتھ ہم شریک ہو سکتے ہیں۔ کوئی مسلمان یہ نہیں کہہ سکتا کہ انگریز اہل کتاب نہیں ہیں کوئی مسلمان اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ خدا نے فرمایا ہے کہ کوئی غیر مذہب والے مسلمانوں کے دوست نہیں ہو سکتے اگر ہو سکتے ہیں تو عیسائی ہیں (قرآن کی آیت پڑھی جس کا ترجمہ یہ ہے ''تو پاوے گا سب لوگوں سے زیادہ مسلمانوں کی دشمنی میں یہود اور مشرکوں کو اور تو پاوے گا سب سے نزدیک مسلمانوں کی محبت میں وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہم لوگ نصاریٰ ہیں یہ اس واسطے کہ وہ عالم اور درویش ہیں اور یہ کہ متکبر نہیں ہیں'')

آگے خیال ظاہر کیا کہ جو لوگ قرآن پر یقین رکھتے ہیں وہ نور ایمانی اور قرآنی احکام کی روشنی میں انگریزوں سے دوستی رکھیں گے اور ان کی حکومت کو استحکام دینے کی کوشش کرتے رہیں گے۔

''وہ جس شخص نے قرآن شریف پڑھا ہوگا اور جس کو اس پر یقین ہوگا وہ جان سکتا ہے کہ ہماری دوستی ہماری محبت کسی دوسرے مذہب والی

قوم سے اس قدر نہیں ہوسکتی جتنی کہ عیسائیوں سے۔اس وقت ہماری
قوم خراب حالت میں ہے دولت کے لحاظ سے اور علم کے لحاظ سے
لیکن خدانے اپنی مہربانی سے نور ایمان ہم کو دیا ہے قرآن ہماری
ہدایت کے لیے موجود ہے جس نے ہم کو ان کا اور ان کو ہمارا دوست
بنایا ہے۔اب خدانے ان کو ہم پر حاکم کیا ہے پس ہم ان سے دوستی
کریں اور وہ طریقے اختیار کریں جس میں ان کی حکومت کو
ہندوستان میں استقلال اور استحکام رہے اور بنگالیوں کے ہاتھ میں نہ
جاوے۔یہی ہماری دوستی ہمارے عیسائی حاکموں کے ساتھ ہے۔''

فرمایا کہ جولوگ ہم کو پسماندگی کے گڑھے میں ڈالنا چاہتے ہیں ان کا ساتھ نہ دیں کہ بنگالیوں کی کارروائیوں سے ہماری قوم کو شدید نقصان پہنچنے والا ہے۔ہم کو ہندوؤں کا تابع ہونے کی بجائے عیسائیوں کا تابع ہونا چاہیے۔

''اور جولوگ ہم کو گڑھے میں ڈھکیلنا چاہتے ہیں ان کے ساتھ شریک
نہ ہوں ایسی حالت میں کہ بنگالیوں کی کارروائیوں سے ہماری قوم کو
نقصان پہنچنے والا ہے ہم مطیع الہنود ہونا بجائے مطیع اہل کتاب ہونے
کے پسند نہ کریں اور جہاں تک ہم سے ہوسکے ہم انگلش گورنمنٹ
کے وفادار رہیں۔'' (ایضاً)

سرسید کا خیال تھا کہ چونکہ شمال جنوبی اور مغربی ہند کے ہندو تمام کے تمام مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر بنگالی ہندوؤں کا ساتھ دینا چاہتے ہیں لہٰذا ہمیں بھی صرف ایک جماعت تو بچتی ہے یعنی انگریز ان کا ساتھ دینا چاہتے کہ قرآن بھی انہیں سے دوستی کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔

''ہمارے ملک کے ہندو بھائی اور بنگال کے بنگالی اور بمبئی کے
برہمن اور مدراس کے ہندو مدراسی اگر ہم سے علیحدہ ہونا چاہتے ہیں
ان کو علیحدہ ہونے دو اور کچھ پرواہ مت کرو......ہم کو جو کچھ اپنی بھلائی
کی توقع ہے وہ انگریزوں سے ہے بنگالی ہماری قوم کی کچھ بھلائی
نہیں کرسکتے قرآن مجید بھی انہیں سے دوستی کرنے کی ہدایت کرتا ہے



تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم ان کے دوست نہ ہوں بلکہ ہم پر لازم ہے
کہ جو کچھ خدانے کہا ہے ہم اس کی تعمیل کریں۔''

حکومت سے شکایتوں کا ذکر کرتے ہوئے انھوں نے کہا کہ گورنمنٹ سے شکایت تو ہوتی رہی ہے اور ان شکایتوں کے دور کرنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ سیاسی ہنگامہ آرائیاں کی جائیں بلکہ مسلمانوں کو چاہیے کہ تعلیم کی طرف توجہ رکھیں۔

''پس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ ہے کہ ہم اس پولیٹیکل
شوروغوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور
دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں دولت میں کم
ہیں پس ہم کو اپنی تعلیم پر کوشش کرنی چاہیے۔''

علمی طور سے پسماندہ ہونے کے علاوہ مسلمان تجارت میں بھی ہندوؤں اور انگریزوں سے بہت پیچھے تھے لہٰذا سرسید نے اس سلسلہ میں بھی اپنی رائے کا اظہار کیا ہے کہ مسلمانوں کو تجارت میں بھی آگے آنا چاہیے۔ان کی رائے میں دوکان داری سے بہتر مسلمانوں کے لیے بڑی تجارت ہے اور ان کی فطرت سے مطابقت رکھتی ہے لہٰذا انگریزوں سے تجارت حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔

''اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو
تباہ کردیں۔اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور
بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کرلیا ہے جو تجارت ہندوؤں
کے ہاتھ میں ہے وہ انہیں کے پاس رہنے دو کیونکہ نہ ہم سے دوکان
پر بیٹھ کر آٹا دال بیچا جاوے گا۔ہمارے ملک کی پیداوار کی تجارت جو
انگریزوں کے ہاتھ میں ہے اور جس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں اس کو
ان کے ہاتھ سے چھیننے کی کوشش کرو۔ان سے کہہ دو کہ اب آپ
تکلیف نہ کریں ہم خود اپنے ملک کا چمڑا انگلستان لے جائیں گے اور
وہاں بیچیں گے۔ہمارے ملک کے جانوروں کی ہڈیاں تم مت چنو ہم
خود چنیں گے اور امریکہ لے جائیں گے۔''[۲]

اتنے واضح اور صاف خیالات کے باوجود ہندوستان میں بہت سے مسلم دانشوروں نے سرسید کے خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرسید اسی نظریۂ قومیت کے ماننے والے تھے جس پر کہ کانگریس کی بنیاد ہے اور جس پر بعد کو بعض علماء دیو بند نے سند دی۔ ان علماء میں مولانا حسین احمد مدنی کا نام سب سے زیادہ مشہور رہے کہ انھوں نے قومیت کی بنیاد وطن کو قرار دیا۔ جو نظریہ مغرب میں پروان چڑھا اور ترکوں و عرب مسلمانوں میں جنگوں کی بنیاد بنا۔

ہندوستان میں یہ نظریہ سر ہیوم وغیرہ کی وجہ سے مقبول ہوا۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی سرسید کو اسی نظریۂ وطنیت کا ماننے والا بتاتے ہیں جو ہمارے خیال میں بالکل الٹی تفسیر سرسید کے خیالات کی ہے اتنے سے فرق کے ساتھ کہ سرسید نے کبھی فلسفیانہ بحث اس نظریہ پر نہیں کی بلکہ وہ ہر نظریہ کو مسلمانوں کے لیے فائدے ونقصان کی کسوٹی پر رکھتے تھے اور اسی بنیاد پر کسی خیال کو تسلیم یا مسترد کرتے تھے۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں:

> ''سرسید کی فکر کا ایک نہایت ہی اہم پہلو ان کا تصور قومیت ہے۔ انھوں نے دو بنیادی حقیقتوں کو اس سلسلہ میں بار بار دہرایا ہے۔ ایک یہ کہ قوم مذہب سے نہیں بنتی دوسرے یہ کہ ہندوستان میں بسنے والے سب ایک قوم ہیں۔ عجیب اتفاق تھا کہ پہلے نظریہ کی پرزور تائید ان کے انتقال کے ۳۷ سال بعد دیوبند سے ہوئی۔ جب مولانا سید حسین احمد مدنی نے نہایت شدومد کے ساتھ اعلان کیا کہ قومیں وطن سے بنتی ہیں اور علامہ اقبال نے اس پر بڑی حیرت اور استعجاب کا اظہار کیا۔''[۳]

مندرجہ بالا بیان علمی کذب اور ابن الوقتی کی نایاب نادر مثال ہے۔

○

**حواشی:**

(۱) مجموعہ لیکچرز، مرتبہ امام الدین گجراتی، ص:۳۱۲ (۲) ایضاً، ص:۳۲۴

(۳) سرسید اور علی گڑھ تحریک، ص:۶۹

# انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کا قیام

سرسید نے کانگریس کے مضرت رساں عزائم کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک سیاسی انجمن مثل کانگریس کے تشکیل دی تھی۔اس جماعت کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن تھا اور اگست ۱۸۸۸ء میں بمقام علی گڑھ اس کا قیام ہوا۔خود سرسید اس کے آنریری سکریٹری منتخب ہوئے۔اس ایسوسی ایشن میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندو بھی سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک میں شامل تھے۔جس میں راجہ شیو پرشاد مہاراجہ بنارس اور منشی نول کشور کاص طور سے قابل ذکر ہیں۔سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک بہت زیادہ کامیاب رہی۔اسلامی انجمنوں کے مراسلے کے جواب میں جس میں سرسید نے کانگریس کے مطالبات کے خلاف تحریک چلانے اور عوامی جلسوں کا اہتمام کرنے کی درخواست کی تھی، ملک کے کونے کونے میں جلسوں کا انعقاد کیا گیا اور کل مسلمانوں نے کانگریس کے ان مطالبات کی ضرر رسانی کا بخوبی اظہار کیا اور سرسید کو ان جلسوں کی اطلاعات بھیجیں۔۱۸۸۷ء کے بعد کے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ان بے شمار جلسوں کی تفصیلی رپورٹیں کثرت سے ملتی ہیں۔سب کا ذکر یہاں نہیں کیا جاسکتا بغرض مثال چند جلسوں کی کارروائی کا ذکر یہاں کرنا ضروری ہے تاکہ اندازہ ہو سکے کہ سرسید کی یہ تحریک کس قدر کامیاب رہی۔

## جونپور کا جلسہ

جونپور میں ایک جلسہ ہندو اور مسلمان کا ہوا جس میں راجہ شنکر دوبے، مولوی محمد ابراہیم اور بابو دامودر داس وغیرہ نے شرکت کی۔مندرجہ ذیل رزولوشن پاس کیا گیا۔

> ''جونپور کے مسلمان اور ہندو نیشنل کانگریس کے اغراض و مقاصد سے ہمدردی نہیں کرتے۔اس کی تحریک مولوی محمد ابراہیم اور تائید بابا دامودر داس نے کی۔''



## لاہور کا جلسہ

اگست ۱۸۸۸ء میں لاہور میں ایک بڑا جلسہ منعقد ہوا جس کی رپوٹ کرتے ہوئے گزٹ میں سرسید نے لکھا۔

> ''ہم کو اس بات کی نہایت خوشی ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کی قدیم اور سب سے اول انجمن اسلامیہ لاہور نے ایک عام جلسہ میں ایسوسی ایشن کے ساتھ نہایت جوش اور قوت سے اپنا اتفاق ظاہر کیا ہے۔ہم انجمن اسلامیہ لاہور کو اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ متفق رہنے پر مبارکباد دیتے ہیں۔''

## بمبئی کا جلسہ

بمبئی میں بھی کانگریس کے خلاف بہت جوش پایا جاتا تھا اور وہاں کے مسلمانوں نے بالاتفاق سرسید کی آواز پر لبیک کہا۔طیب جی وغیرہ کی ایک نہ چلی بلکہ کانگریس کے خلاف رزرویشن پاس کیا گیا۔سرسید اس پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''بمبئی کے مسلمانوں نے کانگریس میں شریک ہونے سے انکار کردیا ہے۔دو مسلمان ایسوسی ایشنوں کے جلسے اس امر پر غور کرنے کے لیے منعقد کیے گئے کہ آیا ان کانگریس میں نمائندے بھیجنے چاہیں کہ نہیں۔ان میں سے ایک جلسہ میں بدرالدین طیب جی نے اس امر کی تائید میں کہ مسلمان نیشنل کانگریس میں شریک ہوں، ایک طویل گفتگو کی مگر اس پر بھی جلسہ نے ایک رزولوشن برخلاف ان کی صلاح کے پاس کیا۔یہ نتیجہ نہایت مسرت بخش ہے اور اب اس بات کا دعویٰ کرنا ناممکن ہوگا کہ ہندوستان کے کسی حصہ کے مسلمان کانگریس میں شریک ہیں۔''۲؎

## جونپور کا جلسہ

اخبار مارننگ پوسٹ الہ آباد نے ایک خبر شائع کی کہ وہاں پر پانچ ہزار مسلمانوں کا

جلسہ ہوا اور انھوں نے کانگریس میں شرکت منظور کی اور کانگریس کی حمایت میں رزولوشن پاس ہوا۔لیکن اگلے دن پائینیر میں اس خبر کو غلط قرار دیا گیا کہ جونپور میں ایسا کوئی جلسہ منعقد ہوا ہے۔سرسید نے اس پر لکھا:

''یہ خبر ایک بہت بڑا مذاق ہے۔خود نیشنل کانگریس ایک بڑا مذاق ہے اس نے بلاشبہ مذاق کی بہت سی باتوں سے ہمیں خوش کیا ہے اور غالب ہے کہ آئندہ اس سے بھی زیادہ خوش کرے گی اور اس بات کے دیکھنے سے کہ محمد علی بھیم جی ان اضلاع میں ایک دورے میں مصروف ہوں اور مسلمانوں کو اپنے خیالات کی طرف مائل کرتے ہوں نہایت لطف معلوم ہوتا ہے۔اور اس بات کو ثابت کرنے کی کوشش کرنا کہ جن لوگوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے جیسی کہ چار کو ایک کے ساتھ نسبت ہے ان کو ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ سے فائدہ حاصل ہوگا ایک دوسرا بڑا مذاق ہے کہ جن شخصوں یعنی ہندوؤں کی تعداد کثیر ہے وہ اکثر ان سادہ مزاج آدمیوں پر خوب ہنستے ہیں جو اس پر یقین کر لیتے ہیں کہ کانگریس کی کامیابی سے مسلمانوں کا فائدہ ہوگا۔''

کانگریس لیڈران کا تمسخر اڑاتے ہوئے سرسید نے از راہ طنز لکھا کہ:

''کسی دن پنڈت صاحب موصوف ہندستان کے شہنشاہ اور مسٹر ہیوم ان کے وزیراعظم اور مسٹر سریندرناتھ بنرجی بنگالہ کے گورنر ہوں گے ہندوستان کے پولیٹیکل معاملات اب تک نہایت سست اور بے رونق رہے ہیں اور ہم کانگریس والے دوستوں کے اس لحاظ سے کسی قدر شکرگزار ہیں کہ انھوں نے اس بے رونقی کو کسی قدر رفع کیا ہے۔''[۴]

## ناگپور کا جلسہ

انجمن ناصرالاسلام ناگپور کی طرف سے ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا اور اس میں پاس شدہ حسب ذیل رزولوشن بخدمت سرسید احمد خاں ارسال کیا گیا جس میں یہ دعویٰ کیا گیا تھا



کہ کانگریس ملک کے تمام طبقات کی نمائندہ نہیں ہے اس لیے اسے سب کی طرف سے بولنے کا کوئی حق نہیں ہے۔

''اس انجمن کی رائے یہ ہے کہ فرضی نیشنل کانگریس کے مقاصد اور کارروائی کے باعث سے بدخواہی اور ناراضی کا ایک عام جوش پیدا ہوتا ہے اور وہ اول تو عام ہندوستانیوں کے حق میں اور دوم خاص مسلمانوں کے حق میں مضر ہے۔کانگریس کی خواہش بیس کروڑ انگریزی رعایا کی خواہش نہیں ہے اس کا یہ عام دعویٰ ہے کہ اس کو ہندوستان کے باشندوں کی مجارٹی کی طرف سے گفتگو کرنے کا حق حاصل ہے۔باطل ہے پس یہ جلسہ اس کی تمام کارروائیوں کی نسبت اعتراض کرتا ہے اور اس کے کسی کام میں کسی طور پر شرک ہونے سے انکار کرتا ہے...... یہ انجمن اپنے تئیں انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے ساتھ شامل کرتی ہے اور اس کے مقاصد و اغراض کے ساتھ ہمدردی ظاہر کرتی ہے...... اس رزولوشن کی نقل آنریری سرسید احمد خاں کی خدمت میں بھیجی جاوے۔''[۵]

## لدھیانہ کا جلسہ

لدھیانہ میں ۱۰؍دسمبر ۱۸۹۳ء کو ایک جلسہ انجمن اسلامیہ پنجاب کی جانب سے منعقد کیا گیا اور کانگریس کے مقاصد مسلمانوں کے مفادات میں تضاد کا اظہار کیا گیا۔

''رزووشن۔مسلمانان پنجاب خیال کرتے ہیں کہ نیشنل کانگریس ان کی پولیٹیکل اغراض کے بالکل برخلاف ہے اور نیز مجموعی طور سے پورے ملک کے لیے فائدہ بخش نہیں ہے اور اسی وجہ سے اس صوبے کے مسلمانوں کو کانگریس کے اجلاس سے جو لاہور میں منعقد ہوگا کوئی تعلق نہیں ہے۔''[۶]

## مدراس کا جلسہ

مدراس میں ایک عظیم الشان عوامی جلسہ ۲۶ راگست ۱۸۹۳ء کو زیر صدارت سید نظام الدین منعقد ہوا۔ اس میں خاص طور سے اس بات پر زور دیا گیا کہ مسلمان کسی پولیٹیکل اگیٹیشن میں ہندوؤں کے ساتھ شامل نہیں ہوسکتے اس لیے کہ دونوں کے مفاد متضاد ہیں اور دونوں میں شدید پولیٹیکل اختلاف بسبب کانگریس کے مطالبات کے موجود ہیں اور جو بھولے بھالے مسلمانوں کو پکڑ کر کانگریس کے جلسوں میں شریک کیا جاتا ہے غلط ہے اور تمام مسلمانوں نے یہ ثابت کردیا ہے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہوسکتے۔

> ''ہندوستان کے تعلیم یافتہ باشندے دو فرقوں میں منقسم ہیں یعنی ایک فرقہ معتدل رائے رکھنے والے مسلمانوں کا جو یہ بات چاہتے ہیں کہ ملک کی ترقی اس کے حاکموں کے اختیار میں چھوڑ دی جائے اور دوسرا فرقہ پرجوش ریڈیکلوں کا ہے جو نہایت وسیع حقوق چاہتے ہیں فرقہ آخرالذکر میں بابو اور برہمن شامل ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ ملک کے نیک و بد کے انتظام کرنے کا اختیار حاصل ہوگا۔ کانگریس کی تحریک کے جاری ہونے کے بعد دنیا کو اس بات کا یقین دلانے کے واسطے کہ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان کوئی پولیٹیکل اختلاف موجود نہیں ہے۔ بڑی سرگرمی اور استقلال کے ساتھ کوشش کی گئی ہے بھولے بچھڑے مسلمان شارع عام اور گلی کوچوں سے پکڑ کر ہندوؤں کے مجمعوں میں شامل کیے گئے ہیں چنانچہ حال کے اگیٹیشن کی نسبت بھی اسی قسم کی کارروائی کی جاتی ہے۔ لیکن تمام مسلمان ایسوسی ایشنوں نے بغیر شک وشبہ کے یہ بات ثابت کردی ہے کہ مسلمان پولیٹیکل مقاصد کو اگیٹیشن کے ذریعہ سے پورا کرنے کی غرض سے ہرگز ہندوؤں کے ساتھ اتفاق نہیں کریں گے۔''[ے]



## مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ

قصہ مختصر سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک کے زیراثر ہندوستان کے طول وعرض پر مسلمانوں نے جلسے منعقد کیے اور متفقہ طور پر کانگریس کی مخالفت کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ سرسید نے ان فیصلوں پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا کہ سب نے متفقہ طور سے ہمارے فیصلہ کا ساتھ دیا۔

> ''نیشنل کانگرس پر جس کو بنگالیوں نے اور اور لوگوں نے قائم کیا ہے تمام ہندوستان میں بخوبی بحث ہوچکی ہے۔ بنگالہ، بہار، اضلاع شمال ومغرب، اودھ، پنجاب، مدراس اور بمبئی کے ذی وقعت اور ذی تجارت مسلمانوں نے نہایت سختی سے اس کی مخالفت ظاہر کی ہے اور یہ فیصلہ کیا ہے کہ کانگریس اور اس کے مقاصد ملک کے لیے اور ملک میں امن قائم رکھنے کے لیے نہایت خطرناک ہیں ...... اس ملک کے ذی حاجت اور ذی وقعت ہندو صاحب بھی اس امر میں مسلمانوں کیساتھ متفق ہی۔ اودھ کے ذی رعب ہندو مسلمان تعلقداروں نے بالاتفاق کانگریس کے مقاصد سے اختلاف ظاہر کیا ہے اور اس میں شریک ہونے سے انکار کردیا ہے۔ ہز ہائی نس مہاراجہ بنارس جو ہندوؤں کے بہت بڑے مقدس شہر کے مہاراجہ ہیں ایک بہت بڑی میٹنگ میں جس میں اس شہر کے تمام معزز ہندو جمع تھے کانگریس سے ناراضی اور اختلاف ظاہر کیا ہے۔ بالفعل بمبئی میں مسلمانوں کے دو بڑے بڑے جلسے منعقد ہوئے ہیں جس میں سے ایک میں ہز ہائی نس آغا اکبر خاں شاہ صدر تھے۔ اور ایک مجلس ناخدا محمد علی کے مکان پر ہوئی اور سب نے کانگریس سے اختلاف کیا اور اپنی شرکت سے انکار کردیا۔''[۸]

سرسید نے خیال ظاہر کیا کہ بالفرض کانگریس کے مقاصد پورے ہوجائیں تو ایسے

حالات پیدا ہوں گے جو کہ خیال میں بھی نہیں آ سکتے اور ہو سکتا ہے کہ حکومت کو سول کی بجائے فوجی حکمرانی قائم کرنی پڑے۔ کانگریس انگلستان اور ہندوستان میں یہ پروپیگنڈہ کرتی ہے کہ تمام مسلمان اور ہندو اس میں شریک ہیں اس پروپیگنڈہ کا مقابلہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ایک ایسی ایسوسی ایشن قائم کی جائے جو کہ انگلینڈ اور ہندوستان کی عوام کو یہ بتائے کہ یہ دعویٰ غلط ہے۔

> ’’علاوہ ان تمام وجوہات کے خاص مسلمانوں کی قوم کے ذی وجاہت اور ذی رائے اشخاص نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ کانگریس کے مقاصد خاص مسلمانوں کے لیے ان کی موجودہ حالت میں اور نیز آئندہ کو بھی کہ ان کی تعلیم میں کتنی ہی ترقی ہو جاوے نہایت درجہ مضر ہوں گے۔ بالفرض اگر کانگریس کے مقاصد پورے ہو جاویں تو ملک کے امن میں کس قدر خلل واقع ہوگا بیان کرنا نہایت مشکل ہے کچھ عجب نہیں کہ ایسے واقعات پیش آویں جو اس وقت خیال میں بھی نہیں آ سکتے۔‘‘[۹]

درحقیقت ایسے ہی واقعات پیش آئے کہ چالیس سالہ دور اقتدار میں جس قدر بے گناہ انسانوں کا خون بہایا گیا جو فرقہ وارانہ فسادات اور دوسرے قسم کے ذات پات کے فسادات ہوئے وہ تاریخ کے تاریک ترین دور سے بھی زیادہ بھیانک ہیں۔ خاص طور سے ہندوستان کی تاریخ میں کسی ایسے زمانہ کی مثال نہیں ملتی جب کہ امن وامان میں فرقہ وارانہ بنیادوں پر اس قدر خلل واقع ہوا ہو۔ بادشاہوں اور نوابوں و راجاؤں کے درمیان جنگیں اور چیز ہیں ان میں ہوا قتل عام بالکل مختلف نوعیت کا ہوتا ہے۔

> ’’جو اختلاف کہ ہندوستان نے کانگریس سے کیا ہے اس سے اس ملک کے لوگ اور حکام بخوبی واقف ہیں مگر کانگریس والے غلط طور سے انگلستان میں پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ کل ہندو مسلمان ہندوستان کے رہنے والے کانگریس کے موید ہیں پس ہم کو ضرورت ہے کہ ہم انگلستان کے لوگوں کو مطلع کریں کہ بہت سے مسلمان اور بہت سے



> ذی رعب و ذی وجاہت ہندو کانگریس کے برخلاف ہیں۔‘‘[۱۰]

## انگلینڈ کی عوام کو مطلع کرنا

سرسید کا یہ انتہائی دانشمندانہ اقدام تھا کہ صرف ہندوستان کی عوام کے جاننے سے ملک کے انتظام پر کوئی اثر پڑنے والا نہ تھا جب تک کہ خود برطانیہ کی عوام کی رائے کو نہ بدلا جائے کیونکہ وہی دراصل برطانوی پارلیمنٹ کے ذریعہ ہندوستان کے اصل حکمراں تھے۔ اسی مقصد کے پیش نظر سرسید نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کی جس میں مسلمانوں کے علاوہ بہت سے ہندوؤں نے بھی سرسید کا ساتھ دیا۔

> ’’اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ مسلمان اور ہندو جو کانگریس کو ناپسند کرتے ہیں ایک ایسوسی ایشن بنام اڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن قائم کریں اور ہر شخص جو اس کا ممبر ہو پانچ روپیہ ماہواری چندہ دے اور نیز عالی ہمت لوگوں سے ڈونیشن کی درخواست کی جاوے......
> اس ایسوسی ایشن میں سوائے ہندو اور مسلمان کے اگر یورپین بھی ہمارے ساتھ شریک ہوں گے تو نہایت احسان مندی سے ہم ان کی شرکت قبول کریں گے......لیکن کوئی شخص جو گورنمنٹ کا ملازم ہو اس میں شریک نہیں ہو سکتا پس جن بزرگوں کو اس ایسوسی ایشن میں شریک ہونا منظور ہو لکھنؤ میں جناب منشی محمد امتیاز علی صاحب اور بنارس میں جناب راجہ شیو پرشاد صاحب سے اور علی گڑھ میں مسٹر بیک یا راقم سے خط و کتابت فرمائیں ہر ایک ممبر کا نام اور اس کا چندہ مشتہر ہوتا رہے گا۔‘‘[۱۱]

سرسید احمد خاں اس ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور آنریری ٹریزرار بنے۔ دراصل یہ انھیں کے ذہن کی پیداوار تھی لہٰذا انھیں کو اس کا کام بھی کرنا تھا۔ ۱۸۸۸ء میں بھی جب کہ کالج ابھی نیا نیا ہی بنا تھا، سرسید پر کتنا کام رہا ہوگا اس کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے لیکن اس معمار قوم نے ان خطرات سے بھی مقابلہ کا جو کانگریس کی وجہ سے مسلمانوں کو مستقبل میں درپیش ہونے والے تھے۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ ابھی ان نقصانات کا کوئی

تجربہ بھی نہ ہوا تھا اور سب مستقبل کی باتیں تھیں لیکن پھر بھی سرسید نے پیش بندی کے طور پر مسلمانوں کو ان سیاسی خطرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھا جو ان کو درپیش تھے۔ اس کے برخلاف آج مسلمان قوم میں ایک بھی شخص یا تنظیم ایسی نظر نہیں آتی جو مسلمانوں کو پے در پے ہونے والے نقصانات اور عزت نفس پر حملہ کی شکایت ہی صحیح طریقے سے حکومت میں پیش کر سکے۔ اس حالت کی وجوہات بہت تفصیل طلب ہیں لیکن مسلمانوں میں کوئی طاقتور تنظیم اس لیے ابھر کر نہیں آسکی ہے کیونکہ انھوں نے سرسید کی دانشمندانہ راہ کو چھوڑ کر انھیں لوگوں کا ساتھ دینا پسند کر لیا جن سے سرسید اپنی زندگی کے آخری تیرہ سالوں میں (جب سے کانگریس بنی: ۱۸۸۵ء سے ۱۸۹۸ء ت) زندگی کی آخری سانس تک لڑتے رہے اور اسی نظریۂ قومیت کو تسلیم کر لیا جس سے کہ سرسید نے اختلاف کیا تھا۔

## ایسوسی ایشن کے قواعد

اس تنظیم کا نام انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن ہوگا اور مقاصد حسب ذیل ہوں گے:

(۱) بذریعہ چھاپنے اور تقسیم کرنے پمفلٹوں اور دیگر قسم کے کاغذات کے ممبران پارلیمنٹ اور انگریزی اخبارات اور گریٹ برٹن کے لوگوں میں ان غلط بیانیوں کی اصلاح کرنا جن کے ذریعہ کانگریس نے غلط طور پر انگلستان کے لوگوں کو اس بات پر یقین دلانے کی کوشش کی ہے کہ کل قومیں ہندوستان کی مقاصد کانگریس پر متفق ہیں۔

(۲) مسلمانوں اور انجمن ہائے اسلامی اور ان ہندوؤں اور ہندو انجمنوں کے خیالات سے جو کانگریس کے مقاصد کے برخلاف ہیں اسی ذریعہ سے ممبران پارلیمنٹ اور گری برٹن کے اخبارات اور وہاں کے لوگوں کو اطلاع دینا۔

(۳) ہندستان کے امن و امان اور برٹش گورنمنٹ کے استحکام میں کوشش کرنا اور ہندوستان کے لوگوں کے دلوں میں سے ان برے خیالات کا دور کرنا جو حامیان کانگریس ہندوستان میں پھیلاتے ہیں۔

(۴) ہندوستان کے والیان ملک جو اس ایسوسی ایشن کی تجاویز کو پسند فرمادیں گے ان



سے درخواست کی جاوے گی کہ وہ اس ایسوسی ایشن کا پٹرن ہونا منظور فرماویں۔

(۵) کوئی شخص جو گورنمنٹ کا ملازم ہو اس ایسوسی ایشن کا ممبر نہ ہو سکے گا۔

(۶) انجمن ہائے اسلامی اور ہندو انجمنوں کے نام جو ایسوسی ایشن کے ساتھ متفق ہوں گے ایک جداگانہ فہرست میں مندرج ہوں گے۔

(۷) ہر ایک پملفٹ کے ساتھ ایسوسی ایشن کے ممبروں اور ڈونیشن دینے والوں اور انجمن ہائے مذکورہ بالا کی فہرستیں چھاپہ ہو کر انگلستان کے لیے مرسل ہوں گی۔

کل چودہ قرار پائے تھے آخری قانون سرسید کی سکریٹری اور ٹریزررشپ سے متعلق تھا۔

(۸) جب تک کہ کوئی دوسری تجویز ہو آنریبل سرسید احمد خاں بہادر کے سی ایس آئی ساکن علی گڑھ ایسوسی ایشن کے آنریری سکریٹری اور ٹریزرار رہیں گے اور تمام خط و کتابت متعلق ایسوسیایشن ان سے ہوگی۔''۱۲؎

اس ایسوسی ایشن کے قیام کے بعد سرسید نے بہت تندہی سے اس کے کام کو آگے بڑھایا اور کوئی اسلامی انجمن ایسی نہ رہی جو اس ایسوسی ایشن کی ممبر نہ بنی ہو اور بالعموم اس کا خیر مقدم جوش و خروش کے ساتھ کیا گیا۔ اس کامیابی پر سرسید نے جا بجا اپنی خوشی اور اطمینان کا اظہار کیا ہے۔ سرسید کے انہماک اور جانفشانی کا اندازہ اس خط سے بھی ہوتا ہے جو انھوں نے اردو اخبارات کے ایڈیٹرز کو لکھا تھا۔ اس میں درخواست کی گئی تھی کہ وہ جو مضمون یا خبر ایسی چھاپیں جو ایسوسی ایشن کے مقصد سے مماثل ہو از راہ امداد اور ہمدردی قوم ان کے پاس بھیج دیں تا کہ اس کا ترجمہ کرا کے انگلینڈ بھیجا جا سکے۔

بخدمت ایڈیٹران اردو اخبارات

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قواعد میں جو انگلستان کو بغرض اشاعت بھیجے جاویں گے یہ قاعدہ بھی قرار پایا ہے کہ جس اردو اخبار میں کوئی مضمون یا آرٹیکل ایسا چھپے جو ایسوسی ایشن کے مقاصد کا حامی ہو یا ہندوؤں اور مسلمانوں کی مجلسوں کی ایسی خبریں یا اجلاس کی روداد چھپیں تو ان کا انگریزی ترجمہ بھی بطور مناسب اس رسالہ میں مندرج ہوا کرے۔ پس میں انڈیٹران اردو اخبارات سے درخواست کرتا ہوں

کہ جس اخبار میں اس قسم کا مضمون چھپے وہ بطور عنایت اور بہ نظر امداد
ایسوسی ایشن کے بندہ کے پاس بھیج دیا کریں۔'' ۱۳؎

اپنے قریبی دوستوں کو خطوط کے ذریعہ ایسوسی ایشن کا ممبر بننے کی ترغیب دی۔ دلی جامع مسجد کے امام سید محمد بخاری کو خط میں لکھتے ہیں:

''برادر صاحب عزیز و شفیق من......!
جو ایسوسی ایشن برخلاف ہندوؤں کے ہم نے قائم کی ہے اس میں تمہارا شریک ہونا نہایت ضرور اور مناسب ہے۔ مقدار چندہ کتنا دینے کی ہے صرف بارہ روپے سال دینے ہوں گے پس منظور مجری سے اطلاع دو کہ تمہارا نام ممبروں میں درج ہو اور بارہ روپیہ بھیج دو۔'' ۱۴؎

اس ایسوسی ایشن نے ایک تحریک یہ چلائی کہ مسلمانوں کے دستخطوں سے ایک درخواست برطانوی پارلیمنٹ بھیجی جائے جس میں بتایا جائے کہ مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں اور ان کے الگ مطالبات ہیں۔ مسلمان کانگریس کو اپنے حقوق کی علمبردار نہیں سمجھتے۔ لاکھوں مسلمانوں نے اس پر دستخط کر دیے اور مسلمانوں کا اجماع سرسید کی اس اپیل پر ہو گیا۔ تمام فرقے سنی وہابی، غیر وہابی، شیعہ وغیرہ سب کے سب سرسید کی اپیل پر متفق ہو کر کانگریس کی مخالفت میں اٹھ کھڑے ہوئے۔

''سب نے بالاتفاق نیشنل کانگریس سے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سرسید احمد کے نزدیک اس میں شریک ہونا مناسب نہ تھا۔ لکھو کھا مسلمانوں نے ان کاغذوں پر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دیے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے اظہار کے لیے ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگریس میں شریک نہیں ہیں۔'' ۱۵؎

### مہاراجہ بنارس کی تقریر

شروع میں سرسید کی اینٹی کانگریس تحریک میں مہاراجہ بنارس اور ان کے مشیر راجہ



شیو پرشاد نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور وہ ایسوسی ایشن کے ممبر بھی رہے اسی سلسلہ میں بنارس میں ایک جلسہ شہر کے معززین کا منعقد کیا گیا جس میں مہاراجہ بنارس کرسی صدارت پر رونق افروز رہے اور راجہ شیو پرشاد نے ان کی طرف سے تقریر پڑھ کر سنائی۔

''بھائیو...... ! میری عادت اسپیچ کرنے کی نہیں ہے لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ میں خاموش نہیں رہ سکتا میں دیکھتا ہوں کہ چند آدمی متفق ہو کر ہمارے عزیز ملک ہندوستان کے سر پر بربادی ذلت اور بے عزتی لانا چاہتے ہیں چونکہ میں اس ملک کا ایک ناچیز باشندہ ہوں لہٰذا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ میں اس خطرے سے جو ہم پر نازل ہونے والا ہے خبردار کروں کیا تم اپنے تئیں کنویں میں گرانا چاہتے ہو؟...... میں کہتا ہوں کہ تم اپنے تئیں بچاؤ میں نے سنا ہے کہ چند شخصوں نے نیشنل کانگریس قائم کی ہے اور وہ ریپریزنٹیشن اور ڈیلیگیٹیو کا ذکر کرتے ہیں جبکہ خود میں ان لفظوں کے معنی نہیں سمجھتا ہوں تو میں کیونکر تمہیں سمجھا سکتا ہوں...... اگر تم یہ بات کہو کہ اس میں بہت سے ایم اے اور بی اے شریک ہیں تو وہ بے پر کے پرند ہیں جہاں تک میں سمجھتا ہوں وہ ایک ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ شاید مثل اس کے چاہتے ہیں جیسی کہ امریکہ میں قائم ہے گو وہ بالفعل ایسا نہیں کہتے لیکن جس حالت میں وہ ہماری ملکہ معظمہ کی تعریف گاتے ہیں تو وہ اندر سے حضور ممدوحہ کی برائی کے خواہاں ہیں۔ کوئی شخص جس میں ذرا سی بھی عقل ہے لاحاصل اور بے فائدہ کام میں مصروف نہ ہوگا۔'' ۱۶؎

سرسید نے راجہ صاحب بنارس کی ایسوسی ایشن میں شرکت پر خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہندوؤں میں قابل و معزز آدمی ہمارے ساتھ ہو گیا ہے۔

''شمالی اضلاع کے ہندوؤں کا ایک ایسا گروہ مل گیا ہے جس پر ہر ایک قوم فخر کر سکتی ہے مہاراجہ ممدوح پیچ دار فقرات کا استعمال کرنا پسند نہیں کرتے اور اپنے سچے مسائل کو مثل ایک سپاہی کے صاف صاف

ظاہر کرتے ہیں۔کانگریس والے بڑے بڑے جملےاور بڑے بڑے فقرے استعمال میں لاتے ہیں جن کے معنی ان میں بیس میں سے ایک شخص بھی نہیں سمجھتا۔''۱۷

## راجہ بھنگا کی حمایت

راجہ بھنگا بھی مہاراجہ بنارس کی طرح ذی وجاہت اور ہندوؤں میں معزز تھے اور ایک انگریزی کتاب ''جمہوریت ہندوستان کے لیے موزوں نہیں'' کے مصنف کی حیثیت سے انھیں شہرت حاصل تھی۔اس کتاب میں سرسید کی میرٹھ تقریر اور بیک کے خیالات سے اتفاق کیا گیا تھا۔وہ بھی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے ممبر تھے اور اینٹی کانگریس تحریک میں حصہ لیتے تھے۔انگلستان کی عوام کو کانگریس کے غلط پروپیگنڈے سے باخبر کرنے کے لیے راجہ بھنگا نے اپنی کتاب کے نو سو نسخے سرسید کی خدمت میں ارسال کیے کہ ان کو مفت انگلستان میں تقسیم کروادیں۔سرسید اس خبر کی اطلاع دیتے ہوئے گزٹ میں رقم طراز ہیں:

''انھوں نے ازراہ عنایت اپنی مشہور اور بے نظیر کتاب کے نو سو نسخے بطور ڈونیشن ہماری ایسوسی ایشن کو اس غرض سے عنایت کیے ہیں کہ ہم ان کو بذریعہ اس ایسوسی ایشن کی ایجنسی کے جو انگلینڈ میں ہے انگلینڈ کے لوگوں میں تقسیم کریں۔ہم اس عنایت کا جو انھوں نے ایسوسی ایشن پر فرمائی ہے شکریہ ادا کرتے ہیں۔''۱۸

## پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں اختلاف

۲۲ر اکتوبر ۱۸۸۸ء کو مہاراجہ بنارس نے ایک جلسہ تعلقداران اودھ کا برخلاف کانگریس منعقد کیا۔سرسید کو بھی اس جلسہ میں مدعو کیا گیا۔سرسید اس میں شریک ہوئے لیکن مہاراجہ بنارس اور راجہ شیو پرشاد نے اس جلسہ میں ایسی تجاویز کیں جن سے ایسوسی ایشن کی بیخ کنی ہوگئی۔انھوں نے بغیر کسی مشورہ کے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو ایک نئی ایسوسی ایشن کا علاقائی ممبر قرار دیا۔اس نئی ایسوسی ایشن کا نام انڈین لائلز ایسوسی ایشن تجویز کیا گیا۔تجویز ہوا کہ انجمن خیرخواہان ہند زیر نگرانی مہاراجہ بنارس قائم ہو اور علی گڑھ کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن



اس کی ایک شاخ ہے لیکن سرسید نے جیسا کہ متوقع تھا اس تجویز کی مخالفت کی اور اپنی ایسوسی ایشن کو قائم رکھا۔دراصل یہ مہاراجہ بنارس کی چال تھی جس کے ذریعہ وہ سرسید کی کوششوں پر پانی پھیرنا چاہتے تھے مگر سرسید پر چند آدمیوں کی مخالفت کا کا اثر پڑسکتا تھا جبکہ تمام ہندوستان کے مسلمان ان کے ہمنوا تھے۔اس زمانے کے کچھ ہی دنوں کے بعد راجہ شیو پرشاد وغیرہ کانگریس میں شامل ہوگئے۔اس جلسہ میں راجہ شیو پرشاد نے یہ تجویز پیش کی کہ ہندو اور مسلمان کی دو الگ الگ انجمنیں بنائی جائیں اور مہاراجہ بنارس اس کے سرپرست قرار دیے جائیں۔پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور لکھنؤ کی اینٹی کانگریس کمیٹی کو ختم کرکے انجمن خیرخواہان ہند بنائی جائے۔سرسید اور مہاراجہ بھنگا اس کے دو جوائنٹ سکریٹری مقرر کیے جائیں۔سرسید نے اس تجویز کی مخالفت کی۔اخبار پائینیر میں یہ خبر چھپی کہ پیٹریاٹک ایسوسیایشن ختم کردی گئی ہے اور گورنمنٹ کو درخواست گزارنے کا اختیار نئی انجمن کو سونپ دیا گیا ہے۔اس خبر کی تردید کرتے ہوئے سرسید نے پورے جلسہ کی کارروائی اور اس میں پاس ہوئی تجویزوں کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے۔

''یونائیٹڈ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن جو میں نے بصلاح دیگر بہی خواہان ملک کے قائم کی ہے اور جس کے ممبروں کی فہرست عنقریب میں آپ کے پاس بھیجوں گا۔اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شامل ہیں مگر بعض ہندو دوستوں نے مجھ سے شکایت کی کہ تم انے اس ایسوسی ایشن کے قائم کرنے اور قواعد بنانے میں عموماً ہندو صاحبوں سے جو نیشنل کانگریس کے مخالف ہیں صلاح مشورہ نہیں کیا جس سے وہ ناراض ہیں۔میں نے کہا کہ جس طرح ان کی ناراضی مٹ سکے میں تیار ہوں۔اس پر ایک تحریری یادداشت جس پر منشی نول کشور صاحب کے دستخط ہیں مجھے پیش کی گئی۔''۱۹

اس درخواست میں دو تجویزیں تھیں کہ ایسوسی ایشن کے قوانین میں ترمیم اور از سرنو تشکیل کے لیے گفتگو ہونی چاہیے اور یہ طے کیا جانا چاہیے کہ یہ انجمن کیا کیا کام کرے اور ہر کام کے لیے جداگانہ کمیٹیاں اور اس کے سکریٹری مقرر کیے جائیں۔سرسید نے ان دونوں

تجویزوں پر بحث کی اجازت دے دی۔

''میں نے اس تجویز کو منظور کیا اور جو جلسہ کہ بیس نومبر کو لکھنؤ میں ہوا اس میں حاضر ہوا۔لیکن برخلاف یادداشت کے راجہ شیو پرشاد نے یہ قرار دیا کہ لکھنؤ میں ایک مستقل سینٹرل ایسوسی ایشن بطور اینٹی کانگریس کے بذریر سرپرستی ہز ہائی نس مہاراجہ بنارس قائم ہوا اور اس کا نام انڈین لائل ایسوسی ایشن رکھا جائے۔''[۲۰]

یعنی جو تجاویز سرسید کے سامنے رکھی گئی تھیں اس سے الگ ایک نئی تجویز منظور کرائی گئی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو کلیتاً ختم کرنا تجویز کیا گیا۔سرسید کا خیال تھا کہ جتنی بھی انجمنیں کانگریس کے خلاف بنائی جائیں اس سے ان کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو فائدہ ہی ہوگا۔ انھوں نے نئی انجمن کی تشکیل کی مخالفت نہیں کی اور نئی انجمن کا سکرٹیری بننا منظور کر لیا لیکن اس تجویز کے بعد نئی تجاویز پیش کی گئیں۔ان میں پہلی یہ تھی کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو ختم کر دیا جائے اور ایک برانچ نئی انجمن کی مانا جائے دوسری یہ کہ ایک درخواست حکومت کو بھیجی جائے جس میں کہا جائے کہ کانگریس کے لیڈران چونکہ ملک میں بدامنی پھیلانا چاہتے ہیں لہٰذا انھیں گرفتار کیا جائے۔سرسید نے ان دونوں تجویزوں سے اختلاف کیا۔

''راجہ صاحب نے دو تجویزیں پیش کیں اور چاہا کہ ان پر سب متفق ہوں اور اجلاس سے منظور کی جاویں۔اول یہ کہ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن انجمن خیرخواہان ہند کی جو اس وقت قائم ہوئی ہے بطور ایک برانچ کے قرار دی جائے اور اس کا نام تبدیل کر کے برانچ انجمن خیرخواہان ہند قرار دیا جائے۔ یہ امر بالکل برخلاف اس یادداشت کے تھا جو میرے سامنے پیش ہوئی تھی میں نے اس کو منظور نہیں کیا اور نہ اس کا منظور کرنا بلا اجازت ممبران پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میرے اختیار میں تھا۔ دوم یہ کہ راجہ شیو پرشاد بہادر ستارہ ہند اس بات کی تحریک کریں گے کہ بغرض اضافہ بعض دفعات قوانین مروجہ میں انسداد تحریر تقریر فسادانگیز و بغاوت خیز بدیسی زبان میں گورنمنٹ



سے درخواست کی جاوے جس طرح پر کہ بھیم جی وغیرہ اکثر آدمی فساد انگیز اور بغاوت خیز دیسی زبان میں تحریر و تقریر برملا کر رہے ہیں اس جلسہ کے نزدیک اس کا انسداد قانوناً کیا جائے۔''[۲۱]

ان دونوں تجویزوں سے سرسید متفق نہیں ہوئے۔یہ جانتے ہوئے بھی کہ کانگریس کی کارروائیوں سے ملک میں بدامنی پھیلنے کا اندیشہ ہے۔وہ کانگریس والوں کو حکومت کا غیر وفادار نہیں سمجھتے تھے اور ان کے نزدیک یہ کام حکومت کا تھا کہ وہ جو چاہے کرے ہمیں اس کے لیے درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔

''کانگریس والوں سے ہم کو کچھ عداوت نہیں ہے کہ ان کو فوجداری میں ماخوذ کرانے کی تدبیریں کریں۔ہم میں اور ان میں رائے کا اختلاف ہے۔ہم سمجھتے ہیں کہ جو کچھ وہ چاہتے ہیں ہم مسلمانوں کے لیے اور راجپوتوں کے لیے بالتخصیص ملک کے امن کے لیے اور ہمارے ملک کی دیگر اقوام کے ہندوؤں کے لیے اور ملک کے امن کے لیے نہایت مضر ہیں۔اس لیے ہم اس کے برخلاف ہیں اگر ان کی کارروائی سے ملک میں فساد ہونے کا اندیشہ ہے اور میری رائے میں یہ بھی بلاشبہ اندیشہ ہے تو یہ گورمنٹ کا کام ہے جو کچھ چاہے وہ کرے ہم کو کسی درخواست دینے کی ضرورت نہیں ہے۔میں نے ان سے صاف کہہ دیا کہ اگر یہ تجویزیں میٹنگ میں پیش ہوں گی یا تو میں میٹنگ میں نہ جاؤں گا اور نہ شریک ہوں گا اور اگر شریک ہوں گا تو ان تجاویز کی سخت مخالفت کروں گا۔''[۲۲]

سرسید نے اس نئی انجمن کی سکریٹری شپ سے اسی وقت اپنا استعفا پیش کر دیا اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو اسی طرح چلاتے رہے جیسا کہ پہلے چلاتے تھے۔اتنا سا فرق اس میں آ گیا کہ پہلے کچھ ہندو حضرات اودھ کے راجہ وغیرہ اس میں شامل تھے اور اب ہی صرف عملاً مسلمانوں کی جماعت رہ گئی جو تعاون کچھ ہندوؤں سے سرسید کو ملتا تھا وہ ختم ہو گیا۔

## حواشی:

(۱) گزٹ، جولائی ۱۸۸۸ء، ص: ۱۳۸

(۲) گزٹ، ۱۰ر جولائی ۱۸۸۸ء، ص: ۸۹۴

(۳) گزٹ، جولائی ۱۸۸۸ء، ص: ۷۹۷

(۴) گزٹ، دسمبر ۱۸۸۸ء ص: ۱۳۰۴

(۵) گزٹ، جولائی ۱۸۸۸ء، ص: ۷۹۷

(۶) گزٹ، دسمبر ۱۹۹۳ء، ص: ۲۰۸

(۷) گزٹ، ستمبر ۱۸۹۳ء، ص: ۸۶۵

(۸) گزٹ، ۱۱ر ستمبر ۱۸۸۸ء، ص: ۹۰۵

(۹) ایضاً

(۱۰) ایضاً

(۱۱) گزٹ ۱۸۸۸ء، ۱۱ر اگست، ص: ۹۹۵

(۱۲) گزٹ، اگست ۱۸۸۸ء، ص: ۹۷۱

(۱۳) گزٹ، اگست ۱۸۸۸ء، ص: ۹۶۰

(۱۴) مکتوبات سرسید، ص: ۲۲۸

(۱۵) حیات جاوید، ص: ۹۰۰

(۱۶) ماخوذ مارننگ پوسٹ، گزٹ ۱۸۸۸ء، جولائی، ص: ۸۳۷

(۱۷) ایضاً

(۱۸) انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۸ء، ص: ۴۲۰

(۱۹) مراسلہ پانیئر گزٹ، نومبر ۱۸۸۸ء، ص: ۱۳۶۲

(۲۰) ایضاً

(۲۱) ایضاً

(۲۲) ایضاً

# سرسید پر تنقیدیں اور جوابات

## سرسید کا سیاسی مخالف: ہیوم

مسٹر ہیوم نے قیام کانگریس سے قبل سرسید سے اس سلسلہ میں مشورہ طلب کیا تھا کہ آیا ایک ایسی جماعت بنانے کے لیے آپ رضامند ہیں۔ سرسید نے صاف الفاظ میں اس خیال کی سخت مخالفت کی تھی۔

''مسٹر ہیوم نے قیام کانگریس کے وقت مجھ سے استصواب رائے کیا تھا اور میں نے جواب میں واضح طور سے لکھ دیا تھا کہ میں اس کے خلاف ہوں۔''[۱]

کانگریس کے مطالبات سامنے آنے سے پہلے ہی سرسید کسی نیشنل جماعت کے حامی نہیں تھے اور اس کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔ اس کا ثبوت فوراً ہی ان کے سامنے پیش ہو گیا جب کانگریس نے اپنے پہلے ہی جلسے میں ایسے مطالبات پیش کیے جو کہ مسلمانوں کے لیے سراسر نقصان دہ تھے اور تماشہ یہ کہ ان مطالبات کو ہندوستان کے تمام باشندوں کی خواہشات کا آئینہ دار بتایا گیا۔

ہیوم سرسید کے دیرینہ شناسا تھے اور ان کے ذہن میں کانگریس بنانے کا خیال سرسید کی انقلاب آفریں تصنیف اسباب بغاوت ہند پڑھ کر ہی آیا تھا جس میں انگریز حکمرانوں اور ہندوستانیوں کے بیچ کی دوری اور ایک دوسرے کے خیالات سے ناواقفیت کو اس بغاوت کی بڑی وجہ قرار دیا گیا تھا۔ لہٰذا ہیوم اور دوسرے انگریزوں نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے ایک ایسی جماعت بنائی جس کے ذریعہ حکمرانوں کو ہندوستانیوں کے خیالات کا علم ہو سکے اور کاروبار حکومت میں آسانی ہو۔ لیکن سرسید ہندوستان میں ریپریزنٹیٹو اصول کے جاری ہونے کی وجہ سے ایسے کسی خیال کی حمایت نہیں کر سکتے تھے وہ صاف دیکھ رہے تھے کہ اگر



ایسی کوئی جماعت سادے جمہوری ادارے قائم کرنے میں کامیاب ہوتی ہے تو اس کا مسلمانوں پر کیا اثر پڑے گا۔ ہیوم اور سرسید کی یہ دیرینہ شناسائی کانگریس کی حمایت اور مخالفت کے مسئلہ پر باہمی مخالفت میں تبدیل ہو گئی۔ ہیوم اس درجہ سرسید سے خفا رہنے لگے کہ ایک موقع پر جب سرسید ان سے ہاتھ ملانے آگے بڑھے تو انھوں نے ہاتھ تک ملانے سے انکار کر دیا۔ اس پر بھی سرسید نے کہا کہ سیاسی اختلافات کو نجی تعلقات پر اثر انداز نہیں ہونا چاہیے۔

''پبلک سروس کمیشن کے سامنے جب مسٹر ہیوم اپنا بیان دے چکے تو ان سے ہاتھ ملانے کے لیے میں ان کی طرف بڑھا وہ جھجک کر کچھ پیچھے ہٹے تو میں نے کہا کہ پبلک معاملات میں اختلاف رائے کو نجی تعلقات میں حائل نہ ہونے دینا چاہیے۔''[۲]

قیام کانگریس کے بعد ہیوم سرسید کے خیالات کی کھل کر مخالفت کرنے لگے۔ اس مخالفت میں انہیں اور دوسرے بہت سے انگریز آفیسروں کے علاوہ خود وائسرائے کی حمایت حاصل تھی۔ سرسید کی کانگریس مخالفت کو ہیوم نے ذاتی مخالفت کا سوال بنا لیا تھا اور اسی وجہ سے کانگریس کی کامیابی انگریز آفیسروں کی عزت کا سوال بن گئی تھی۔ اخبار پانیر میں جگہ جگہ ہیوم کی تحریریں سرسید کے خلاف ملتی ہیں۔ سرسید کی لکھنؤ اور میرٹھ تقاریر پر بنگالی ہندو اخباروں کے علاوہ ہیوم اور انکے انگریز حواریوں نے بھی بہت سخت تنقیدیں کی تھیں۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو ناکام بنانے کے لیے ہیوم نے بڑے بڑے انگریز آفیسروں کو خطوط لکھے۔ سر آکلینڈ کالون صوبۂ شمال مغرب کے لیفٹنٹ گورنر تھے، ہیوم نے ان کو سخت الفاظ میں تنبیہ کی کہ سرسید پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی کاروائیاں نینی تال میں بیٹھ کر کر رہے ہیں لہٰذا یہ غلط خیال پیدا ہو رہا ہے کہ گورنر کی مرضی سے اور وائسرائے کی ایما پر ایسا کیا جا رہا ہے۔ یعنی یہ کہ سرسید کو نینی تال سے یہ کارروائیاں مت کرنے دو۔

''...... پانیر اور اس کے حواریوں کے جھوٹے اور مسلسل پروپیگنڈے کے باوجود سلطنت کی آبادی کے فی دس لاکھ پانچ ہندوستانیوں کی بھی سچی اور دلی ہمدردی اسے حاصل نہیں ہے۔ (پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کو)...... رجواڑوں کے عطیات کا سبب یہ ہے کہ سرسید چونکہ

انہیں نینی تال سے خط لکھتے ہیں اس لیے سمجھا جاتا ہے کہ سرسید
تمہاری ترجمانی کررہے ہیں اور تم وائسرائے کی مرضی سے ایسا
کرارہے ہو۔''[3]

ہیوم بجائے اس کے کہ سرسید کے خیالات اور اشکالات کو بغور سنتے اور کانگریس کی پالیسی میں حسب مرضی مسلمانانِ ہند کچھ تبدیلی لانے کی کوشش کرتے الٹا انھوں نے سرسید کی مخالفت میں ایک زبردست مہم جاری کردی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اگر مسلمانوں کے مطالبات کا کچھ بھی خیال شروع کانگریس کے زمانے میں ہی کرلیا گیا ہوتا تو شاید بہت سے تاریخی واقعات اس طرح پیش نہ آتے جیسے کہ آئے اور آج تک آرہے ہیں کہ بغیر مسلمانوں کے سچے خیالات اور مطالبات کو مانے ہوئے بلکہ جان بوجھ کر نظرانداز کرکے بھی ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتیں مسلمانوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی ہیں۔ مسٹر ہیوم نے بھی سرسید کے خیالات پر بالکل کان نہ دھرا بلکہ الٹا ان کی مخالفت میں کمر باندھ لی اور پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی مخالفت میں جگہ جگہ خطوط لکھے میٹنگیں کیں اور اخبارات پر دباؤ ڈالا۔ اپنے ایک طویل مراسلے میں سر آکلینڈ کالون سے ایسوی ایشن میں شامل افراد کا ذکر بڑے تحقیر آمیز انداز میں کرتے ہیں۔ سرسید کی ایسوسی ایشن کے خاص ممبران جیسے مہاراجہ بنارس، راجہ شیو پرشاد، منشی نول کشور کا خاص طور فرداً فرداً ذکر اپنے مراسلہ میں ہیوم نے کیا۔ اس مراسلہ سے انگریزوں کی کانگریس کو کامیاب بنانے میں گہری دلچسپی کا اظہار ہوتا ہے اور ثابت ہوجاتا ہے کہ کانگریس کو کامیاب بنانے میں انگریزوں کا خاص ہاتھ تھا مہاراجہ بنارس کے بارے میں لکھتے ہیں:

''مہاراجہ بنارس کو لیجئے۔ حال ہی میں اس غریب بوڑھے مہاراجہ کو
کانگریس کی مخالفت کے لیے میدان میں اتارا گیا ہے...... نہ تو تم
اور نہ کوئی دوسرا ایماندار انگریز جو ان سے واقف بھی ہو دعویٰ کرسکتا
ہے کہ خود اپنے کسی ادنیٰ معاملہ پر غور کرنے کی بھی ان میں دماغی
صلاحیت ہے ذہنی اعتبار سے بالکل صفر............''



راجہ شیو پرشاد کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اور یہ راجہ شیو پرشاد کون ہیں؟ قدیم برطانوی عملے کے ایک فرد برسوں نچلے درجے کے سرکاری ملازم رہے...... کلکتے سے لے کر پشاور تک ان کی کیا حیثیت ہے؟ کسی کے دل میں ذرہ برابر بھی عزت ہے؟......''

راجہ بھنگا کے بارے میں لکھتے ہیں:

''نام نہاد راجہ بھنگا کو لیجئے...... پورے ملک میں کون ان کی حقیقت سے واقف نہیں......اچھی انگریزی کا ایک صفحہ بھی نہیں لکھ سکتے مگر کسی سے لکھوا کر اپنے نام سے ٹائمز میں مراسلے چھپواتے ہیں۔''

منشی نول کشور کے بارے میں لکھتے ہیں:

''منشی نول کشور کو لیجئے......ان کے بارے میں کوئی سخت بات نہ کہوں گا اپنی معذوریاں انھوں نے مجھ سے بیان کی ہیں ان کی کچھ عجیب سی پوزیشن ہے لیکن کانگریس کے وجود میں آنے سے قبل دیسی سوسائٹی میں ان کی کیا پوزیشن تھی کسی کو ان پر بھروسہ تھا؟ کوئی ان کی عزت کرتا تھا؟...... میں چاہوں تو کانگریس کے مخالف تمام نام نہاد لیڈروں کا ایک ایک کرکے اسی طرح کچا چٹھا کھولتا چلا جاؤں۔ لیکن میں جانتا ہوں کہ ان میں علاوہ سرسید کے (جن کے بارے میں کچھ نہ کہوں گا کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ کانگریس کے معاملہ میں وہ بہک گئے ہیں) ایک بھی شاید ایسا نہیں ہے جسے کانگریس کا سوال اٹھنے سے پہلے اپنے اہل ملک کا احترام یا اعتماد حاصل رہا ہو۔''[4]

خط کے لہجے اور زبان کے استعمال سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ ہیوم کس طرح اور کس حد تک کانگریس کی حمایت میں اس سے اتفاق کرنے والوں کی مخالفت کرسکتے تھے۔ خیال رہے کہ یہ خط ایک انگریز دوسرے انگریز کو لکھ رہا ہے۔

## بنگالی اخبارات کی بہتان تراشیاں

### جنم بھومی سے بےوفائی

بنگال کے انگریزی اور بنگالی اخبارات سرسید کے کانگریس کے بارے میں راست نظریات سے بہت خفا ہوگئے اور انھوں نے سرسید کی کردار کشی کی مہم شروع کردی۔ یہ اخبارات سرسید مخالف مضامین سے بھرے رہتے تھے اور اس حد تک سرسید کے دشمن ہوگئے تھے کہ سرسید کی مخالفت میں تہذیب سے نیچے گر گئے اور شرافت کا دامن چھوڑ دیا۔ بنگال کے انڈین مرر نے یہاں تک لکھ دیا کہ سرسید کا نام ہندوستانیوں کے لیے نشان ملامت بن گیا ہے اور انھوں نے اپنی جنم بھونی سے بےوفائی کی ہے۔ کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاید جنم بھومی سے بےوفائی اور وفا کا نظریہ نیا ہے۔نہیں ایسا نہیں ہے بلکہ جب بھی ان کے بھی کسی خیال کی مخالفت یا اپنے فائدے کی بات کوئی اقلیتی طبقہ کرتا ہے تو ہمیشہ یہی الزام لگا دیا جاتا ہے کہ یہ جنم بھومی کی مخالفت ہے یعنی جنم بھومی اکثریت کو فائدہ پہنچانے کا نام ہے اور اقلیتیں اپنے تحفظات کی بات کرتی ہیں تو گویا جنم بھومی سے بےوفائی کرتی ہیں۔ سرسید نے جب کانگریس کے مطالبات کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ ہونا ثابت کردیا تو ان پر بھی جنم بھومی سے بےوفائی کا الزام لگایا گیا۔

> ''سرسید ہمارے دشمنوں کے آلۂ کار بن گئے ہیں جن خیالات کا انھوں نے اظہار کیا ہے وہ یکسر ہندوستانی نوکرشاہی کے خیالات ہیں۔ان کی لکھنؤ تقریر نے ان کی نیک نامی پر سرے سے پانی پھیر دیا ہے......ان کا نام آج تمام ہندوستانیوں میں نشان ملامت بن گیا ہے۔اپنے دوست بنارس والے راجہ شیو پرشاد کی طرح وہ بھی اپنی جنم بھومی کے غیر وفادار ثابت ہوئے ہیں۔'' ۵

یہی وہ خیالات ہیں جن کی بازگشت آج تک ہندوستان کے کانگریسی و جمعیۃ العلمائی مسلمانوں کے بیانات و اخبارات میں سنائی دیتی ہے اور جس کی شروعات مولانا آزاد نے الہلال میں ان بنگالی اخباروں کے خیالات کی نقل کرکے کی۔ اتنے سے فرق کے ساتھ کہ



الہلال میں قرآنی آیات کا اضافہ کردیا ورنہ مولانا اور ان کے ہمنوا جمعیۃ العلماء کے مسلمان کوئی نئی بات نہیں دہراتے رہے ہیں بلکہ یہ انہیں خیالات کی بازگشت ہے جو اس وقت بنگالی ہندوؤں کے اخباروں میں بیان کیے جاتے تھے۔الہلال بھی چونکہ کلکتہ سے نکلا اور جیسا کہ آگے آئے گا بنگالی کانگریسیوں کی سرپرستی میں یہ اخبار نکلتا تھا لہٰذا بنگالیوں نے مولانا آزاد کو اس کام کے لیے بہت زیادہ مالی اور دوسری طرح کی مدد دی۔کلکتہ کا ہندو پیٹریٹ اپنی ۲۳؍جنوری ۱۸۸۸ء کی اشاعت میں رقم طراز ہے:

> ''لکھنؤ میں سرسید احمد خاں نے جو تقریر اردو میں کی تھی اس کا انگریزی ترجمہ پڑھ کر ہمیں انتہائی تکلیف و حیرانی ہوئی ہے۔تقریر کانگریس پر تھی لیکن......سرسید احمد خاں نے بنگالیوں پر بلاوجہ اور بے محل حملے کرنا ضروری سمجھا......ہم بھی اس کا جواب دے سکتے ہیں اور سرسید احمد خاں ہی جیسی سخت کلامی بھی کرسکتے ہیں لیکن یہ روش اختیار کرکے ہم ان کی سطح پر نہیں اترنا چاہتے اس تلخ کلامی اور بے جا حملوں کے باوجود نہ تو ہم سید احمد خاں کی خدمات کو فراموش کرسکتے ہیں جو مسلمانوں کی تعلیم کے سلسلے میں انھوں نے انجام دی ہیں اور نہ ان کی اس حمایت کو بھول سکتے ہیں جو ماضی میں کھلے مقابلے کے امتحان کی انھوں نے کی تھی جس کی اب وہ خود مذمت کر رہے ہیں۔''

بنگال کے ایک اور اخبار نیشنل گارجین نے سرسید کی تقریر کے سلسلہ میں لکھا کہ یہ احمقانہ و جاہلانہ خیالات کا پلندہ تھی یعنی مسلمانوں کو بروقت آنے والے خطرات سے مطلع کرنا ان اخبارات کے نزدیک ایک جاہلانہ کام تھا۔

> ''ایک ایسی تقریر کرکے اپنے کو ہلکا کیا ہے جسے حماقت، جہالت اور تعصب کے مجموعے سے ہی تعبیر کیا جاسکتا ہے۔اس نے ان کی نیک نامی کو سراب میں تبدیل کرکے ایک بار پھر یہ ثابت کیا ہے کہ قد و قامت میں بڑھنے کے باوجود انسان اپنے ہم جنسوں کی نظروں میں گھٹ بھی سکتا ہے۔'' ۶

اس وقت کے تمام مسلم اخبارات نے سرسید کی حمایت اور توصیف میں مضامین لکھے اور عام طور سے سرسید کا مسلمانوں کو آنے والے خطرات سے بروقت باخبر کرنے کے لیے شکریہ ادا کیا گیا۔ اکثریت کی حکومت میں کیا خرابیاں مسلمانوں کے لیے پوشیدہ ہیں ان کا احساس عام طور سے مسلمانوں کو ہونے لگا تھا۔ پانیر نے لکھا کہ:

''جن لوگوں نے پہلے کبھی اس پر غور نہیں کیا تھا اب وہ واضح طور پر سمجھنے لگے ہیں کہ اکثریت کی حکومت کا اصول اسلام کی قطعی تباہی کا باعث ہوگا ہندوؤں کی بھی ایک چھوٹی سی اقلیت یہ محسوس کر رہی ہے کہ ان کا مفاد بھی ان مسلمانوں کے مفاد سے مطابقت رکھتا ہے جو انتہا پسند سیاسی تحریک کی مخالفت کر رہے ہیں۔''[۷]

بنگال کے ایک اور اخبار ہندو پیٹریٹ نے نسبتاً شریفانہ لہجہ اختیار کرتے ہوئے سرسید پر سخت تنقید کی:

''کرسمس کے گزشتہ ہفتہ میں سرسید احمد خاں نے لکھنؤ کی محمڈن ایجوکیشنل کانگریس کے ممبروں کے سامنے جو تقریر کی تھی اسے پڑھ کر ہمیں انتہائی دکھ ہوا۔ معزز سرسید کا احترام ہم نے ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے اور ان کی ان کوششوں کی تعریف کی ہے جو اپنے ہم مذہبوں کی تعلیم کے باب میں وہ کر رہے ہیں...... اپنی تقریر میں گرچہ وہ نیشنل کانگریس کا مضحکہ اڑانا چاہتے تھے لیکن انھوں نے سارا زہر اپنے مخلص غریب بنگالیوں پر انڈیل دیا بلکہ اس میدان میں تو انھوں نے سرلیبل گریفن کو بھی مات کر دیا۔''[۸]

کلکتے کے ہی ایک دوسرے اخبار ''بنگالی'' نے سرسید کی تقریر پر تنقید کرتے ہوئے انکے اس خیال کو غلط قرار دیا کہ مسلمانوں کی اکثریت کانگریس کے خلاف ہے اور لکھا کہ سرسید مسلمانوں کے لیڈر نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے خودغرضانہ مقاصد کی تکمیل کرنا چاہتے ہیں۔ وہ خودغرضانہ مقاصد کیا تھے اس کا اخبار بالکل ذکر نہیں کرتا اور کانگریس کے مطالبات کی مخالفت کو وہ ہندو اور مسلمانوں میں پھوٹ ڈالنے کے مترادف بتاتا ہے۔ مسلم فرقہ کے



مفادات کی حفاظت کرنے کا مطلب اس اخبار کی نظر میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنا تھا یا تو ہندوؤں کے مطالبات کو مسلمان بھی تسلیم کریں یا پھر مخالفت کے نتائج بھگتنے کے لیے تیار ہو جائیں۔

''ایک لمحے کے لیے بھی یہ نہیں سمجھنا چاہیے کہ سرسید نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ ان کے ہم مذہبوں کی اکثریت کے خیالات ہیں اس کا ایک نہایت نمایاں ثبوت مدراس کے اس حالیہ جلسہ میں پیش کیا گیا تھا جس میں مدراس کے مسلمانوں کی آبادی کے معزز نمائندوں نے سرسید کی تقریر پر کڑی تنقید کی تھی............ جلسے میں کہا گیا تھا کہ سرسید مسلمانوں کے لیڈر نہیں ہیں............ مسٹر امیر علی اور نواب عبداللطیف بہادر کے اس گُٹ کی وہ نمائندگی کرتے ہیں جو اپنے خودغرضانہ مقاصد کی تکمیل کے لیے ہندو مسلمانوں میں پھوٹ ڈالتا ہے۔''[۹]

## بنگالی اخبارات کے حملہ کا جواب

سرسید کی میرٹھ اور لکھنؤ تقاریر نے ملک میں بہت تہلکہ مچایا اس لیے کہ یہ تقاریر ہندوستانی مسلمانوں کے پولیٹیکل مینیفسٹو کا درجہ رکھتی تھیں اور کارل مارکس کے کمیونسٹ مینیفسٹو کا جو اثر یورپی اقوام پر ہوا وہی اثر سرسید کی ان تقاریر کا ہندوستانی مسلمانوں پر ہوا۔ بہت زوردار اور واضح الفاظ میں سرسید جیسی عظیم ہستی نے کانگریس کے مطالبات کو مسلمانوں کے لیے مضر بتاتے ہوئے مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا لہٰذا اس کا اثر لازمی تھا۔ سرسید اس وقت تقریباً ستر سال کے ضعیف اور تجربہ کار بزرگ تھے ان کا مدرسہ قائم ہو چکا تھا اور اپنی مختلف تصانیف کی وجہ سے وہ پوری دنیا میں مشہور تھے۔ علماء کی مخالفت دم توڑ چکی تھی اور کفر وارتداد کے فتوؤں کو ملت اسلامیہ نے کلیتاً مسترد کر دیا تھا اور عام مسلمان سرسید کو بلا شرکت غیرے واحد قائد اور ہمدرد تسلیم کر کے تھے۔ ایسے وقت میں کانگریس کی مخالفت میں جو آواز سرسید نے بلند کی وہ پورے ہندوستان اور انگلستان تک میں سنی گئی اور اس پر غور کیا گیا۔ خود سرسید نے اسلامی انجمنوں کو اس پر غور کرنے کی دعوت دی اور تمام ہی انجمنوں نے بلا استثنا سرسید کے خیالات کی حمایت میں رزولوشن پاس کیے۔

سب سے زیادہ مخالفت جیسے کہ پہلے ذکر آ چکا، بنگالی اخباروں نے کی اور نازیبا و ناشائستہ الفاظ سرسید کی مخالفت میں استعمال کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔ ان تمام مختلف تحریروں کا جواب سرسید نے اپنے ایک مراسلہ میں دیا جو ''سرسید اور ہندو'' کے عنوان سے پانیر میں شائع ہوا۔ اس خط میں انھوں نے اپنے اس نظریہ کو دہرایا کہ میں ہندو اور مسلمان کو مثل بھائی اور دلہن کی دو آنکھوں کی مانند سمجھتا ہوں اور ہرگز ہندو و مسلمانوں میں اختلاف پیدا نہیں کرنا چاہتا۔ ایک ملک میں رہنے کی وجہ سے سب ہندوستانی ہیں لیکن چونکہ یہ مطالبات ایسے ہیں جو ہندو اور مسلمانوں میں اختلافات پیدا کرنے کا سبب بنیں گے اس لیے ان مطالبات کی مخالفت کرتا ہوں۔

> ''میرے لکھنؤ کے لیکچر پر میرے بنگالی بھائیوں اور ہندو ہم وطنوں کا غم و غصہ قدرتی تھا اور ناگزیر بھی۔ لیکن اس لیکچر سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہے کہ ہندو مسلمان کے باہمی اتحاد و دوستی کے باب میں میری جو سابقہ رائے اور خواہش تھی وہ میں نے بدل دی ہے۔ مجھ سے زیادہ اور کوئی اس بات کا خواہش مند نہیں ہو سکتا کہ ان دونوں قوموں میں دوستی ہو اور دونوں ایک دوسرے کی مدد کریں۔ میں نے اکثر کہا ہے کہ ہندوستان ایک دلہن ہے، ہندو مسلمان جس کی دو آنکھیں ہیں اور اس کا حسن اسی میں ہے کہ اس کی دونوں آنکھیں برابر ہوں۔''[10]

یہاں یہ بات بہت معنی خیز ہے کہ سرسید کے اس جملہ کو ہندو اور مسلمان خوب صورت دلہن کی دو آنکھیں ہیں اکثر قوم پرست دانش ور اور کانگریس کے ہمنوا اپنی تقاریر اور کتابوں میں یہ ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ آج کا نیشنل ازم سرسید کے خیالات سے مطابقت رکھتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ خلاف حقیقت ہے اور سرسید پر ایک بہتان ہے۔ اکثر مصنفین نے جس میں خود مسلم یونیورسٹی کے دانشور اور تاریخ داں (مثلاً پروفیسر خلیق احمد نظامی) شامل ہیں سرسید کے خیالات کو اپنے اور حکومت وقت کے خیالات سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں ان کے اقتباسات کو غلط طریقے سے استعمال کر کے تحقیقانہ غلط بیانی سے کام لیا ہے اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے۔



یہ سچ ہے کہ سرسید سے زیادہ کوئی ہندو و مسلمانوں کے درمیان اتفاق نہیں چاہتا تھا اور وہ یہاں تک مسلمانوں کو مشورہ دیتے تھے کہ ہندوؤں کی دوستی کی خاطر انھیں گاؤکشی بند کر دینی چاہیے۔

> ''اس امر کا مجھ سے زیادہ کوئی خواہاں نہ ہوگا کہ مذہبی معاملات میں بھی اتفاق اور دوستی پیدا ہونا چاہیے۔ اپنی قوم کو میں نے اکثر سمجھایا ہے کہ ہندوؤں کی دل آزاری کی نیت سے گائے کی قربانی کرنا ایک غیر مہذب حماقت ہے۔ ہم میں اور ان میں دوستی پیدا ہو سکے تو گائے کی قربانی سے وہ کہیں زادہ قابل ترجیح ہے۔'' (ایضاً)

## دلہن کی دو آنکھیں لیکن......

لیکن ان خیالات کا سیاسی و ملکی معاملات سے کوئی تعلق نہ تھا اور سرسید کا نظریہ تھا کہ ان تصورات کی بنا پر اگر ہندو یہ چاہیں کہ مسلمان اس راہ کو اپنالیں گے جو کہ ان کے لیے سراسر نقصان دہ اور ذلت میں مبتلا کر دینے والی ہے تو ہندوؤں کی یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے اور کانگریس کی پالیسی کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔

> ''مگر میرے ہندو بھائی اور بنگالی دوست اگر ایسی راہ اختیار کرنے کی دعوت دیں جو ہمارے لیے مضرت رساں ہو اور ہماری قوم کے لیے باعث ذلت ثابت ہو سکے تو پھر ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی اور اس صورت میں بلاشبہ ہندوؤں اور بنگالیوں کے ان حملوں سے اپنی قوم کو بچانا یقیناً ہمارا فرض ہے جن کے متعلق ہمارا خیال ہو کہ ان سے وہ مجروح ہو سکتی ہے۔ اس وقت میں ان خرابیوں سے بحث نہیں کروں گا جو کانگریس کی تجاویز کے کامیاب ہونے سے ملک میں پیدا ہوں گی لیکن اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ انکی کامیابی سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچے گا۔'' (ایضاً)

آگے چل کر سرسید کا لہجہ کافی تلخ ہو جاتا ہے کہ ان کے خیال میں کانگریس کے مطالبات مسلمانوں کو اپنے پاؤں تلے روندنے کی خواہش کے مترادف تھے۔ انھوں نے کہا

کہ ہندوؤں کی یہ خواہش بیجا ہے اور اس کا پورا ہونا ناممکن ہے اور مسلمان ضرور دب گئے ہیں لیکن ایسے بھی نہیں کہ بنگالی ان کو اپنے مقاصد کے لیے بے دریغ استعمال کر سکیں۔

''یہ حقیقت ہے کہ ہماری قوم آج قعرِ مذلت میں گر چکی ہے۔ ہمارے بنگالی دوست اس افتادہ قوم کو اپنے پیروں تلے روندنے کے آرزومند ہوں تو یہ توقع انہیں نہ رکھنی چاہیے کہ ہم اسے برداشت کرلیں گے انہیں یہ اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ ہم ایک ایسی رسی کی مانند ہیں جو حقیقتاً جل چکی ہے مگر اس کے بل نہیں گئے ہیں اور جو ابھی ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی ہے۔ کچھ گرمی اس میں اب بھی باقی ہے خبردار! سوچ سمجھ کر ہاتھ ڈالنا مبادا کہ جل نہ جاؤ۔'' (ایضاً)

انھوں نے مثال دے کر کہا کہ بالفرض اگر انگریز چھوڑ کر جانا چاہیں تو ہم ان سے یہ درخواست کریں گے کہ وہ تلوار کے مقابلے کا امتحان کرائیں اور جو اس میں کامیاب ہو اسی کو ہندوستان کی حکومت سونپ کر جائیں۔ دراصل سرسید ہندوستان پر انگریزوں کے بعد مسلمانوں کو دوبارہ حکمراں دیکھنا چاہتے تھے۔

''خانہ جنگی ہم بھی پسند کرتے ہیں لیکن وہ خانہ جنگی نہیں جس میں اسلحہ استعمال نہ کیے جائیں بلکہ ہمیں وہ خانہ جنگی پسند ہے جو اسلحہ کے ساتھ ہو۔ اگر سرکار ملک کی داخلی حکومت سے دست بردار ہو کر اسے ہندوستانیوں کو سونپنا چاہے گی تو ہم یہ درخواست پیش کریں گے کہ ایسا کرنے سے پہلے مقابلے کا ایک قانون پاس کیا جائے اور جو قوم اول آئے اسی کو حکومت سونپ دی جائے لیکن اس کے مقابلے کے لیے ہمیں اپنے اجداد کا وہ قلم استعمال کرنے کی اجازت ہو جو فرمانروائی کی سندوں کے لکھنے کا حقیقی قلم ہے۔ اس امتحان میں اول آنے والا ہی ملک پر فرمانروائی کرے گا۔ ہمارے بنگالی دوست اگر اول آئے تو یقیناً ان کی جوتیوں کو اٹھا کر ہم اپنے سروں پر رکھیں گے۔ لیکن بلا اس خانہ جنگی کے اپنی قوم کو روندنے کی ہم انہیں



اجازت نہیں دے سکتے۔'' (ایضاً)

ان خیالات کے باوجود کہ ملک میں خانہ جنگی بھی منظور تھی اگر حکمرانی کا سوال پیدا ہو۔ سرسید نے کہا کہ ہم اب بھی ہندوؤں سے دوستی کے خواہش مند ہیں لیکن یہ دوستی مسلمانوں کو محکوم بنانے کے لیے استعمال نہیں کی جانی چاہیے اور ہندو اس کھیل میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ یہ بہت لطیف نکتہ ہے جو لوگ سرسید شناسی کی کوششیں کرتے رہتے ہیں انہیں سرسید کا ہندوؤں سے دوستی کا نظریہ جس کا آئے دن ہمارے دانشور آج کے نظام کو درست ثابت کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں سمجھنے میں مدد ملے گی۔ سرسید نے ہندو اور مسلمانوں سب کو بسبب ہندوستان میں رہنے کے ہندو تک لکھا ہے لیکن ان خیالات کو مضامین سے نکال کر نہیں پڑھنا چاہیے۔ ورنہ کوئی بھی شخص سرسید کو نہیں سمجھ سکتا۔ ہم سرسید کے خیالات سے اختلاف کر سکتے ہیں لیکن اپنے خیالات کو سرسید کے خیالات بتانا یا ان کے اصلی خیالات کو توڑ مروڑ کر پیش کرنا دانشورانہ منافقت ہے۔

''تاہم میرے ہندو ہم وطنوں اور بنگالی بھائیوں کو یہ بھی بخوبی سمجھنا چاہیے کہ میری حقیقی خواہش یہ ہے کہ ہندوسان کی تمام قومیں ایک دوسرے کے ساتھ امن دوستی کی زندگی بسر کریں۔ لیکن یہ دوستی اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے کہ جب تک وہ ایک دوسرے کو محکوم بنانے کی کوشش نہ کریں۔ بنگالیوں نے اور اس صوبے (شمال مغربی) کے تعلیم یافتہ ہندوؤں نے بھی یہی کھیل کھیلنا چاہا ہے اور وہ توقع رکھتے ہیں کہ مسلمان ان کے ساتھ ہو جائیں گے۔ ایں خیال است ومحال وجنوں۔''[11]

سرسید کی ہندو دوستی کی بنیاد برابری کی تھی جیسی کہ وہ انگریزوں سے رکھتے تھے یعنی ہندو مسلمانوں کو محکوم بنانے کی کوشش نہ کریں تو وہ ہمارے دوست ہیں لیکن اگر انھوں نے ایسی کوششیں کیں تو ہماری دوستی قائم نہیں رہ سکتی۔ لہٰذا کانگریس کے مطالبات جو مسلمانوں کو محکوم بنانے کی سازش تھے ان کے سامنے آتے ہی سرسید نے ان کی شدید مخالفت کی اور ہندوؤں کی مسلمانوں کو محکوم بنانے کی خواہش سے تعبیر کیا۔ سرسید کی ان کوششوں کا یہ اثر ہوا

کہ تمام مسلمان بلاتفریق عقائد وفرقہ سرسید کے حامی ہو گئے اور متحد ہو کر کانگریس کی مخالفت کی ۔لندن کے اخبار ٹائمز نے لکھا کہ:

''ہندوستان میں جن نسلوں کو قرونِ وسطیٰ سے سیاسی ظفرمندی حاصل رہی ہے وہ عیار منشیوں اور تیز قلم صحافیوں کو جنھوں نے کانگریس تخلیق کی ہے انتہائی حقارت آمیز نظروں سے دیکھتی ہیں۔''۱۲؎

سرسید کی تقریر پر بہت عمدہ ریمارک لندن کے اخبار سینٹ جیمز گزٹ نے کیا کہ جو کچھ سرسید نے کہا ہے انگریز قوم کو اس پر دھیان دینا پڑے گا کیوں کہ وہ مسلم قوم کے نمائندے ہیں جس کو نظرانداز کردینا انتہائی خطرناک ہوسکتا ہے۔

''سرسید احمد خاں نے جو کچھ کہا ہے انگریز قوم اس پر کان دھرے گی کیوں کہ ہندوستان کی ایک ایسی قوم کے وہ نمائندے ہیں جسے نظرانداز کردینا انتہائی خطرناک ثابت ہوسکتا ہے۔''۱۳؎

## طیب جی کو استعمال کیا گیا

بدرالدین طیب جی بمبئی کے ایک رئیس تھے اور وہاں کے مسلمانوں میں بوجہ اپنی عرب قومیت کے معزز سمجھے جاتے تھے کانگریس کو یہ ثابت کرنے کے لیے کہ وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی جماعت ہے۔ایک ایسے سربرآوردہ شخص کی تلاش تھی جو کہ معزز بھی ہو لہٰذا طیب جی کو شروع سے ہی کانگریس تحریک سے وابستہ رکھا گیا اور مدراس میں تیسرے اجلاس کا صدر بھی ان کو بنایا گیا۔لیکن سرسید جیسی قدآور شخصیت کی مخالفت کی وجہ سے مسلمان کانگریس میں شریک ہونے سے باز رہے اور کانگریس کے پہلے اجلاس میں صرف دو مسلمان شریک ہوئے۔دوسرے اجلاس میں ستائیس اور پھر تیسرے اجلاس میں ان کی تعداد بہتر ہوگئی۔جن کے بارے میں سرسید نے کہا کہ یہ سب کرائے کے مسلمان ہیں اور ان کو اس لیے خریدا گیا ہے تا کہ کانگریس کو مشترکہ جماعت ثابت کیا جاسکے گو کہ اس کے مقاصد مسلمانوں کے حق میں انتہائی درجہ مضر ہیں۔طیب جی سرسید کو بھی کانگریس میں شامل کرنا چاہتے تھے۔سرہیوم اپنے اس مشن میں ناکام ہوچکے تھے لہٰذا انھوں نے ایک مسلمان ہی کو سرسید کو راضی کرنے کا کام سونپا۔طیب جی نے سرسید کو لکھا کہ:



''یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ میں نے مدراس کانگریس میں کچھ حد تک نمایاں حصہ لیا تھا یہ دیکھ کر مجھے دکھ ہوا کہ آپ نے نیز سید امیر علی اور نواب عبداللطیف جیسے دوستوں نے کانگریس میں عدم شرکت کو ہی اپنا فرض سمجھا اس عدم شرکت کی وجہ کو اگرچہ میں کلی طور پر نہیں سمجھ سکا ہوں تاہم یہ بات مجھے افسوس ناک معلوم ہوئی ہے کہ ایسے معاملات جس کا تعلق پورے ہندوستان سے ہو مسلمانوں کا کوئی طبقہ ہندوؤں سے الگ رہ کر ہندوستان کی قومی ترقی میں سدِراہ ہو۔''

''آپ کا یہ اندیشہ تو میری سمجھ میں آتا ہے کہ حکومت تعلیم یافتہ دیسیوں کو جو مراعات دے گی ہندوان سے زیادہ مستفید ہوں گے لیکن وہ لوگ جو ان مراعتوں کے مستحق ہیں ان کی ترقی کی راہ روکنے سے کہیں زیادہ ہمارا فرض ہے کہ جہاں تک ہوسکے ہم خود ترقی کے میدان میں آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔اگر کوئی ایسی تجویز پیش کی گئی جس سے مسلمان ہندوؤں کے محکوم ہوسکتے ہیں یا ہندوؤں کو ایسے انتظامی اختیارات حاصل ہوسکیں جو مسلمانوں کے لیے ضرر رساں ہوسکتے ہیں تو میں خود ایڑی چوٹی کا زور لگا کر اس کی مخالفت کروں گا۔''

''لیکن کانگریس کے پیش نظر اس طرح کی کوئی تجویز نہیں ہے۔اس کا مقصد تو تمام فرقوں کو یکساں فائدہ پہنچانا ہے اور ہونا بھی یہی چاہیے جو تجویز بھی مسلمانوں کو من حیث الجماعت ناپسند ہوگی کانگریس اسے قبول نہ کرے گی۔چنانچہ کانگریس کے گزشتہ اجلاس میں اسی اصول پر میں سختی سے کاربند رہا اور ہر اس امر کو میں نے قطعیت سے مسترد کردیا جن پر ہم جماعتی طور پر معترض ہوسکتے تھے۔یہ کلیہ بھی میں وضع کرچکا ہوں کہ کوئی بھی تجویز جس پر عام مسلمان معترض ہوں کانگریس میں زیر بحث نہ آئے۔یہ اصول کانگریس کے

دستور میں بھی باضابطہ شامل کیا جائے گا اور میرا خیال ہے کہ آپ کے
خدشات جہاں تک میں انہیں سمجھ سکا ہوں اس سے دور ہو جائیں
گے۔اس کے بارے میں براہ نوازش اپنے تاثرات سے نیز اس امر
سے بھی مطلع فرمائیے کہ آپ ہر کانگریس کے یکسر خلاف ہیں خواہ اس
کی کچھ ہی شکل یا طرز ہو یا صرف اس کانگریس کے خلاف ہیں جس
سے ہمارے فرقے کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو............موخر الذکر
صورت اگر ہو تو ہم ایسے قاعدے اور ایسی بندشیں وضع کر سکتے ہیں
جن سے آپ کی دشواریوں پر قابو حاصل کیا جا سکے۔''[۱۴]

یہ کلیہ ضرور آج تک ہندوستان کی تمام جماعتوں میں چلا آتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف کوئی تحریک نہ کی جائے گی مگر ملک کا انتظام اکثریتی رائے پر منحصر ہے جس میں حالانکہ واضح طور سے کسی فرقہ کی حمایت نہیں ہو سکتی لیکن اس کا نتیجہ ایسا نکلتا ہے کمزور اور کم تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے کوئی تحفظ نہیں رہ جاتا حالانکہ مسلمانوں کے علاوہ دوسرے کمزور فرقوں جیسے ہریجن اور قبائلی طبقات کے لیے بعض جگہ چالیس فیصدی تک نوکریوں، بینک کے قرضوں، یونیورسٹیوں کے داخلہ تک میں تحفظ رکھا گیا ہے۔

## سرسید کا واضح جواب! میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں

سرسید نے طیب جی کے تمام دلائل کا جواب فرداً فرداً اپنے طویل مراسلہ میں دیا۔ مراسلہ شروع کرتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ کانگریس میں شرکت کرنے کے بعد یہ بحث بے فائدہ ہے اگر طیب جی کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا چاہتے تھے تو ان کو کانگریس میں شرکت کرنے سے پہلے ہی یہ مشورہ کرنا چاہیے تھا اور ان کے مدراس کے جلسہ کی صدارت کرنے سے ہندو تو واقعی خوش ہوئے لیکن مسلمانوں کو بہت ملال ہوا۔

''مدراس کانگریس میں آپ نے جو نمایاں حصہ لیا ہے اس سے
ہمارے ہم ریاست ہندوؤں کا دل تو ضرور باغ باغ ہوا لیکن ہم
لوگوں کو بلاشبہ اس سے حد درجہ ملال اور دکھ ہوا۔کانگریس کے بارے



میں ہمارے خیالات کے اظہار اور اس میں ہماری عدم شرکت کے
اسباب بیان کرنے کا مناسب وقت تو کانگریس میں آپ کی شرکت
سے پہلے تھا جب سب کچھ ہو چکا جسے ہونا تھا تو اب اس کا بیان
لاحاصل ہے۔''[۱۵]

سرکاری مراعتوں میں فائدہ اٹھانے والے مستحقین کی راہ روکنے کی نسبت بیان کیا کہ کوئی ایسا نہیں کرنا چاہتا اور چاہے بھی تو نہیں کر سکتا اور مقابلے کے امتحان میں شرکت کو سرسید نے ایسی دوڑ بتایا جس میں مسلمانوں کی شکست یقینی ہے۔

''ہم ہندوستان کی قومی ترقی کی راہ میں سدراہ ہونا یا مراعتوں سے
فائدہ اٹھانے کے مستحقین کی ترقی کی راہ روکنا نہیں چاہتے اور اگر ہم
ایسا کرنا بھی چاہیں تو اس میں کامیابی نہ ہوگی۔ بااین ہمہ اس دوڑ میں
ہم کسی ایسے حریف سے مقابلہ کرنا بھی اپنے لیے ضروری نہیں سمجھتے
جس میں ہمارے جیتنے کا امکان ہی نہ ہو آپ کا یہ فرمانا بجا ہے کہ
جہاں تک ہو سکے ترقی کے میدان میں خود آگے بڑھنے کی کوشش ہمارا
فرض ہے لیکن پرانے عقلمندوں کا یہ کہنا بھی ہمیں نہ بھولنا چاہیے کہ
تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود۔'' (ایضاً)

سرسید نے طیب جی سے سوال کیا کہ نیشنل کانگریس کے معنی اگر یہ سمجھے جائیں کہ ہندوستانی میں بسنے والے ایک قوم میں یا آئندہ کبھی ایک قوم بن سکتے ہیں تو یہ خیال حقیقت سے بعید ہے۔

''میں یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ نیشنل کانگریس کے معنی کیا ہیں؟ اس کا
یہ مطلب سمجھا جائے کہ مختلف ذاتوں اور ملکوں کے لوگ جو یہاں
بستے ہیں ایک قوم میں یا ایک قوم بن سکتے ہیں اور ان کے مقاصد اور
جذبات میں یکسانیت ہے؟ میرے نزدیک یہ ممکن ہی نہیں ہے
اور جب یہ ناممکن ہے تو پھر نہ تو نیشنل کانگریس قسم کی کوئی چیز ہی ہو سکتی
ہے اور نہ اس سے سب کو یکساں فائدہ ہی پہنچ سکتا ہے۔'' (ایضاً)

سرسید نے واضح طور سے لکھا کہ میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں اور جو جماعت بھی اس غلط تصور کے تحت قائم کی جائے کہ ہندوستان میں ایک قوم رہتی ہے میں اس کے خلاف ہوں اور اسے نہ صرف مسلمانوں کے لیے بلکہ پورے ملک کے لیے نقصان دہ سمجھتا ہوں۔

> ''کانگریس جسے یہ غلط نام دیا گیا ہے اس کے کاموں کو ہندوستان کے حق میں آپ سودمند سمجھتے ہیں لیکن میں صرف اپنے ہی فرقے کے لیے نہیں پورے ہندوستان کے حق میں مضر سمجھتا ہوں۔ میں ہر کانگریس کے خلاف ہوں اس کی شکل وصورت خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو جو غلط تصورات پر مبنی ہو...... یعنی جو پورے ہندوستان کو ایک قوم (نشین) سمجھیت ہو۔ میرے خیالات کو شاید آپ پسند نہ کریں گے اس لیے اتنا کچھ لکھنے کے لیے معذرت خواہ ہوں۔'' (ایضاً)

### دوسرا خط

ان تمام واضح تصورات کے باوجود اور لکھنؤ، میرٹھ کی تقاریر پڑھنے کے باوجود بھی کہ ان تقاریر میں سرسید نے تفصیل سے کانگریس کے مطالبت کو مسلمانوں اور پورے ملک کے لیے نقصان دہ ہونا ثابت کیا تھا، طیب جی کے خیالات نہ بدلے اور انھوں نے سرسید کے اس خط کا جواب دیتے ہوئے تسلیم کیا کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے تمام ہندوستان کے ہندو من حیث الجماعت کانگریس میں شامل ہیں اور سرسید کا لکھنؤ لیکچر میں یہ کہنا کہ بہت سے ہندو بھی اس کے خلاف ہیں، غلط ہے۔

> ''اس تقریر کے وقت آپ کا خیال تھا کہ کانگریس صرف بنگالی بابوؤں ہی پر مشتمل ہے۔ یہ بات کیوں کر آپ کے ذہن میں آئی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔ کیونکہ کانگریس کے بارے میں مدراس اور بمبئی پریسیڈنسیوں کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کے جو خیالات ہیں ان کا آپ کو علم نہ بھی رہا ہو تو آپ نے یہ کیوں کر سوچ لیا کہ ان پریسیڈنسیوں کے ہندوؤں نے کانگریس میں سرگرم حصہ نہیں لیا ہے؟ بہر حال جو بھی صورت رہی ہو حقائق یہ ہیں کہ جہاں تک ہندوؤں کا تعلق ہے خواہ کسی



> صوبے کے بھی ہوں من حیث الجماعت کانگریس کے حامی ہیں۔''

طیب جی نے یہ مسلمانوں کا فرض بتایا کہ وہ ان اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کریں جو کانگریس سے ان کو ہے۔ یہ عجیب خیال ہے اگر وہ یہ بات ہندوؤں سے کہتے کہ وہ مسلمانوں پر یہ ثابت کریں کہ کانگریس کے مطالبات ان کے لیے نقصان دہ نہیں ہیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے جن کو ان مطالبات سے نقصان پہنچ رہا ہے۔ انہیں کا یہ فرض کیسے ہو گیا کہ وہ ان اختلافات کو دور کریں۔ یہ فرض تو کانگریس کا تھا کہ وہ ان مطالبات کو ترک کر دیتی جن کو سرسید نے مسلمانوں اور ملک کے حق میں مضر بتایا تھا۔ آگے بہت پتہ کی بات طیب جی نے کہی کہ اندر رہ کر کام کرنا چاہیے سو الحمدللہ کہ مسلمان آج تک اندر رہ کر ہی کام کر رہا ہے۔ اور اس کا نتیجہ بھی ظاہر ہے۔

> ''دریں صورت کیا صاحب فکر مسلمانوں کا یہ فرض نہیں ہے کہ ان اسباب کو دور کرنے کی کوشش کریں جن سے یہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں ہم جس طرح تعلیم کی ترقی کو نہیں روک سکتے اسی طرح کانگریس کو بھی بڑھنے سے نہیں روک سکتے۔ لیکن کانگریس جو پالیسیاں اختیار کرے گی ان میں ہم اپنے قوی اور مستحکم عمل سے تبدیلیاں لا سکتے ہیں۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ مسلمان متحد ہو کر کانگریس کے مباحث کو انہی معاملات تک محدود کر سکتے ہیں، جنھیں وہ اپنے حق میں مناسب یا بے ضرر سمجھیں، مثال کے لیے لیجسلیٹو کونسل کو ہی لیجیے۔ مسلمان اگر انتخاب کے اصول کو ناپسند کریں تو اس میں تبدیلیاں لا کر اپنے مفاد کے مطابق اسے ڈھال سکتے ہیں۔ اس لیے میری پالیسی یہ ہے کہ باہر رہ کر نہیں بلکہ اندر رہ کر کام لیا جائے۔''[٦١]

ایسا لگتا ہے کہ طیب جی نے کانگریس کے مطالبات پر غور نہیں کیا تھا اور وہ ان مطالبات کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ نہیں سمجھتے تھے۔ لہٰذا مسلمانوں کو خوشی خوشی اطلاع دیتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ کانگریس نے میرے اس کلیہ کو تسلیم کر لیا ہے کہ وہ وہ مطالبہ جسے مسلمان ڈیلیگیٹ متفق طور سے نامنظور کریں کانگریس اس کو ترک کر دے گی۔

''کانگریس کی جملہ بارہ اسٹینڈنگ کمیٹیوں نے میرے وضع کردہ اس کلیے کو تسلیم کرلیا ہے کہ ہر وہ تجویز جس کی مسلمان ڈیلیگیٹ متفقہ طور پر یا تقریباً متفقہ طور پر مخالفت کریں اسے کانگریس میں زیر بحث آنے سے قطعاً خارج کر دیا جائے۔''

درحقیقت اس وقت تک کانگریس جن مطالبات کو پیش کر چکی تھی ان میں کسی اور اضافہ کی گنجائش بھی نہ تھی اور ان کا مان لیا جانا ہی مسلمانوں کے لیے تباہی کا باعث ہوتا، لہٰذا ان مطالبات کو منواتے ہوئے اگر یہ کلیہ بنا بھی لیا جائے کہ مسلمان متفقہ طور سے جس تجویز کی مخالفت کریں گے اس کو نامنظور کر دیا جائے گا ایک غیر موثر فعل تھا لہٰذا طیب جی کے اس اصول کو کانگریس نے خوشی خوشی تسلیم کرلیا۔ سرسید نے اس کلیہ کو مسترد کرتے ہوئے جوابی مراسلہ میں لکھا:

''اور سب باتوں سے قطع نظر مسلمانوں کے لیے یہ قطعاً مناسب نہیں ہے کہ وہ کسی ایسی کانگریس میں شریک ہوں...... جس میں عام آدمیوں کے مجمع میں حکومت پر یہ الزام لگایا جاتا ہو کہ وہ اپنی رعایا کو ان کے حقوق سے محروم رکھ رہی ہے اس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ جاہل اور کم عقل لوگ یہ سمجھنے لگیں گے کہ حکومت ظالم یا کم از کم غیر منصف ہے اس سے مسلمانوں کو ہندوؤں اور بنگالیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔''

غدر کے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے خیال ظاہر کیا کہ مسلمان اب اگر پھر کانگریس کے اَجیٹیشن میں شامل ہو کر اپنے جوشیلے پن کی وجہ سے تشدد پر آمادہ ہو گئے تو سارا الزام پھر انہیں پر آئے گا جس طرح کہ غدر میں ہندوؤں نے اپنے تئیں انگریزوں کا وفادار ہونا ثابت کر کے تمام الزام مسلمانوں پر لگایا اور نتیجتاً مسلمان برباد ہو گئے۔

''غدر میں کیا ہوا؟ ہندوؤں نے شروع کیا، مسلمان من چلے تھے بیچ میں کود پڑے ہندو تو گنگا نہا کر جیسے تھے ویسے ہی ہو گئے مگر مسلمانوں کے تمام خاندان تباہ و برباد ہو گئے۔''



کانگریس کے اَجیٹیشن کی سخت مخالفت کرتے ہوئے فرمایا کہ:

''امریکہ میں اول اول اسی قسم کا اَجیٹیشن شروع ہوا تھا اور آخیر کو یہاں تک نوبت پہنچی کہ آخری لفظ جوان کے منہ سے نکلا وہ یہ تھا ''نوٹیکیشن ودآؤٹ ریپریزنٹیشن۔'' پس جن لوگوں میں اس لفظ کے کہنے اور اس پر عمل کرنے کی طاقت ہو وہ کانگریس اور پولیٹیکل اَجیٹیشن میں شریک ہوں ورنہ بغیر طاقت اس میں شریک ہونا ہجڑوں کی طرح تالی بجانا ہے۔ بنگالی اور غیر معروف مسلمان جو مدراس کانگریس میں شریک ہوئے تھے ہوسکتا ہے کہ ان میں یہ طاقت ہو اور ان کے لیے یہ رحمت ہو لیکن ہمارے لیے یہ لعنت ثابت ہوگی۔''[۱۷]

○

**حواشی:**

(۱) پانیر،۱۰/نومبر۱۸۸۷ء (۲) پانیر،نومبر۱۸۸۷ء

(۳) پانیر،۱۷/نومبر۱۸۸۷ء

(۴) پانیر،۱۷/نومبر۱۸۸۸ء، بحوالہ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ

(۵) پانیر،۲/فروری۱۸۸۸ء (۶) بحوالہ پانیر،۲/فروری۱۸۸۸ء

(۷) پانیر،۲/فروری۱۸۸۸ء (۸) ہندو ہسٹریاٹ ۲۳/جنوری۱۸۸۸ء

(۹) دی بنگال،۱۴/فروری۱۸۸۸ء

(۱۰) پانیر،۸/فروری۱۸۸۸ء، بحوالہ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ

(۱۱) پانیر،۸/فروری۱۸۸۸ء، بحوالہ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، ص:۲۶۷

(۱۲) بحوالہ پانیر،۲۳/جنوری۱۸۸۸ء (۱۳) بحوالہ پانیر،۲۳/جنوری۱۸۸۸ء

(۱۴) بحوالہ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، ص:۲۵۹

(۱۵) بحوالہ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، ص:۲۶۰

(۱۶) پانیر،۲/اپریل۱۸۸۸ء (۱۷) پانیر،۱۵/اپریل۱۸۸۸ء

# محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن

ہندوستانی مسلمانوں کی سب سے پہلی سیاسی جماعت دسمبر ۱۸۹۳ء کے آخری ہفتہ میں سرسید کے گھر میں اور انھیں کی زیرِصدارت قائم ہوئی۔ یہ ہندوستان میں پارلیامنٹری ڈیموکریسی میں مسلمانوں کے حصہ لینے کی ابتداء تھی اور مسلمانوں میں ماڈرن سیاسی جماعتوں کی تشکیل کا آغاز تھا۔ بہرحال یہ کریڈٹ بھی سرسید ہی کو جاتا ہے کہ انھوں نے اپنی فہم اور دوراندیشی سے ہندی مسلمانوں کو ایک ایسا سبق دیا جو آنے والی صدیوں تک جاری رہے گا۔

انڈین پیٹریاٹک ایسوسی ایشن حالانکہ ان کی پہلی سیاسی جماعت قرار دی جاسکتی ہے لیکن یہ خالص مسلمانوں کی جماعت نہ تھی اس میں ہندوؤں کو بھی شامل ہونے کی دعوت دی گئی تھی اور کچھ اودھ کے علاقے کے راجہ، نوابین شامل تھے۔ سرسید اپنی شرافت اور نیک دلی کی بدولت ہمیشہ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثل بھائیوں کے محبت و دوستی دیکھنے کے خواہش مند تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے پیٹریاٹک ایسوسی ایشن میں سب قوموں کو دعوت دی تاکہ کانگریس ان مطالبات میں کچھ تبدیلی کرلے جو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ تھے۔ لیکن سرسید ان دونوں ہی مقاصد میں ناکام رہے اور غالباً اسی ناکامی نے سرسید کو خالص مسلمانوں کی جماعت قائم کرنے کی طرف متوجہ کردیا۔ پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کے قیام کے چند ہی ماہ بعد مہاراجہ بنارس اور راجہ شیو پرشاد وغیرہ سرسید کا ساتھ چھوڑ گئے۔

انگلستان کے مشہور اخبار مورننگ پوسٹ نے ہندوؤں کی اس روش کے سلسلہ میں لکھا کہ:

> ''سرسید احمد خاں نے کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس دغا کے بعد (جو شیو پرشاد وغیرہ نے ان کے ساتھ کی ہے) آئندہ کسی اور نے مسلمانوں کے علاوہ ان کے ساتھ تعاون کرنے کی پیش کش کی ہو اور اسے قبول کرنے میں انھیں تامل ہوا تو ہمیں حیرت نہ ہوگی۔''[1]



سرسید کو جو تجربہ اپنی پہلی ہی سیاسی انجمن میں ہندوؤں کا ساتھ چھوڑنے سے حاصل ہوا اس نے سرسید کا ذہن بدل دیا اور اس طرح خالص مسلمانوں کی جماعت محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن وجود میں آئی اس کی خبر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بہت واضح انداز میں ایک تحریک کی شروعات کے طور پر چھاپی گئی۔

## ایک جدید تحریک: محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن

''۳۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء روز شنبہ کو بوقت سہ پہر کے ذی رعب مسلمان شرفاء کا ایک جلسہ سرسید احمد خاں کے مکان پر مسلمانوں کی پولیٹیکل حالت کی نسبت بحث کرنے کے واسطے منعقد ہوا۔ اور یہ تجویز قرار پائی کہ ایک ایسوسی ایشن مذکورہ بالا نام سے قائم کی جاوے منجملہ ان صاحبوں کے جو اس جلسہ میں شریک تھے سرسید احمد نواب محسن الملک، مسٹر سید محمود، خان بہادر برکت علی خاں، خاں بہادر شیخ علی بخش خاں، مولوی فریدالدین خاں، مولوی زین العابدین، شمس العلماء مولوی ذکاء اللہ، حاجی محمد اسمٰعیل خاں، مسٹر بیک وغیرہم شریک ہوئے۔''[1]

اس جلسے میں اس زمانے کے تمام مسلم دانشور جو سرسید کی سحر خیز شخصیت کے طفیل علی گڑھ میں جمع ہوگئے تھے جن کی تربیت خاص سرسید کی نگرانی میں ہوئی اور جو آگے چل کر علی گڑھ تحریک اور مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے اہم ستون بنے جس میں خاص طور پر محسن الملک کو جانشین سرسید کا خطاب قوم نے عطا کیا، سب شریک تھے۔ ایک طرح سے یہ جلسہ ہندوستانی مسلمانوں کی بہترین نمائندگی کررہا تھا۔ اس جلسہ میں مسلمانوں کے علاوہ مسٹر بیک (جو اس وقت محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے پرنسپل تھے) بھی شریک ہوئے۔ وہ بوجہ اپنی خدمات کے جو انھوں نے ملت اسلامیہ کی علی گڑھ کالج کو پروان چڑھا کر کیں مسلمانوں میں بہت مقبول تھے۔ مسلمانوں کے اس نمائندہ جلسے میں یہ سوال حاضرین کے سامنے درپیش تھا کہ مسلمانوں کو پولیٹیکل معاملات میں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ خود سرسید جس جلسہ کی صدارت کررہے ہوں اور علی گڑھ کالج سے متعلق تمام ہی حضرات مع پرنسپل اس میں شریک ہوں اور جو میٹنگ خاص سرسید کے مکان پر منعقد ہوئی اس کے بارے میں دانشور اکثر خاموشی اختیار کرتے ہیں۔ حاضرین کے سامنے یہ سوال پیش کیا گیا:

''جو سوال میں آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ
پولیٹیکل معاملات میں مسلمانوں کو کیا طریقہ کار اختیار کرنا چاہیے۔''۲؎

یہ سوال آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ سرسید کے زمانے میں تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ اہم تر، آج کی صورت حال زیادہ مشکل اور سنگین ہے۔ ہمارے دانشوران اور اساتذہ اس اہم موضوع پر گفتگو نہیں کرنا چاہتے کہ سیاست جیسی گندی چیز کا ذکر ہم کیسے کریں۔ حالانکہ یہی سیاست جب حکمراں وزرا اور گورنروں کی قربت کا سبب بنتی ہے تو اس سے زیادہ مباح اور خیر و برکت والی کوئی چیز نہیں رہ جاتی اور ان کی راہوں میں پھول بچھانے کا کام وہی طبقہ کرتا ہے جس کے سامنے مسلمانوں کے پولیٹیکل مسائل کا ذکر ایک نادانی اور فرقہ پرستی کی بات ہے۔

مسلمانوں کا نقطۂ نظر انگریز حکمراں اور برطانوی عوام کے سامنے پیش کرنے کی غرض سے محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے قواعد مرتب کرنے کے لیے ایک کمیٹی مقرر کی گئی۔ جس میں پنجاب کی ذی وجاہت حضرات کے علاوہ خود سرسید، سید محمود اور مسٹر بیک اور نواب اسماعیل وغیرہ کو شامل کیا گیا۔ سرسید نے ان دونوں تجویزوں کی تحریک کی اور نواب محسن الملک نے انکی تائید کی۔

رزولوشن:۱- یہ امر۳ پسندیدہ ہے کہ ایک ایسوسی ایشن محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا کے نام سے قائم کی جاوے۔ سرسید احمد نے اس کی تحریک کی اور نواب محسن الملک نے اس کی تائید کی۔

رزولوشن:۲- یہ صاحبان مندرجہ ذیل ایسوسی ایشن کے قواعد مرتب کرنے کی غرض سے بطور کمیٹی کے مقرر کیے جاویں پنجاب سے خان بہادر برکت علی خاں، خواجہ یوسف شاہ مسٹر محمد شاہ دین، نیاز محمد خاں (وغیرہ) اضلاع شمال مغرب واودھ سے سرسید احمد نواب محسن الملک، محمد میر، مسٹر بیک، سید محمود اور آنریبل اسماعیل خاں۔''

نواب محسن الملک نے اس جلسہ میں یہ نظم سرسید سے مخاطب ہو کر پڑھی:

المدد المدد اے سید — قوم گمراہ کے رہبر سید
مجھ سے کیا پوچھتے ہو میرا حال — کب ہے معلوم مجھے اپنا حال



جو دوا چاہو پلاؤ مجھ کو — تا کسی طرح مرض اچھا ہو
تم طبیب دل بیماراں ہو — جو مناسب ہو وہی کر گزرو

طبیب دل بیماراں حقیقتاً ہمارے حال کو جانتا تھا جس کو کہ ہم آج بھی ہزاروں فسادات اور ہر طرح کے استحصال کے باوجود نہیں جانتے اور دوا بھی اس نے وہ تجویز کی جو آج تک شافی و کافی ہے کہ قومی ہمدردی اور بہی خواہی میں اپنی زندگی بسر کرو اور جو کوئی بھی ملت کے مفاد پر ضرب لگانے کی کوشش کرے۔ اس کے آگے لوہے کی دیوار بن جاؤ اور ہر طرح مقابلہ کرو، ہجرت کو موقوف کرو اور قومی ہمدردی کو پسند کرو علم سے محبت کرو، جہالت سے نفرت کرو، علم کو پھیلاؤ اور لاعلمی کے اندھیرے کو دور کرو سب سے محبت کرو اور نفرت سے دور بھاگو اپنی مال دولت سب کچھ قوم کی راہ میں خرچ کرو حتیٰ کہ جب مرد تو کفن تک کے پیسے گھر میں نہ ہوں کہ اس کا چندہ بھی محسن الملک نے اپنی جیب خاص سے عنایت کیا۔

ایک بہت دلچسپ مضمون سرسید کا یاد آرہا ہے۔ انھوں نے حکایت بیان کرتے ہوئے بڑے ظریفانہ انداز میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی کی حکایت میں ایک حکایت ہے کہ ایک مسافر بیٹھا ہوا زار و قطار رو رہا تھا ایک شخص جب اس کے پاس سے گزرنے لگا تو اس نے پوچھا کہ کیوں روتے ہو اس نے کہا کہ میرا یہ عزیز تھا جو کہ مر رہا ہے میرا بڑا دوست اور غمگسار تھا آج مر رہا ہے اس لیے میں روتا ہوں۔ اس شخص نے پوچھا کہ کیوں مر رہا ہے؟ مسافر نے کہا کہ بھوک سے مر رہا ہے۔ اس نے کئی دن سے کچھ نہیں کھایا وہ شخص بڑا حیران ہوا کیونکہ مسافر خاصا صحت مند اور امیر معلوم ہوتا تھا اور دیکھنے پر پتہ چلا کہ اس کے پاس بہت سا کھانا اور پھل وغیرہ بھی تھے تو اس شخص نے پوچھا کہ اتنا کھانا ہوتے ہوئے تم اس کو کیوں نہیں دیتے اسی لیے یہ مر رہا ہے تو مسافر بہت خفا ہو کر کہنے لگا کہ میاں یہ میرے لیے ہے۔ میں اسے کیوں دوں سرسید نے لکھا کہ ہماری قوم کے امیروں اور رئیسوں میں سب کا حال ایسا نہیں ہے مگر زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ قوم کے زوال پر روتے بھی ہیں مگر پیسہ صرف اپنے لیے ہے۔

آج ہماری قوم کا حال اس سے بھی زیادہ گیا گزرا ہے۔ آنسو بہانے والوں کی کمی نہیں ہے حتیٰ کہ میرٹھ اور ملیانہ قتل عام کے بعد بہت سے مسلم وزرا اور کانگریسی مسلمانوں کو بھی آج جگہ جگہ مسلمانوں کے غم میں آنسو بہاتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ حکایت شیخ سعدی کے مسافر کی طرح۔

## بیک کی تقریر

محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے افتتاحی جلسہ کے شرکاء میں بیک واحد انگریز اور غیر مسلم تھے۔ بیک کی ملت اسلامیہ کے لیے خدمات شہرۂ آفاق ہیں۔ یکم فروری ۱۸۸۴ء کو بیک نے بحیثیت پرنسپل محمڈن کالج کے باگ ڈور سنبھالی تھی۔ خاص کانگریسی ذہنیت کے پروردہ مسلمان بنگالی کانگریسیوں کے اس بے بنیاد الزام کو دہراتے ہیں کہ سرسید کے سیاسی خیالات بیک کے رہین منت تھے اور بیک جو چاہتے تھے سرسید وہی کہتے تھے چنانچہ مولانا طفیل احمد منگلوری نے اپنی تصنیف ''مسلمانوں کا روشن مستقبل'' میں یہی تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ سرسید کی سیاست کو بیک کنٹرول کرتے تھے۔ ہم اس وقت اس بات کا ذکر نہیں کریں گے کہ کانگریس کی سیاست کو تو براہ راست مسٹر ہیوم اور ان کے دوست چلاتے تھے۔ ہم صرف ایک ثبوت سرسید کے قومی خیالات کے سلسلہ میں دینا چاہیں گے کہ ان کا ہندوستان میں بسنے والی قوموں کو جدا جدا سمجھنا اور بہت سی تحریروں کے علاوہ ان کی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر تقریر سے ثابت ہوتا ہے جو انھوں نے ۱۸۸۲ء میں وائسرائے کی کونسل میں کی تھی اس وقت تک نہ کانگریس بنی تھی اور نہ بیک ہی ہندوستان آئے تھے بلکہ اس وقت وہ آکسفورڈ یونیورسٹی میں محض ایک طالب علم تھے اور کانگریس بنانے کا خیال تک ہیوم اور بنگالیوں کے ذہن میں نہ آیا تھا۔ لہٰذا یہ کہنا کہ سرسید کے سیاسی نظریات بیک کے اثرات کی وجہ سے بنے محض ایک تاریخی دروغ ہے۔ جس کا مقصد سرسید کی شخصیت کو مسخ کرنا ہے ورنہ کہنے والے بھی ہمارا خیال ہے کہ حقائق سے واقف ہیں۔

بیک، زندگی کی آخری سانس تک کالج کی ترقی اور طلباء کی بہبودی میں لگے رہے۔ مرنے سے چند دن قبل بستر علالت پر جو آخری تحریر ان کے قلم سے نکلی تھی وہ کالج کے لیے سرسید میموریل فنڈ کی اپیل تھی۔ ابھی یہ تحریر مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ پروانۂ اجل آ پہنچا۔ بیک کی اس آخری تحریر کے بارے میں محسن الملک نے یوں اظہار کیا:

> ''ہم بعینہ اس کا ترجمہ چھاپتے ہیں اور آٹھ آٹھ آنسو روتے ہیں اور اپنی قوم کی بدنصیبی پر افسوس کرتے ہیں کہ ایسا ہمدرد اور غمخوار دوست



> ہمارا دنیا سے اٹھ گیا جس نے مرتے دم تک کالج کا ہی خیال رکھا اور ہماری قوم کی ترقی کی تدبیریں سوچتا رہا۔''

مولانا حالی بیک کی طلباء سے محبت اور شفقت کا نقشہ کھینچتے ہوئے فرماتے ہیں:

نہ دیکھی ہوں جنھوں نے شفقت و طاعت کی تصویریں
وہ بیک اور اس کے شاگردوں کو باہم ہم سخن دیکھیں

بیک کی کالج کے لیے خدمات حالی کی نظر میں سرسید کی طرح ہیں۔ حالی، بیک اور ان کی بیگم کی کالج کے لیے خدمات کا اعتراف کرتے ہیں۔

گو کہ یاں تعلیم کا بویا تھا سرسید نے بیج
پر پھلا پھولا تمہاری سعی سے اس کا چمن
نیک دل بانو بھی کالج کی مربی تھی یوں ہی
جس طرح شوہر کے دل کو تھی اس کی لگن

محسن الملک اور مولانا حالی جب اس قدر بیک کے مداح ہیں تو اب کسی اور کے گمراہ خیالات کو نظر میں لانا ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔

ذکر بیک کی تقریر کا ہو رہا تھا بیک نے نہایت مدلل اور عمدہ تقریر محمڈن ایسوسی ایشن کے جلسہ میں کی، ان کی تقریر کا بنیادی خیال یہ تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے جائز حقوق کا خیال رکھتے ہوئے اپنی ترقی کے راستے تلاش کرنا چاہئیں۔

> ''ہندوستان کی دوسری قوموں کے لحاظ سے اس بات کو ناپسند کرتا ہوں کہ مسلمان کوئی ایسا طریقہ اختیار کریں جس سے ہندوؤں کے حق میں ناواجب برتاؤ ہو یا ان کے جائز حقوق میں کوئی دست اندازی ہو بلکہ مسلمانوں کا مقدم فرض یہ ہے کہ وہ خاص اپنی قوم کی امن اور ترقی کی خبرگیری کریں۔''[۴]

بیک کا خیال تھا کہ کانگریس کی تحریک ہندوؤں کو اقتدار منتقل کرنے کے واسطے جاری ہے اور مسلمان کسی بھی طرح ان مقاصد سے متفق نہیں ہو سکتے۔

> ''میں ہندوستان کی موجودہ پولیٹیکل حالت پر نظر ڈالنا چاہتا ہوں چند

سال سے دو اگیٹیشن تمام ملک میں زور و شور پر ہیں یعنی نیشنل کانگریس اور گاؤکشی کی تحریک......نیشنل کانگریس کے مقاصد یہ ہیں کہ پولیٹیکل حکومت گورنمنٹ انگرزی سے ہندو رعایا کے بعض فرقوں کو منتقل کردی جائے جہاں تک ممکن ہو انتظام ملک میں انگریزوں کے بجائے ہندو مقرر کیے جائیں......ان مقاصد کے ساتھ مسلمان کسی بھی طرح ہمدردی نہیں کرسکتے......گاؤکشی کی تحریک کے یہ نتائج پیدا ہوتے ہیں کہ بمبئی اور اعظم گڑھ اور دسرے مقامات میں خونریز بلوے ظہور میں آئے ہیں۔''۵؎

بیک نے چار تجویزیں مسلمانوں کو سیاست میں عمل پیرا ہونے کی رکھیں پہلی یہ کہ مسلمان ہندوؤں کے اگیٹیشن میں شامل ہوجائیں۔ دوسری یہ کہ ان کے خلاف کوئی اگیٹیشن چلائیں۔ تیسری یہ کہ کچھ نہ کریں اور اپنی کوششیں صرف تعلیم کی حد تک محدود رہنے دیں اور چوتھی صورت یہ کہ سیاسی معاملات میں نہ بالکل خاموش رہیں اور نہ کوئی اگیٹیشن چلائیں کہ دونوں صورتوں میں مسلمانوں کا نقصان ہے۔

''امر اول کی نسبت بہت کم کہنے کی ضرورت ہے کہ مسلمانوں نے اس کو نامنظور کیا ہے اور اس کی نامنظوری کی وجوہات ان شخصوں پر بھی جو پولیٹیکل معاملات میں ادنیٰ ترین سمجھ رکھتے ہیں صریح ظاہر ہوگی۔ مسلمانوں کی تعداد اس قدر قلیل ہے جو نسبت ایک کو چار کے ساتھ ہے......پس ایسی صورت میں مسلمانوں کو ان تجاویز کی تائید کرنا جن سے خاص ان کی بربادی مراد ہے......ایک عہدہ کی خاطر جو اتفاقاً ان کو کہیں مل جائے اور صدہا عہدوں کا یقینی نقصان گوارا کرنا ہے جو سلطنت کی عنایت اور مہربانی سے ان کے رقیبوں کو ملیں۔ان مصیبتوں کا اپنے اوپر لانا پولیٹیکل معاملات کے لحاظ سے پاگل پن ہوگا۔''

دوسرے طریقہ کو بیک نے یہ کہہ کر مسترد کردیا کہ اس طرح مسلمان تعلیمی میدان سے ہٹ جائیں گے اور ان کی کوشش کو تعلیم سے ہٹا کر سیاست کی طرف پھیرنا ایک بڑی غلطی



ہوگی۔ دوسری وجہ اس کے قبول نہ کرنے کی یہ ہے کہ پولیٹیکل اگیٹیشن خونریزی میں تبدیل کرسکتا ہے۔جس کا پھر نقصان مسلمانوں کو ہوگا۔

''یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس حالت میں پچھلے پچاس برس کے اندر ہندوؤں کے ان فرقوں نے جو اگیٹیشن کرتے ہیں بلحاظ دولت اور سوشل رتبہ کے نہایت فائدہ اٹھایا ہے تو مسلمانوں کے تعصب اور ناواقفیت کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ ان کو اسی کے مطابق بہ لحاظ منصب و عزت کے نقصان رہا ہے۔''

تیسرا طریقہ یعنی مسلمان کچھ نہ کریں بلکہ دوسری قوموں کے اگیٹیشن کو جاری رہنے دیں۔اس بنیاد پر رد کیا گیا کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے جب ملک میں اس قدر شوروغوغا ہے۔ مسلمان بحیثیت ایک پرجوش قوم کے اس میں ضرور شریک ہوں گے اور مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ جو مضامین اور اخبارات پڑھتا ہے۔اس کو کس طرح اپنی رائے کا اظہار کرنے سے روکا جاسکتا ہے؟ لہٰذا خاموش رہنا اور کچھ نہ کرنا بھی غلط ہے۔

''میں اس کو سب سے پہلے اس وجہ سے ناپسند کرتا ہوں کہ میرے نزدیک اس کا عمل درآمد ناممکن ہے جس ملک میں کہ اخبارات صدہا پولیٹیکل آرٹیکل لکھ رہے ہیں تو ممکن ہے کہ ہمارے مسلم تعلیم یافتہ نوجوان ان تجاویز کی تائید یا مخالفت کے واسطے جو تجویز کی گئی ہیں پھنس جاویں۔ وہ خاموش رہے اور اس پولیٹیکل جوش میں کسی توجہ کے ظاہر کرنے سے باز نہیں رہیں گے۔میں خیال کرتا ہوں کہ ان کو بغیر رہنمائی کے چھوڑنا غلطی ہے۔دوسری دلیل خاموشی کی اس پالیسی کے برخلاف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے مخالفین کی مستعدی سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے اور اس کی علامتیں اس قدر صاف ظاہر ہیں کہ ان کی جانب سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔سب سے پہلے یہ بات ہے کہ میونسپلٹیوں اور لیجسلیٹو کونسلوں میں الیکشن کا قاعدہ بغیر اس کے کہ مسلمانوں کے ریپریزنٹیشن کے واسطے کوئی خاص انتظام کیا جاوے

جاری کر دیا گیا ہے............مجھ کو کچھ شبہ ہے کہ اس کی وجہ مسلمانوں کی وہ خاموشی ہے جو انھوں نے پولیٹیکل معاملات میں ظاہر کی ہے۔‘‘ ۶

بیک نے حکومت کے جاری کردہ الیکشن کے طریقہ پر تنقید کی کہ اس طریقہ سے مسلمانوں کے خیالات ایوان حکومت تک نہیں پہنچ جائیں گے اور اگر کچھ مسلمان وہاں پہنچ بھی گئے تو وہ خودغرضی اور ناواقفیت کی بنا پر ہندوؤں کے خیالات کا اظہار کریں گے (جیسا کہ آج کل ہو رہا ہے)

’’اس ملک میں لیجسلیٹو کونسل کے واسطے ڈبل الیکشن اور وائسرائے کی کونسل کے واسطے ٹریبل الیکشن کے ہونے سے مسلمانوں اور ہر ایک دوسری اقلیت کا ریپریزنٹیشن بالکل معدوم ہو جائے گا۔ بلاشبہ ایسے مسلمان جائیں گے جو ناواقفیت اور خودغرضی کے سبب ہندوؤں کے مطالب کا ریپریزنٹیٹو ہونا قبول کریں گے۔‘‘ ۷

بیک کا خیال تھا کہ مسلمان اور ہندوؤں کی تعداد مساوی منتخب ہونی چاہیے اور یہ کہ مسلمان ممبر کو مسلمان منتخب کریں۔

’’مسلمانوں کے اصلی ریپریزنٹیشن کے واسطے اصلی ووٹ دینے والے مسلمان ہونے چاہئیں اور ان کو مسلمان الیکٹ کرنے چاہئیں۔ کوئی طریقہ با آسانی ایجاد ہو سکتا ہے...... چنانچہ میں صرف ایک طریقہ کو بیان کرنا چاہتا ہوں یعنی جو مصالحت کی کمیٹیاں گورنمنٹ نے اعظم گڑھ اور بمبئی کے بلووں کے بعد مقرر کی تھیں جن میں ہندو اور مسلمان ممبروں کی تعداد مساوی تھی وہ گویا صاف تسلیم کرنا اس اصول کا تھا کہ مخالف قوموں کے درمیان ووٹوں کی برابری کا قائم ہونا ضروری ہے۔‘‘ ۸

بیک سمجھتے تھے کہ سیاسی معاملات میں مسلمانوں کی خاموشی کی وجہ سے پنجاب اور بنگال میں نوکریوں کے لیے مقابلے کا امتحان جاری ہو گیا اور اسی طرح سول سروس میں مقابلے کا امتحان جاری ہونے کا امکان ہے جس سے مسلمانوں کو شدید نقصان پہنچے گا لہٰذا



سیاسی معاملات میں خاموش رہنا مسلمانوں کے لیے مضر ہے۔

’’اور مثالیں اس قسم کی دی جا سکتی ہیں جن سے یہ بات ظاہر ہوگی کہ مسلمانوں کی پولیٹیکل معاملات میں خاموشی سے کسی قدر نقصان پہنچتا ہے۔ مثلاً ملازمت ماتحت (Subordinate services) کے واسطے بنگالہ اور پنجاب میں امتحان مقابلہ جاری کرنے سے ان کو نقصان پہنچا ہے اور جو رزولوشن ہاؤس آف کامنز میں سول سروس کے امتحان مقابلہ کی نسبت جاری کیا ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے حق میں اس بات کی خبر کرنا نہایت ضروری ہے کہ جو فرقہ انگلستان میں ہندوستان کے معاملات کی جانب دلچسپی رکھتا ہے وہ ان کے مطالب کی تائید کرے۔‘‘ ۹

ان تمام دلائل کے پیش نظر بیک نے آخری تجویز کو پسند کیا کہ مسلمان ایسا طریقۂ کار اختیار کریں کہ انگلستان کی عوام اور حکومت ہند کو ان کے مطالبات کا علم ہوتا رہے۔ اس مقصد کے لیے ایک ایسوسی ایشن قائم کی جائے جو ایجیٹیشن کے راستے کو نہ اپنائے۔

’’میری یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کے سرگروہوں اور دانشمند اور بارعب شخصوں کو انگلستان کی پبلک اور حکومت ہند کے روبرو اپنے مطالب کو ظاہر کرنے کی غرض سے ایک ایسوسی ایشن بالاتفاق قائم کرنی چاہیے۔‘‘

○

**حواشی:**

(۱) گزٹ، ۳۰/جنوری، ۱۸۹۴ء، ص:۱۰۹ — (۲) ایضاً

(۳) ایضاً — (۴) ایضاً، ص:۱۰۴

(۵) ایضاً — (۶) ایضاً

(۷) ایضاً — (۸) ایضاً

(۹) ایضاً

# جداگانہ انتخاب

سرسید کو یقین ہوگیا تھا کہ ہندوستان میں مختلف اقوام بستی ہیں جن کے مفاد جدا جدا ہیں اور ہندوستان ایک ملک نہ ہوکر برصغیر ہے جس میں کچھ چھوٹی اور کچھ بڑی قومیں بستی ہیں۔ ہندوستان پر انگریزوں کی حکومت اور خاص طور سے ملکہ برطانیہ کی حکومت (جو ۱۸۵۸ء میں جاری ہوئی) نے ملک کو پرانے دور سے نکال کر نئے ترقی یافتہ دور میں داخل کردیا تھا۔ ریپریزنٹیشن کا نفع بخش اصول ہندوستان کو انگریزوں نے ہی سکھایا تھا چونکہ یہی اصول برطانیہ میں جاری تھا لہٰذا انگریز اسی اصول کو ہندوستان میں رائج کرنا چاہتے تھے لیکن ایسا کرتے وقت انھوں نے ہمیشہ کی طرح مسلم مفاد کو نظرانداز کیا کہ حکومت انھوں نے مسلمانوں سے ہی چھینی تھی اور انہیں کو وہ اپنا دشمن تصور کرتے تھے۔ لیکن سرسید واحد شخص ہیں جنھوں نے انگریزوں پر مسلمانوں کے مفاد کا بخوبی اظہار کیا نہ صرف مسلمانوں کے مسائل ان تک پہنچائے بلکہ حکومت کے اصولوں میں مسلمانوں کے تحفظ کا عنصر بھی شامل کرایا۔
سرسید کی شخصیت انگریزوں کی مسلم دشمنی اور ہندونوازی کے بیچ دیوار بن کر کھڑی ہوگئی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ سرسید نہ ہوتے تو انگریزوں کی ہندونوازی کی پالیسی بلاروک ٹوک جاری رہتی۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی سادے نیابتی طریقے کا ہندوستان میں رائج کرنا تھا۔ وائسرائے کی کونسل میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے کہا:

> ”ریپریزنٹیٹو اداروں کے ذریعہ سے سیلف گورنمنٹ کا اصول شاید سب سے عمدہ سبق ہے جو انگلستان کی فیاضی ہندوستان کو سکھادے گی۔“[1]

اور ظاہر ہے کہ انگلینڈ میں سادا نیابتی اصول جاری تھا کہ وہاں مختلف طبقات میں مذہبی، سیاسی وثقافتی اختلافات نہیں پائے جاتے تھے جن کی بنا پر کسی دوسرے طریقہ کی وہاں ضرورت محسوس ہوتی۔ انہیں اصولوں کو جوں کا توں انگریز حکمراں ہندوستان میں لاگو کرنا



چاہتے تھے کہ ان کے نزدیک یہی ایک بہترین طریقہ حکمرانی کا تھا دوسری طرف ان کی مسلمانوں کے تئیں دشمنی کی ایک لمبی تاریخ تھی۔ تاریخی وجوہات کی بنا پر ہندوستان کی ہندو قوموں سے ان کی کوئی دشمنی نہیں تھی اسکے برخلاف مسلمانوں اور عیسائیوں کا ٹکراؤ بہت پرانا تھا۔ صلیبی جنگیں ہندوستان میں داخل ہوتے وقت مسلمانوں سے لڑی گئیں جنگیں وہ تمام وجوہات تھیں جن کی بنا پر انگریز مسلمانوں کی مخالفت میں عمل کرنے پر مجبور تھے لہٰذا ہندوستان میں مسلم مخالف پالیسی بلاروک ٹوک جاری تھی لیکن سرسید کی دانشمندی اور کوششوں کی وجہ سے اس پالیسی میں کچھ تبدیلی آئی اور اتنا فرق پڑ گیا کہ انگریزوں نے مسلم دشمنی ترک کرکے منصفانہ رویہ اپنانے کی کوشش شروع کردی مگر خاص معاملات میں ان کو مسلسل یاددہانی کرائے جانے کی ضرورت ہمیشہ رہی کہ ہندوستان میں ایسا نظام نہ جاری کیا جائے جو مسلمانوں کے لیے محض نقصاندہ ہو۔
سرسید کی لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر تقریر اسی یاددہانی کی ایک صورت تھی کہ سادہ جمہوری نظام چاہے جتنے چھوٹے پیمانے پر جاری کیا جائے مسلمانوں کے لیے نقصاندہ رہے گا سرسید نے یہ نکتہ اس خوبی سے انگریز حکمرانوں پر واضح کردیا کہ انہیں اس بل میں ترمیم منظور کرنی پڑی کہ ایک تہائی ممبروں کا تقرر حکومت کے ہاتھ میں رہا تاکہ مسلمانوں کو نامزد کیا جاسکے۔ سرسید پہلے شخص تھے جنھوں نے کانگریس بننے سے بہت پہلے ہی سادے جمہوری نظام کے خلاف اپنی رائے دی تھی۔

> ”اس سے پہلے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا خیال بھی ہوا میں نے اس مسئلہ پر غور کیا تھا کہ آیا ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ ہندوستان کے حسب حال ہے اور جان اسٹوراٹ مل کی آرا بتائید ریپریزنٹیٹو گورنمنٹ کے پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ اول لازمی امر ایسے طریقہ حکومت کے لیے جس کا انتظام کثرت رائے پر چلتا ہو یہ ہے کہ ووٹرز میں ہم جنسیت ہو بلحاظ قوم کے اور مذہب کے اور عادات معاشرت کے اور رسومات کے اور تمدنی حالات کے اور بلحاظ تاریخی ملکی روایات کے یعنی یہ مسلم امر ہے کہ رائے دینے والوں اور ملک

> کی آبادی میں ہم جنسیت یا مشابہت امور بالا میں ہو اور جب یہ باتیں موجود ہوں تو یہ طریقۂ حکومت عمل میں آ سکتا ہے یا مفید ہو سکتا ہے جہاں یہ امر موجود نہ ہوں یا ان کا خیال نہ کیا جائے تو ایسے ملک میں جیسا کہ ہندوستان ہے کہ جہاں کہیں کسی امر بالا میں ہم جنسیت نہیں ہے سوائے ملک کے امن اور بہبودی کو نقصان پہنچنے کے اور کوئی نتیجہ نہیں ہو سکتا۔''۲

سرسید نے یہ بات برطانوی پارلیمنٹ تک پہنچائی کہ ہندوستان میں فی الواقع بہت سی اقوام بستی ہیں۔ پارلیمنٹ سے مخاطب ہوتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''وہ اس امر کو بھلا نہ دیں گے کہ ہندوستان براعظم ہے اور مثل انگلستان یا اسکاٹ لینڈ یا آئر لینڈ کے ایک چھوٹا ملک نہیں ہے اور اس میں وسیع مختلف آبادیاں ہیں جن کی تمدنی اواخلاقی اور سوشل اور پولیٹیکل اور مذہبی اور طبعی اور تاریخی حالات بہت مختلف ہیں اور جن میں اسلامی سلطنت کے زوال کے بعد سے کبھی اتفاق نہیں ہوا اور بجائے اس کے کوئی اور طریقہ حکومت اسلامی طریقے کے بدلے قائم کرتے ہمیشہ آپس میں لڑتے رہے۔'' (ایضاً)

سرسید سمجھ رہے تھے کہ ہندوستان میں جو حکومت کی تبدیلی ایسٹ انڈیا کمپنی سے اقتدار چھین کر ہوئی ہے۔ معمولی تبدیلی نہیں ہے اور ان کے ذہن دور رس میں یہ اشکال ابھرنے لگے تھے کہ ایک دن ہندوستان میں نیابتی حکومت قائم ہوگی۔

> ''میں ان آدمیوں میں سے نہیں ہوں جو کہ ہندوستان کے طریقہ حکومت میں جو یہ تبدیلی واقع ہوئی اس کو یونہی برائے نام خیال کرتے ہیں...... مالک تخت و تاج کے ہاتھ میں حکومت لے جانے سے ایک حقیقی اور عظیم تبدیلی واقع ہوئی۔'' (ایضاً)

۱۸۸۲ء میں جب نیابتی طرز حکومت کی سمت میں پہلا قدم اٹھایا گیا تو سرسید نے ہندوستانی سماج میں موجود اختلافات بہت دلنشیں اور عمدہ طریقے سے انگریز حکمرانوں پر



واضح کر دیے اور اسی تقریر سے یہ بات واضح کر دی کہ حکومت جمہوری اداروں کی بحالی ضرور چاہے مگر ہندوستان میں جمہوریت کا مطلب اکثریت کی حکومت ہے اور اکثریت و اقلیتی طبقات میں کسی بھی طرح کی مماثلت نہیں پائی جاتی نہ تاریخ میں نہ تمدن میں نہ مذہب میں نہ معاشرت میں اور نہ اخلاقی ضوابط میں۔ سادے جمہوری اداروں کی شروعات پر یہ مسلمانوں کا پہلا ریپریزنٹیشن تھا جس میں صاف الفاظ میں کہا گیا تھا کہ مسلمان اکثریت کی حکومت سے خوش نہیں ہے اور نیابتی طرز حکومت کی ابتدا کا مطلب یہ ہوگا کہ انگریزوں کے بعد مسلمانوں کی بجائے ہندو حکمراں ہوں گے۔ بقول سرسید ''بڑی قوم چھوٹی قوم کو دبا لے گی۔''

سرسید جمہوریت کے خلاف نہیں تھے لیکن ہندستان کی صورت حال میں وہ سادے جمہوری طریقوں کے رائج کرنے کے خلاف تھے کہ اس میں مسلمانوں کا بہت نقصان تھا اور مسلمانوں کے نفع نقصان کی سرسید سب سے زیادہ پروا کرتے تھے جہاں اپنی قوم کا فائدہ نقصان شامل ہوتا تھا وہاں وہ کسی کی دوستی کا بھی خیال نہیں رکھتے تھے۔

> ''لارڈ رپن کے زمانے میں............ لوکل بورڈ اور میونسپل بورڈ کا قانون پیش تھا اور اس کا منشا یہ تھا کہ سب لوگ الیکشن سے ممبر مقرر ہوں، اے صاحبو! میں کنزرویٹو نہیں ہوں میں بہت بڑا لبرل ہوں لیکن ان خیالات سے قوم کی بھلائی کو بھول جانا کسی عقل مند کا کام نہیں ہے جو شخص کہ اس طرح کے الیکشن کے خلاف تھا وہ میں تھا۔ اگر میں شیخی نہ کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ لارڈ رپن کی رائے صرف میری ہی اسپیچ کے زور سے پھری کہ ایک ثلث کا تقرر گورنمنٹ کے ہاتھ میں رہا اور دو ثلث انتخاب سے۔''۳

سرسید کی ہی رائے اور ان کے ہی توجہ دلانے پر وائسرائے لارڈ رپن کی رائے بدل گئی اور مسلمانوں کے لیے نومینیشن کا اصول تمام نیابتی داروں میں جاری ہوا کہ الیکشن کے ذریعہ ان سب کا جیتنا ممکن نہ تھا اور جو نہیں جیت پاتے تھے ان کو نامزد کر دیا جاتا تھا:

> ''لارڈ رپن اضلاع متوسط کے سوا باقی صوبوں میں کل ممبر الیکشن

سے مقرر کرنا چاہتے تھے مگر آخر کار جیسی رائے سرسید کی تھی وہی قاعدہ
تمام صوبے جات کے لیے مقرر کیا گیا جو اضلاع متوسط کے لیے قرار
پایا تھا اور اسی قاعدے کی بدولت تمام بورڈوں میں کم وبیش مسلمان
ممبروں کی صورت آج تک دکھائی دیتی ہے ورنہ خاص خاص
مقامات کے سوا کسی بورڈ کی ممبری پر ان کی شکل نظر نہ آتی۔''[۵]

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کے فائدے کے پیش نظر خاص طریقۂ انتخاب کے حامی تھے جس میں کہ مسلمان بھی منتخب ہو سکیں، ایک تقریر میں اس نکتہ کو واضح کرتے ہوئے کہا کہ:

''آپ خیال کریں کیا حال انتخاب کا ہے؟ کسی ضلع میں ہندو مسلمان برابر نہیں ہوتے آپ کہہ سکتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو دبا دیں گے اور سیلف گورنمنٹ کے مالک ہو جائیں گے۔ ابھی کلکتہ میں ایک بڑے بزرگ خاندانی داڑھی والے مسلمان مجھ سے ملے اور انھوں نے کہا کہ غضب ہو گیا ہمارے شہر میں میونسپل کونسل کے لیے اٹھارہ مسلمان ممبر منتخب ہونے والے تھے کوئی منتخب نہیں ہوا سب ہندو منتخب ہو گئے۔ اب گورنمنٹ سے کسی کا تقرر ہونا چاہیے میں چاہتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ گورنمنٹ مجھ کو منتخب کرے۔ یہی حال سب شہروں کا ہے علی گڑھ میں اگر خاص قاعدہ مقرر نہ ہو جاتا تو کوئی مسلمان یہاں تک کہ ہمارے دوست مولوی خواجہ محمد یوسف بھی جو نہایت معزز ہیں بمشکل اپنے منتخب ہونے کے لیے ووٹ حاصل کر سکتے اور آخر کو گورنمنٹ کی طرف سے تقرر کے متوقع ہوتے۔''

○

## حواشی:

(۱) مجموعہ لیکچرز، ص: ۱۴۰
(۲) مکاتیب سرسید مرتبہ مشتاق حسین، ص: ۳۷۱
(۳) مجموعہ لیکچرز، ص: ۳۱۰
(۴) حیات جاوید، ص: ۵۹۷
(۵) مجموعہ لیکچرز، ص: ۲۹۹

# ابوالکلام آزاد

## پیدائش اور بچپن

محی الدین احمد آزاد اگست ۱۸۸۸ء میں (بقول خود) مکہ میں پیدا ہوئے۔ ہماری تحقیق کے مطابق وہ رانچی (بہار) میں پیدا ہوئے تھے۔ والد نے فیروز بخت تاریخی نام رکھا اور جواں بخت جواں طالع جواں باد کے مصرع سے ہجری سال کا استخراج کیا۔ مولانا کا شجرہ نسب یوں ہے:

مولانا آزاد بن مولانا خیرالدین بن مولانا محمد ہادی بن شاہ محمد افضل بن محمد حسین۔ یہ سب لوگ دلی کے رہنے والے تھے اس لیے مولانا اپنے آپ کو دہلوی بھی لکھتے تھے۔ ان کے والد اپنے مریدوں کے حلقہ میں 'حضرت' کے نام سے مشہور تھے اسی لیے بچپن میں مولانا آزاد کو مریدین 'چھوٹے حضرت' کہا کرتے تھے۔ ملک کے حالات اور غدر کے واقعات سے بددل ہوکر مولانا خیرالدین نے حجاز کو ہجرت کی اور تقریباً بیس سال تک ہندوستان نہیں آئے پہلی بار ۱۸۸۷ء میں ان کے آنے کا پتہ چلتا ہے۔ (یہ سب واقعات ان کے اپنے بیان کردہ ہیں جو ''تذکرہ'' اور ''آزاد کی کہانی'' میں شائع ہوئے) اس کے بعد آتے جاتے رہے اور بالآخر ۱۸۹۸ء کے آخر میں مستقلاً کلکتہ آ گئے۔ مولانا آزد کی عمر بمشکل بارہ تیرہ سال کی تھی کہ ان کے والد نے ان کی شادی کر دی۔ دلہن کی عمر اس وقت سات یا آٹھ سال تھی ان کا نام زلیخا تھا۔ وہ اردو، فارسی سے واقف تھیں۔

مولانا کی زندگی میں ان کے والد مولانا خیرالدین کا بہت اثر رہا۔ وہ روایتی طرز زندگی کو پسند کرتے تھے۔ انھیں مغربی جدید تعلیم پر بالکل اعتقاد نہ تھا بلکہ وہ اس زمانے کے عام دینی علماء کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ یہ تعلیم عقیدے کو کمزور کر دیتی ہے لہٰذا انھوں نے اپنے بیٹے کی تعلیم کا انتظام قدیم دستور کے مطابق کیا۔ مولانا کو کسی اسکول کالج یا مدرسہ میں داخل



نہیں کیا گیا بلکہ ان کی تعلیم گھر کی چار دیواری کے اندر ہی مکمل ہوئی اور مولانا کسی مدرسے یا کالج کی سند حاصل نہ کر سکے۔

مولانا خیرالدین اپنے علاقہ کے ایک بڑے پیر تھے اور ہزاروں مریدین ان کو گھیرے رہتے تھے۔

> ''معتقدین اور مریدین کا یہ طرز عمل ہمارے خاندان میں رہتا تھا کہ ہر شخص جو والد مرحوم سے ملنے آتا تو پہلے سلام کے بعد کھڑے ہی کھڑے جھک کر ان کا ہاتھ چومتا۔ زیادہ عقیدت مند تو جب تک دونوں پیر نہ چوم لیتے سیر نہ ہوتے۔''[۱]

مولانا چونکہ پیرزادے سمجھے جاتے تھے اس لیے ان کے ساتھ بھی ہر شخص وہی کرتا تھا۔ اگر والد کے ساتھ باہر جانا پڑتا تو قدم قدم پر رکنا پڑتا تھا۔

> ''لوگ دو کانوں سے اٹھ کر یا راستوں میں چلتے ہوئے گھیر لیتے اور ہاتھ پاؤں چومنے لگتے۔ عید کے دن یہ منظر سب سے زیادہ قابل دید ہوتا تھا ہزاروں آدمی عیدگاہ میں پاؤں پکڑتے تھے خاک ان کے چہروں پر لگ جاتی۔ مگر جوش عقیدت میں انھیں ان باتوں کی مطلق پرواہ نہ ہوتی تھی۔''[۲]

مولانا خیرالدین بہت کٹر وہابیت مخالف تھے اور ہر طرح کی برائیوں کا مجموعہ ان کے نزدیک وہابیت تھی۔

> ''وہابیت کے بارے میں میری خاندانی دنیا میں اصل اباحت نہ تھی بلکہ حذر یعنی نفرت تکفیر اور انسان میں جس قدر بھی مذہبی اور غیر مذہبی برائیوں کا تصور کیا جا سکتا ہے ان سب کا پیکر و مجسمہ وہابیت تھی۔''[۳]

مولانا کا بیان ہے کہ بچپن میں میرا تخیل یہ تھا کہ کوئی خاص قسم کا ایک بڑا ہی مکروہ اور قابل نفرت مخلوق ہے میں اپنے ذہن میں اس کا تصور یوں کرتا تھا کہ ایک قبیح صورت انسان جس کا آدھا چہرہ کالا ہے یہ اس لیے کہ دل کے کفر اور بغض رسول کی وجہ سے وہابیوں کا آدھا منہ کالا ہوتا ہے۔ مولانا کے گھر میں دنیا کی ہر مکروہ چیز اسی لقب سے پکاری جاتی تھی مثلاً کسی

نے کہا کہ رات میں اس قدر وہابی تھے کہ نیند نہ آئی یعنی مچھر بہت تھے۔ صندوق کے نیچے وہابی چلے جاتے تھے یعنی چوہے۔

''ہم نے سیکڑوں مرتبہ والد مرحوم کو کہتے سنا کہ ان کا کفر یہود و نصاریٰ کے کفر سے بھی بڑھ کر ہے یہود و نصاریٰ بھی اپنے پیشواؤں کے منکر نہیں ہیں یہ خبیث تو خود اپنے پیغمبر کے منکر ہیں۔''۴

ان کی یہ مخالفت صرف باتوں تک محدود نہ تھی بلکہ غدر کے بعد جو علماء حجاز کو ہجرت کر گئے تھے ان کے عقائد کی تحقیقات کرا کے ان کو سزائیں بھی مولانا خیرالدین نے دلوائیں:

''غدر کے دوران علماء وہابیہ کی جو جماعت گورنمنٹ کی سختیوں سے پریشان ہو کر مکہ چلی گئی تھی ان کے خلاف مولانا خیرالدین نے سلطان اور شریف مکہ دونوں کو سخت برانگیختہ کیا تھا اور ان کے عقائد کی تحقیقات کرا کے ان کو سزائیں دلوانے میں بہت اہم رول ادا کیا تھا۔''۵

انھوں نے وہابیت کے رد میں پمفلٹ و رسائل لکھے تھے ان کی مخالفت انتہا پسندانہ رویہ رکھتی تھی حد یہ کہ اس مخالفت میں ہر طرح کی رسومات و بدعات کو از روئے شرع و قرآن جائز قرار دیتے تھے۔

''ان کی طبیعت میں وہابیوں کے متعلق سخت تعصب قائم ہو گیا تھا۔ ہر طرح کی رسوم ہر طرح کی بدعات جو سخت سے سخت آخری درجہ کی کہی جا سکتی تھیں ان سب کی وہ توجیہیں کرتے تھے انکا یہ معیار اتنا سخت تھا کہ ۱۹۰۱ء میں جب مولوی احمد رضا خاں بریلوی ان سے ملنے گئے اور گفتگو ہوئی تو وہ بھی ان کے معیار پر پورے نہ اترے اور مولانا احمد رضا خاں بریلوی کے جانے کے بعد انھوں نے کہا کہ اس کے عقیدے میں بھی فتور ہے۔''۶

## تقلید اور رسومات سے انکار

غور طلب امر یہ ہے کہ جس نے آنکھ کھولتے ہی اندھی پیر پرستی اور کورانہ تقلید و جاہلانہ ماحول اپنے چاروں طرف دیکھا ہو اس کے آگے طلب اور جستجو آزادئ فکر و رائے کا دروازہ



کیونکر کھل سکتا تھا اور وہ کون سی طاقت تھی جس نے تقلید کے اندھیرے سے نکال کر مولانا کو آزادئ فکر رائے کے اجالے میں لا کھڑا کیا؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا بہت زیادہ مشکل نہیں ہے۔ مولانا نے خود اس گتھی کو سلجھا دیا ہے۔ مولانا کا ذہن ان تمام رسومات اور بدعات کو ماننے سے انکار کرنا چاہتا تھا ان کے ذہن کے کسی گوشہ میں یہ بات بیٹھی ہوئی تھی کہ جو کچھ ہو رہا ہے وہ سب کچھ ٹھیک نہیں ہے اور ان کے دماغ میں طرح طرح کے سوال پیدا ہوتے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا کو سرسید اور محسن الملک وغیرہ کی روشن تحریریں پڑھنے کا موقع ملا اور اچانک ہی تقلید کی بندشوں سے ان کو آزادی مل گئی اور ایک نئی آزاد دنیا کا دروازہ ان کے سامنے کھل گیا۔ سرسید کی تصنیفات نے ان کے ذہن و دماغ میں ہلچل مچا دی اور ایک بالکل نئی دنیا سامنے آ گئی ان کی طبیعت چونکہ پرانے تصورات اور عقائد سے گھبرا چکی تھی لہٰذا یہ اثر اور بھی گہرا تھا۔

''قدرتی طور سے اس نئے عالم کی دلفریبیوں نے مسحور کر لیا جوں جوں پڑھتا گیا مسحوریت بھی بڑھتی گئی حتیٰ کہ اب ایک سحر زدہ کے معمول کی طرح میری دماغی حالت بالکل عامل کے قبضہ میں تھی۔''۷

مولانا کے مطالعہ کرنے کی رفتار بہت تیز تھی تقریباً چھ ماہ میں انھوں نے سرسید کی تقریباً تمام تصنیفات کا مطالعہ کر لیا تھا۔ ان کی دماغی حالت میں ایک زبردست تغیر آ گیا کل تک جن عقائد و رسومات پر ان کو غرور تھا اب وہ سب ہیچ معلوم ہونے لگیں۔ اس خیال سے شرم محسوس ہونے لگی کہ چھ ماہ پہلے میرے ایسے عقائد تھے۔ اور ایک حقارت آمیز رویہ اپنے سابقہ عقائد کی طرف پیدا ہو گیا۔ اس زمانے کی قلبی کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا لکھتے ہیں:

''میرے لیے بہت مشکل ہے کہ اس زمانے کی قلبی کیفیت کی پوری تصویر کھینچ سکوں میں ایک بت کی طرح سرسید کی پوجا کرتا تھا ان کی عزت میرے ریشے ریشے میں رچ گئی تھی ان کا وجود میرے ذہن میں فضائل انسانی کا مکمل نمونہ تھا جس کی طرف ایک شائبہ نقص بھی منسوب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ بار بار حسرت ہوتی تھی کہ یا لیت کنت معہ میں سوچتا کہ اگر وہ اس وقت موجود ہوتے تو کس طرح

تمام علائق ترک کر کے ان کے پاس چلا جاتا اور کس طرح ان کی پرستش کرتا۔‘‘ ۸

یہ خود ایک انتہا پسندانہ رویہ ہے۔سرسید کی تحریریں پڑھ کر مولانا کو سرسید کی پرستش کا خیال آیا کہ بچپن سے وہ یہی دیکھتے آئے تھے۔اپنے ان خیالات کی غلطی کا اندازہ مولانا کو جلد ہی ہوگیا۔وہ ان تصورات پر افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

’’میں ان خیالات کو روشن خیالی سے تعبیر کرتا تھا کہ باب معرفت مجھ پر کھلا ہے اور میں خوش نصیب ہوں کہ سرسید سے ترک تقلید کا سبق سیکھا مفسرین کی فقہاء کی محدثین کی اور تمام علماء کی تاہم میں خود سرسید کا نہ صرف مقلد اعلیٰ تھا بلکہ تقلید کے نام سے پرستش کیا کرتا تھا اور کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ سرسید اس سے کیوں مستثنیٰ ہوجائیں گے۔‘‘ ۹

ایسی مثالیں دنیا میں کم ہی ملیں گی کہ جنھوں نے سرسید کی پرستش کی حد تک تعظیم کی ہو مولانا کیونکہ جذباتی اور انتہا پسندانہ رویہ رکھتے تھے لہٰذا یہ اثر ان پر ہوا مگر وہ بھی صرف مذہبی میدان میں۔سرسید کی سیاسی تعلیمی وتہذیبی تحریکات کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے زیادہ مطالعہ نہیں کیا۔ان کو اپنے خاندانی ورثہ میں اندھی تقلید اور کورانہ خیالات کی تعلیم ملی تھی لہٰذا سرسید کی تعلیمات میں سے انھوں نے اسی میدان میں اثر قبول کیا لیکن وہ بھی سال بھر تک رہا۔اس ذہنی بندش کے کھلنے کے عمل کو وہ نشہ سے تعبیر کرتے ہیں۔’’یہ نشہ سال بھر تک خوب زوروں پر رہا،سرسید کی رہنمائی نے ان کو اس منزل تک پہنچادیا تھا کہ اہل مذہب کے تمام عقائد اس رنگ وشکل میں جو عام طور سے تسلیم کیے جاتے ہیں محض وہم وخیال ہیں اور اصلیت کچھ دوسری ہے۔اس ذہنی دوڑ نے آخر کار مولانا کو ملحد بنا کر چھوڑا کیونکہ بے لگام خیالات اور انتہا پسندانہ رویہ کا اثر ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہے کہ خدا پر یقین کررہے تھے تو ہر پتھر تک کو خدا بنادیا اور جب انکار پر آئے تو قرآن وحدیث رسول اور خدا کی ذات سب سے منہ موڑ لیا۔

’’لیکن اب جو دور شروع ہوا اس کی ضرب بیک وقت عقائد اور اعمال دونوں پر لگی...... نہ مذہب پر اطمینان رہا تھا نہ مذہب کے



مبادیات واساسات پر حتیٰ کہ اس خدا کے وجود پر بھی جس کی عبادت کی جاسکتی ہے۔‘‘ ۱۰

لہٰذا جب خدا پر ہی اعتقاد نہ رہا تو کاہے کی نماز اور کیسا روزہ۔تمام عبادات اور اسلامی فرائض سے یکسر ہاتھ اٹھالیا۔مولانا کا ذہن بھی کیا عجب تھا کہ کہاں تو سرسید کبھی ان کے لیے قابل پرستش شخصیت تھے اور کوئی نقص کا شائبہ تک ان کی ذات سے منسوب نہ کیا جاسکتا تھا اور کہاں اب یہ حالت ہوگئی کہ سرسید کے افکار کے سلسلہ میں اپنے والد صاحب کے خیالات کے پھر سے مداح ہوگئے کہ گمراہی کا سلسلہ وہابیت ونیچریت سے شروع ہوکر الحاد تک جاتا ہے۔

’’والد مرحوم کہا کرتے تھے کہ گمراہی کی موجودہ ترتیب یوں ہے کہ پہلے وہابیت پھر نیچریت اور نیچریت کے بعد تیسری قدرتی منزل جو الحاد قطعی کی ہے اس کا وہ ذکر نہیں کرتے تھے اس لیے کہ وہ نیچریت کو ہی الحاد قطعی سمجھتے تھے لیکن میں تسلیم کرتے ہوئے اتنا اضافہ کرتا ہوں کہ تیسری منزل الحاد ہے اور ٹھیک ٹھیک مجھے یہی پیش آیا۔سرسید مرحوم کو بھی پہلی منزل وہابیت کی ہی پیش آئی تھی۔‘‘ ۱۱

یعنی جو مرحلہ مولانا کو پیش آجائے وہی قانون ہے اور یہ سلسلہ ایسا ہے جو ہر شخص کو پیش آتا ہے حتیٰ کہ سرسید بھی اس سلسلہ سے نہ بچ سکے اور ملحد ہوگئے۔انکار باری تعالیٰ چونکہ مولانا نے کیا لہٰذا وہابیت کا نتیجہ یہ ہونا ایک قانون ٹھہرا۔

## الحاد اور شراب

مولانا آزاد کے الحاد کا زمانہ خاصہ طویل ہے کئی سال تک وہ خدا کے منکر رہے۔قرآن رسول اور حدیث کی کیا حیثیت جب خدا کے وجود سے ہی انکار کربیٹھے۔چودہ سال کی عمر سے لے کر ۲۲ سال کی عمر تک مولانا مکمل ملحد رہے اور خاص بات یہ ہے کہ اسی زمانے میں مولانا ’’لسان الصدق‘‘،’’الہلال‘‘ وغیرہ رسالے نکالتے تھے اور مذہبی مضامین لکھتے تھے قرآن وحدیث کا حوالہ دیا کرتے تھے۔غالباً ایسے ہی لوگوں کو قرآن کی زبان میں منافق کہا گیا ہے کہ دل میں یقین نہیں رکھتے اور زبان پر اقرار کرتے ہیں۔یہ خیال رہے کہ مولانا کی زندگی میں یہ

خیالات عام نہ ہو سکے بلکہ ان کے انتقال کے بعد ان کے دست راست اور انتہائی قریبی دوست مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی کی تصنیف شدہ کتاب ''آزاد کی کہانی آزاد کی زبانی'' کے ذریعہ عام ہوئے۔ مولانا نے اس الحادی دور کا اعتراف اپنی کتاب ''تذکرہ'' میں بھی کیا ہے۔

> ''۱۴برس سے لے کر ۳۲ برس کی عمر تک میرا یہی حال رہا۔ میرا ظاہری روپ ایک ایسے مذہبی آدمی کا تھا جو مذہب کو عقل و علم کے ساتھ چلانا چاہتا ہے لیکن میرے اندر اعتقاد میں قطعی الحاد تھا اور عمل میں قطعی فسق۔'' ۱۲

اسی دوران جب عید آئی تو تمام لوگ عید کی نماز پڑھنے گئے۔ مولانا بھی مارے شرم کے نماز میں شریک تو ہو گئے لیکن ان کے دل نے انہیں بہت ملامت کی۔ اس کے بعد عیدین کی نماز بھی چھوڑ دی یعنی جو سماج سے پردہ تھا وہ بھی ختم کر دیا۔ سید سلیمان ندوی شروع میں الہلال سے وابستہ تھے لیکن مولانا کو قریب سے دیکھ کر انھوں نے الہلال سے اپنی وابستگی توڑ دی اور کلکتہ سے چلے آئے۔ مولانا آزاد نے ان کو منانے کے لیے خط لکھا اور اس میں اپنے الحاد کا اعتراف کھلے الفاظ میں کیا:

> ''آپ کو معلوم ہے کہ میری حالت ابتدا سے کچھ عجب طرح کی ہے میں نے ایک مذہبی سوسائٹی میں پرورش پائی لیکن ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ مجھ پر ان کا کچھ اثر نہیں پڑا پھر میں طرح طرح کی بداعمالیاں میں پڑ گیا اور شاید ہی فسق و فجور کا کوئی درجہ ایسا ہو جو مجھ بدبخت سے رہ گیا ہو۔ عملاً یہ حال تھا اور اعتقاداً ملحد یا مثل ملحد کے تھا۔'' ۱۳

مولانا اس زمانے میں شراب سے بھی شوق فرمایا کرتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کے الہلال چھوڑ کر جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ مولانا آزاد نے شراب پینے کا اعتراف کرتے ہوئے سید سلیمان ندوی صاحب کو منانے کے لیے لکھا تھا کہ میں نے اب چھوڑ دی ہے پہلے پیتا تھا مگر اب نہیں (یہ ایک صریح جھوٹ تھا جو ندوی صاحب کو منانے کے لیے لکھا گیا۔ ورنہ انھوں نے تمام زندگی شراب نہیں چھوڑی)

> ''حال ہی میں ایک شخص کا خط آیا ہے جو جناب کے حوالے سے لکھتا ہے کہ تم شراب پیتے ہو اور اسی وجہ سے مولانا سلیمان چلے گئے میں نے جی میں کہا یہ سچ تو نہیں ہے معلوم نہیں آپ کی نسبت اس کا بیان سچ ہے یا غلط۔ میں شراب پیتا تھا اور شراب پر ہی کیا موقوف ہے میں نے ہر طرح کی سیاہ کاریاں کی ہیں لیکن الحمدللہ خدا نے مجھے توبہ کی توفیق دی اور اب نہیں کرتا۔'' ۱۴



یعنی مولانا آزاد شراب پی کر الہلال میں قرآن لکھتے تھے۔

سید سلیمان ندوی ایک مراسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو لکھتے ہیں:

> ''بہت سے پھول صرف دیکھنے کے ہوتے ہیں سونگھنے کے نہیں۔ مولوی آزاد وہی پھول ہیں افسوس ہے کہ میں بھی دور سے دیکھ کر ان کو سونگھنے کے قابل سمجھا آپ جانتے ہیں کہ میں علم سیاست اور مذہب کو متحد سمجھتا ہوں۔ اسی چیز کا مشتاق ہو کر یہاں آیا تھا لیکن میری حالت اس شخص کی طرح ہوئی جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے (اعمالهم كسراب بقيعة يصبه الظلماء ماء۔) ۱۵

## موسیقی سے لگاؤ

مولانا آزاد کو موسیقی سے خاص لگاؤ تھا اور اس فن میں ان کو خاص جانکاری تھی۔ موسیقی ان کے لیے زندگی کا سہارا اور جسم و دل کی تمام بیماریوں کا علاج تھی۔ وہ موسیقی کو سنے بغیر نہیں رہ سکتے تھے اور ان کی خوشی اس کے بغیر نامکمل تھی۔

> ''میں زندگی کی احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر خوش رہ سکتا ہوں لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'' ۱۶

مولانا آزاد صنف نازک کے تئیں ہر شرعی پابندی سے آزاد تھے۔ ان کا موسیقی کا شغف ان کی مصری معینہ طاہرہ سے شناسائی کا سبب بنا وہ لکھتے ہیں:

> ''وہ خود بھی بلائے جان تھی مگر اس کی آواز سے بھی زیادہ آفت ہوش و ایمان تھی میں نے اس سے بھی شناسائی بہم پہنچائی اور عربی موسیقی کے کمالات دیکھے اس خانماں خراب شوق نے کن کن گلیوں کی خاک

چھنوائی۔''۱۷

مولانا مغنیہ ام کلثوم کے بہت بڑے شیدائی تھے اور اس کے تمام ریکارڈ مولانا نے جمع کر رکھے تھے۔

''میں نے اس کے بے شمار کارڈ سنے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس شخص نے ام کلثوم کی آواز نہیں سنی وہ موجودہ عربی موسیقی کی دل آویزیوں کا کچھ اندازہ نہیں کرسکتا۔''۱۸

موسیقی کو وہ خلاف شرع نہیں سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ مفتیان کرام نے اس معاملہ میں انتہا پسندانہ رویہ اختیار کیا۔

''اس بات کی عام شہرت ہوگئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ فقہا نے اس بارے میں تشدد کیا۔''

۱۳؍نومبر۱۹۱۳ء کی الہلال کی اشاعت میں مولانا نے لکھا ہے کہ:

''میں یہ کہنے میں نہیں شرماتا کہ موسیقی کو نہایت محبوب رکھتا ہوں اس لیے اس شے سے قطع تعلق نہیں کرسکتا جس کا تعلق دل کے ساتھ جسم و روح کا تعلق ہے۔''۱۹



حواشی:

(۱) آزاد کی کہانی،ص:۳۱۲

(۲) ایضاً،ص:۳۲۴

(۳) ایضاً،ص:۳۳۷

(۴) ایضاً،ص:۳۴۱

(۵) ملک زادہ منظور احمد،مولانا آزاد فکر و فن،ص:۲۷

(۶) ایضاً،ص:۲۸

(۷) آزاد کی کہانی،ص:۳۶۱

(۸) ایضاً،ص:۳۶۲

(۹) ایضاً،ص:۳۶۳

(۱۰) ایضاً،ص:۳۹۱

(۱۱) ایضاً،ص:۳۶۰

(۱۲) ایضاً،ص:۳۹۹

(۱۳) عبدالماجد دریابادی،مکتوبات سلیمانی،اگست۱۹۳۳،ص:۲۱

(۱۴) مکتوبات سلیمانی،ص:۲۳

(۱۵) ایضاً،ص:۱۴۲

(۱۶) غبار خاطر،ص:۲۷۰

(۱۷) ایضاً،ص:۲۷۵

(۱۸) ایضاً،ص:۲۸۰

(۱۹) ایضاً

# مسلم مفاد کی مخالفت

## مولانا آزاد کی سیاست میں آمد

اکتوبر ۱۹۰۶ء میں حکومت ہند نے بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ایک مغربی بنگال دوسرا مشرقی بنگال اور آسام۔ اس دوسرے حصہ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ کانگریس تقسیم بنگال کی مخالفت میں ایجیٹیشن چلا رہی تھی پورے ملک میں بندے ماترم کا نعرہ لگایا جا رہا تھا اور حکومت پر یہ الزام لگایا جا رہا تھا کہ اس نے مسلمانوں کو خوش کرنے کے لیے بنگال کی تقسیم کی ہے حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے لیے پورے متحد بنگال کا انتظام کرنا زیادہ مشکل تھا۔انتظامی مشکلات کو دور کرنے کے لیے بنگال تقسیم کیا گیا تھا۔اس تقسیم سے لامحالہ مسلمانوں کو فائدہ پہنچا تھا کیوں کہ اس طرح بنگال کے مسلم علاقوں میں تعلیم اور ترقی کا دور شروع ہوسکتا تھا۔مگر کانگریس نے اس تقسیم کے خلاف زبردست مہم چلائی اور آخر کار حکومت کو دباؤ میں آ کر تقسیم کے فیصلہ کو واپس لینا پڑا۔عرش ملسیانی اعتراف کرتے ہیں کہ اس تقسیم سے مسلمانوں کو بہت فائدہ پہنچتا۔

''۱۹۰۶ء میں تقسیم بنگال کی تجویز کا مقصد یہی تھا کہ مسلمانوں کو خوش کیا جائے اور انھیں ایک ایسا صوبہ دیا جائے جس میں ان کی اکثریت ہو۔''[1]

لارڈ کرزن نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ:

''بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کرنے سے جہاں یہ مقصود تھا کہ بنگال کے لفٹنٹ گورنر پر کام کا بوجھ ہلکا کر دیا جائے جنھیں پورے صوبۂ بنگال کا تقسیم سے پہلے انتظام کرنا پڑتا تھا وہاں دوسرا مقصد یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے لیے ایک ایسا صوبہ پیدا کر دیا جائے جس میں انکی



آواز سب پر غالب ہو۔''[2]

اخبار اسٹیٹسمین نے اس مقصد کو یوں ظاہر کیا تھا کہ:

''مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی ایک ایسی طاقت کی پرورش کی جائے جو امید ہے کہ ہندو فرقہ کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت کو روک سکے گی۔''[3]

چونکہ اس فیصلہ کا مقصد مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا تھا لہٰذا پورے ملک کے ہندو اس فیصلہ کے خلاف ہوگئے۔مولانا آزاد کی سیاست کی شروعات اسی زمانے میں ہوئی اور انھوں نے سیاست میں پہلا قدم تقسیم بنگال کی مخالفت میں ہندوؤں کا ساتھ دے کر رکھا۔سیاسی کارروائیوں کی شرعات ہی مولانا نے عام مسلمانوں کے مفاد کے خلاف چلائی جانے والی تحریک کی حمایت سے کی۔اروندو گھوش اور شیام سندر چکرورتی اس تحریک کے روح رواں تھے اور تقسیم بنگال کے خلاف ہندوؤں کی قیادت کر رہے تھے۔مولانا نے سیاست کا پہلا سبق انہیں لوگوں سے سیکھا۔

''اروندو گھوش کلکتہ آ گئے اور وہ تقسیم کے خلاف تحریک کا مرکز بن گئے۔مولانا ایک دو بار ان سے ملے۔ان کے خیالات میں حیرت انگیز تبدیلی آ گئی اور وہ انقلاب پسندوں میں شامل ہونے کے لیے کمر کسنے لگے۔اس زمانے میں زیادہ تر ہندو ہی اس تحریک میں شامل تھے اسی زمانے میں مولانا کی ملاقات مشہور انقلاب پسند شیام سندر چکرورتی سے ہوئی۔''[4]

اس تحریک سے چونکہ مسلمانوں کا نقصان ہونا تھا لہٰذا زیادہ تر ہندو ہی اس تحریک میں شریک تھے اور کوئی مسلمان اس میں شریک نہ تھا لہٰذا جب مولانا کی ملاقات انتہا پسندوں سے ہوئی جو یہ تحریک چلا رہے تھے تو انھیں بڑا تعجب ہوا کہ ایک مسلمان وہ بھی مولوی ہمارا حامی کیسے ہوسکتا ہے۔ایک زمانے تک ان لوگوں نے مولانا کی نیت پر شک کیا اور ان پر اعتماد نہ کیا گیا۔

''انھوں نے (شیام سندر چکرورتی نے) مولانا کو دوسرے انقلاب

پسندوں سے متعارف کیا۔ پہلے تو وہ مولانا پر کامل اعتماد نہیں کرتے تھے لیکن بعد میں مولانا ان کے خاص ممبروں میں گنے جانے لگے۔''۵؎

مولانا آزاد الہلال (جو بنگالی ہندوؤں کی مدد سے نکالا جارہا تھا) میں مسلمانوں کو خوب خوب لتاڑ پلائی کہ مسلمان تقسیم بنگال کے حامی کیوں تھے انھیں تو اس ایجیٹیشن میں شامل ہونا چاہیے تھا جو کانگریس اس تقسیم کو ختم کرنے کے لیے چلا رہی تھی۔ سرسید نے مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی کے نام سے ایک رزولوشن محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس سے پاس کرایا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ مسلمان تعلیم حاصل کریں اور کسی بھی پولیٹیکل ایجیٹیشن میں شامل نہ ہوں یہ پالیسی مسلمانوں نے پسند کی تھی اور مسلمان سیدھے ترقی کے راستے پر بڑھتے چلے جارہے تھے کہ مولانا آزاد نے بنگالی ہندوؤں کی شہ پر مسلمانوں کو اس متفقہ پالیسی سے ہٹنے کی تلقین قرآن وحدیث کو استعمال کرکے کی۔

''مسلمانوں میں نئی حرکت کی تاریخ تقسیم بنگال کی منسوخی سے شروع ہوتی ہے اس سے پہلے صرف خال خال اشخاص تھے جن کو کانگریسی باغی بے وفائے قوم مفسد اور اسی طرح کی بعض اصطلاحات خاص سے یاد کیا جاتا تھا مگر قوم کی قوم صرف اس شریعت پر عامل تھی کہ لیڈروں کی گاڑی کھینچے............ یہاں اس پر اجماع ہوگیا تھا۔ مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی پر میجارٹی کا سواد اعظم تھا۔ من شد شد فی النار۔''۶؎

مسلمانوں کے سواد اعظم پر مولانا آزاد نے زبردست چوٹ لگائی اور بنگالی کانگریسیوں کی اینٹی مسلم تحریک میں شمولیت اختیار کرکے ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست میں منافقانہ سیاست کی داغ بیل ڈالی جس پر دیوبندی علماء کے ایک گروپ نے لبیک کہا۔
پروفیسر مشیر الحق مولانا کی اینٹی مسلم تحریک میں شمولیت کا اعتراف کرتے ہیں:

THUS AZAD, A PRODUCT OF A FAMILY IN WHICH EVERY TRADITION WAS TO BE ACCEPTED WITHOUT QUESTION, BECAME SO RADICAL IN POLITICS AS TO ASSOCIATE HIMSELF WITH ONE



OF THE IMPORTANT REVOLUTIONARY (HINDU) LEADERS OF BENGAL. GRADUALLY AZAD BECAME SO MUCH IMPRESSED BY THE ACTIVITIES OF REVOLUTIONARIES THAT HE ACTUALLY JOINED THE PARTY.IT WAS A DIFFICULT TASK FOR HIM BECAUSE THE REVOLUTIONARIES WERE EXCLUSIVELY HINDUS AND ACTIVELY ANTI-MUSLIM.
(MUSHIRUL HAQUE: MUSIM POLITICS IN MODERN INDIA, P.69)

○

**حواشی:**

(۱) عرش ملسیانی، ابوالکلام آزاد، ص:۲۷
(۲) راجیندر رپرشاد: ہندستان کا مستقبل، ص:۲۱۹
(۳) عرش ملسیانی، ابوالکلام آزاد، ص:۲۸
(۴) ایضاً، ص:۲۸
(۵) ایضاً، ص:۲۲
(۶) الہلال ۲۶ر فروری ۱۹۱۳ء، ص:۱۲۶

# مسلم یونیورسٹی تحریک سے دشمنی

ہندوستانی مسلمانوں نے اپنی ہزار سالہ تاریخ میں جتنا اہم کام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا قیام کر کے کیا اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔مغلوں کی سلطنت کے زوال کے بعد ملک میں مسلمانوں کی بقا کا مسئلہ درپیش تھا۔انگریزوں کی مخالفت میں مسلم علماء اور دیگر قائدین محض جذباتی اور مستقبل سے بے پروا ہو گئے تھے۔انہیں قطعاً بھی علم نہیں تھا کہ دنیا کس راستہ پر چل رہی ہے۔جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیات نے مغرب کے انسان کے ہاتھ میں کیسے کیسے خطرناک ہتھیار اور اقتصادی طاقت دے دی ہے۔ان سب کا مقابلہ مسلمان نعروں اور فتوؤں سے کرنا چاہتے تھے۔اسلام کی واضح علم دوستی کے باوجود مسلمانوں نے اپنے اوپر تمام علوم کے دروازے بند کر لیے تھے اور جو کچھ ان کے بزرگوں نے اپنے دور میں نصاب تعلیم بنایا تھا اسی کو حرف آخر سمجھ کر اپنی دانست میں دنیاوی ترقیات کا راستہ دریافت کر لیا تھا۔حیرت کا مقام ہے کہ حالانکہ سب سے پہلے مسلمانوں نے چھاپہ خانے کی شروعات کی لیکن یہ فن مسلم ممالک میں ختم ہو گیا اور یورپ میں اس کی ترقی ہوئی۔الجبرہ، علم فلکیات، کیمسٹری اور اناٹمی وسرجری میں مسلم عالموں کی فتوحات اظہر من الشّمس ہیں لیکن ابتدائی دور کے بعد ملت کا رجحان مفید علوم سے ہٹ کر فقہی وفروعی مسائل میں الجھ کر رہ گیا۔یہ علوم یوروپ میں پہنچ کر مغربی اقوام کی اقبال مندی کا سبب بن گئے۔مسلمانان عالم اپنے بزرگوں کی سائنسی فتوحات سے بے خبر ایسے مسائل میں پھنس کر رہ گئے کہ آج تک ان کا ذہن مجموعی طور سے مفید علوم کی طرف متوجہ ہونے پر تیار نہیں ہے۔آج یہ حالت ہے کہ صرف اسرائیل میں جتنے سائنٹسٹ اور انجینئر ہیں پورے عالم اسلام میں اتنے ٹیکنوکریٹ اور سائنٹسٹ نہیں ہیں۔

ہندوستان کے پورے مسلم دور میں کسی علمی اور تحقیقی مرکز یا یونیورسٹی کے قیام کا پتہ نہیں



چلتا۔حتیٰ کہ اکبر اعظم کو جب انگریزوں نے چھپی ہوئی بائبل کا تحفہ دیا تب بھی کسی کو یہ خیال نہیں آیا کہ چھاپہ خانہ ہندوستان میں بھی رائج ہو۔اکبر کے بعد بھی ایک زمانے تک ہندوستانی مسلمان چھپائی جیسے بنیادی اور اہم فن سے نا آشنا رہے۔تقریباً تمام ہی مسلمان بادشاہوں کی خدمت میں یورپین مصنوعات جیسے گھڑیاں، کپڑا وغیرہ پیش کئے جانے کے واقعات ملتے ہیں لیکن ان سب کے باوجود بھی کسی دانشور کو ان چیزوں کو ہندوستان میں بنانے کا خیال تک نہ آیا۔انگریزوں کے ہندوستان فتح کرنے کی سب سے بڑی وجہ ان کا اسلحہ میں زیادہ ترقی یافتہ ہونا تھا۔اس کے علاوہ ان کا رسل ورسائل کا انتظام بہت زیادہ ترقی یافتہ تھا۔مسلم دور میں خبریں گھوڑسوار ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے تھے اور انگریزوں نے برقی تار کے ذریعہ خبریں پہنچانے کا انتظام کر لیا تھا۔ہندوستان کی حکمرانی سے مسلمانوں کی بے دخلی کی سب سے اہم وجہ ان کی تحقیق اور سائنس سے ناواقفیت تھی۔انگریزوں کی حکمرانی قائم ہو جانے کے باوجود مسلمان اس راز سے ناواقف رہے اور پہلی کی ہی طرح مفید علوم سے بیزار رہے بلکہ اب اس بیزاری نے نفرت کی صورت اختیار کر لی تھی۔

اس کے برخلاف زمانہ ساز ہندوؤں نے اس تبدیلی کو خوش آمدید کہا اور انگریزوں کے علوم سیکھنے میں بہت تیزی دکھائی۔بربادی مسلمانوں کی قسمت بن گئی۔غدر ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمان اور برباد کر دیے گئے مگر ان تباہیوں کی اصل وجوہات کو سمجھنے والا اور سمجھ کر اس کا علاج کرنے والا پوری قوم میں کوئی نہ تھا۔سرسید کی عظمت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ انھوں نے مسلم قوم کی بربادیوں کی اصل وجوہات کا پتہ لگایا۔نہ صرف پتہ لگایا بلکہ ان وجوہات کو دور کرنے کا بیڑا اٹھایا۔شروع میں بہت زیادہ مخالفت کا سامنا کرنا پڑا مگر رفتہ رفتہ مخالفت کم ہوتی گئی اور سرسید کی فہم وفراست کا زمانہ قائم ہوتا گیا۔سرسید کی کوششیں رنگ لائیں اور ہندوستانی مسلمان ایک بار پھر زندہ وتابندہ قوم بن گئے مگر یہ کوششیں پوری طرح کامیاب نہ ہو سکیں۔اس کا سبب مذہبی علماء کا مخالف ہونا تھا۔اسی طبقۂ فکر سے تعلق رکھنے والے کچھ لوگوں نے سرسید کے انتقال کے بعد جب کہ پوری مسلم قوم علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کی تحریک چلا رہی تھی ایک بار پھر اسلام کا نام لے کر اس تحریک کو ختم کر دینا چاہا۔اس نئے قافلے کے روح رواں علامہ شبلی اور مولانا آزاد تھے بلکہ یہ قافلہ دوبارہ سے

مولانا آزاد نے ترتیب دیا اور انھیں کی کوششوں سے قوم پرور مسلمانوں کا ایک ایسا گروہ تیار ہوگیا جو یونیورسٹی بننے کے خلاف تھا۔ اب کی بار اس گروہ کی حمایت میں کانگریس کی پوری طاقت تھی۔ یہ ذکر پہلے ہی آچکا ہے کہ مولانا آزاد نے سیاست میں پہلا قدم مسلم مفاد کے خلاف تنسیخ تقسیم بنگال کی تحریک کی پرزور حمایت کر کے رکھا۔ اسی سبب سے تنسیخ تقسیم بنگال کے بعد بنگالی کانگریسیوں نے مولانا کے الہلال کے اجرا میں ہر طرح مدد بہم پہنچائی۔ اس کا دوسرا سبب بنگالی کانگریسیوں کے سرسید مخالف جذبات تھے جو قیام کانگریس کی شروعات میں سرسید کی مخالفت اور خاص طور پر بنگالی کانگریسیوں کی مخالفت کی وجہ سے بہت زیادہ بڑھ گئے تھے مثال کے طور پر ہم یہ اقتباس پیش کر رہے ہیں جو سرسید کی کانگریس مخالف لکھنؤ کی مشہور تقریر سے لیا گیا ہے۔

> ''اگر مقابلہ کا امتحان جاری ہو تو غور کرنا چاہیے کہ ملک کا کیا نتیجہ ہوگا؟ تمام قومیں نہ صرف مسلمان بلکہ تمام ہندو اس ملک کے معزز راجہ اور بہادر راجپوت جن کو اپنے باپوں کی تلواریں یاد ہیں ایک بنگالی کو جو چھری کو دیکھ کر کرسی کے نیچے گر پڑے گا اپنے اوپر حاکم دیکھیں گے۔ ملک کے انتظام کا کیا حال ہوگا؟ کیا آپ کے نزدیک راجپوت اور پر جوش پٹھان جو پھانسی یا پولیس کی تلوار یا فوج کی سنگین سے ڈرتے نہیں وہ بنگالیوں کے نیچے امن سے رہ سکتے ہیں؟''[1]

یہ ذکر تفصیل سے پہلے ہی آچکا ہے کہ سرسید کی کانگریس مخالفت کی وجہ سے بنگالی سرسید سے بہت زیادہ ناراض تھے اور ان کے اخبارات و رسائل سرسید کے لیے مخالفانہ مضامین سے بھرے رہتے تھے۔ مولانا آزاد کا خود کانگریسیوں سے رابطہ قائم کر کے ان کے لیے کام کرنا دراصل ایک ایسا عظیم تحفہ تھا جو بنا مانگے مل گیا تھا۔ یہ علم ایک بہت بڑا ذریعہ مسلمانوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے لیے بن سکتا تھا سو مولانا آزاد نے اس علم کو اپنے مقاصد کے لیے جو درحقیقت کانگریس کے مقاصد تھے بے دریغ استعمال کیا۔ مولانا تو ذاتی طور سے ہی فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ اصل فائدہ تو کانگریس کو ہونا تھا۔ یہ سودا اس قیمت پر کچھ مہنگا نہ تھا۔ مولانا پر قرآن و حدیث کو بے دریغ استعمال کرنے کا الزام ثابت کرنے کے لیے



کچھ زیادہ کوششیں کرنے کی ضرورت نہیں ہے صرف آنکھیں اور دماغ کھول کر الہلال کے مضامین پڑھنے کی ضرورت ہے باقی تمام معاملات خود بخود صاف ہو جاتے ہیں۔

## خدا کو بھی ہار مان لینی پڑے؟

مارچ ۱۹۱٦ء کے البلاغ کی اشاعت میں مولانا آزاد نے ایک مضمون ''افسانۂ زلف یا مسلم یونیورسٹی'' کے عنوان سے شائع کیا یہ مضمون مولانا کی یونیورسٹی کے تئیں نفرت اور خدا و رسول کی تعلیمات کے غلط اور بے جا استعمال کا ایک نادر نمونہ ہے۔ ہمارے پاس وہ الفاظ نہیں جن سے کہ اس مضمون کی زبان اور دلیلوں کا جواب دے سکیں۔ قارئین خود فیصلہ کریں کہ آیا کوئی انسان جو ذرا بھی شرافت اور مسلمانوں کے لیے ہمدردی کا جذبہ رکھتا ہے۔ ایسا مضمون سپرد قلم کر سکتا ہے؟

مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے حکومت کا مطلوبہ روپیہ جمع کر لیا تھا اور یونیورسٹی کے معاملات پر اس کی قانونی پیچیدگیوں اور دوسری تفصیلات پر بحث و تمحیص کرنے اور یونیورسٹی چارٹر کو زیادہ سے زیادہ فائدہ مند بنانے کے لیے کمیٹی کی میٹنگیں ہوا کرتی تھیں۔ مولانا اس مضمون میں اپنی رائے کا اظہار فرما رہے ہیں ملاحظہ کریں کہ خدا اور کمیٹی کو مولانا نے کس طرح برابری عطا فرمائی ہے۔

> ''اس سلسلہ میں سب سے پہلے وہ زمانہ یاد آتا ہے کہ جب پہلے پہل مسلم یونیورسٹی کے متعلق دنیا نے معلوم کیا کہ جن امیدوں اور ولولوں میں ان کو مبتلا کیا گیا تھا ضروری نہیں کہ اصلیت ویسی ہی ہو۔ اس زمانے میں الہلال نیا نیا شائع ہوا تھا اس نے مسلسل چار اشاعتوں میں تعلیمی خبر کے اولین مراسلہ پر بحث کی اور مسلم یونیورسٹی تحریک اور اس کے دعاۃ وواعظین کے متعلق خصوصاً اور تمام قومی تحریکوں اور جماعتی کاموں کے متعلق عموماً ان افکار اسلامیہ اور عقائد صحیحہ کا اعلان کیا جن کی صداؤں سے سرزمین ہند کی اسلامی آبادی اب تک آشنا نہ ہوئی تھی۔''[2]

البلاغ میں مسلم یونیورسٹی اور اسلامی عقائد کا مقابلہ مولانا نے جا بجا کیا ہے۔ یہ عجیب وغریب منطق نا قابل فہم ہے۔

فاؤنڈیشن کمیٹی کا پہلا اجلاس لکھنؤ میں ہوا، اس میں یہ رزولوشن پاس ہوا کہ ایک کمیٹی ۲۶ اشخاص کی بنائی گئی اور اس کو پورا اختیار اس کے رد وقبول کا دے دیا گیا...... دوسرا اجلاس علی گڑھ میں کیا گیا۔ خاص علی گڑھ میں جلسہ کر کے یقین کر لیا گیا کہ ہمارے دار الخلافہ کے اندر آ کر باہر کی کوئی جماعت کامیاب نہیں ہوسکتی۔ انھوں نے گمان کیا کہ ہمارے قلعہ کی عمارتیں اللہ کی طاقت کو آنے سے روک دیں گی۔ **فاتاھم اللہ من حیث لم یحتسبو**۔ پس خدا ایسے راستہ سے آیا جہاں سے ظہور طاقت کا انھیں گمان بھی نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے حصار ولشکر کے اندر جلسہ کر کے بھی وہ نا کام رہے اور کلمہ حق کی ہیبت اس طرح ان کے دلوں پر چھا گئی کہ باوجود کمال جد وجہد کے کچھ بھی نہ کر سکے۔'' ۳؎

قرآن کی آیت شاید اسی جلسہ کے لیے نازل ہوئی تھی اور کمیٹی کے ممبران بقول آزاد یہ سمجھ رہے تھے کہ اللہ کی طاقت علی گڑھ نہیں آسکتی۔ مولانا فاؤنڈیشن کمیٹی کی سرگرمیوں اور کاوشوں کو خدا کی طاقت کے خلاف چیلنج بتاتے تھے کہ یونیورسٹی بنانا اللہ کی طاقت سے جنگ کرنی ہے اور اللہ سے کوئی کیسے جیت سکتا ہے کمیٹی مولانا کے نزدیک خدائی کے خلاف سازشوں کا مرکز تھی اور یہ گروہ خدا کے خلاف محاذ آرائی کر رہا تھا۔ فرمایا:

''اب دس اپریل کو پھر فاؤنڈیشن کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد کیا گیا ہے اور یہ لوگ تین سال کے متواتر اور مسلسل تجربہ کے بعد اب پھر اٹھے ہیں کہ خدا کو اور اس کے کلمۂ حق کی قوت کو ایک بار اور آزمالیں۔ یہ محض فاؤنڈیشن کمیٹی کا مجمع ہی نہیں ہے بلکہ ان کوششوں اور تدبیروں کی انتہا ہے جو مشیت الٰہی کے مقابلہ میں انسانوں کا کوئی گروہ کرسکتا ہے۔ ان لوگوں نے سمجھا ہے کہ اگر ہم ایک مرتبہ آخری جانبازانہ



کوششوں کا سامان اور کرلیں گے تو خدا کو شکست دے دیں گے کیونکہ انسانوں کی طرح وہ بھی لڑتے لڑتے تھک جاسکتا ہے۔ اور اگر بہت زیادہ روپیہ بہت زیادہ سازشیں بہت زیادہ انسان اور بہت زیادہ انسانی تدبیروں کا مواد جمع کرلیا جائے تو کیوں نہ خدا کو بھی ہار مان لینی پڑے؟ چنانچہ مہینوں سے طرح طرح کے سامان کیے جارہے ہیں اور بڑے بڑے دعوے اور بڑے بڑے اعلانات سننے میں آرہے ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ اس آخری معرکہ کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔'' ۴؎

مولانا آزاد اگر خدا کی جگہ اپنا نام لکھ دیتے تو شاید بات میں کچھ جان پڑ جاتی اور محض دیوانے کی بڑ نہ معلوم ہوتی۔ ہوسکتا ہے کہ مولانا کے ذہن میں اپنا ہی نام رہا ہو اور خود کو خدا سمجھ لیا ہو۔ قرآن کی آیت کا استعمال ملاحظہ کریں۔

''یہ وہی حق اور باطل کی معرکہ آرائی ہے جو برسوں سے ہورہا ہے۔ یہ وہی اشخاص اور جماعت کے فوائد کی معرکہ آرائی ہے جس کا میدان عرصہ سے گرم ہے پس قریب ہے کہ حق ظاہر ہو اور کچھ دیر نہیں کہ جس کلمہ کے ساتھ اللہ کی مشیت وحکمت شامل ہے وہ اپنی آخری فتح مندی کا اعلان عام کردے۔...... (قرآن:۱۱:۱۳۳)

ترجمہ: اے لوگو تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کررہے ہیں اور پھر نتیجہ کا انتظار کرو ہم بھی انتظار کرنے والے ہیں۔ اور تمہارا پروردگار ان کاموں سے غافل نہیں ہے، جن میں تم لگے ہو۔'' ۵؎

## یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی: حق سے ٹکراؤ

یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے سلسلہ میں مولانا نے اپنے اخبارات الہلال والبلاغ میں کئی مضمون سپرد قلم کیے۔ یہ مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں یہاں الہلال میں شائع ایک مضمون کے اقتباسات پیش کررہے ہیں۔ اس مضمون میں مولانا نے کمیٹی اور حق کو جدا جدا اور ایک دوسرے کی ضد بتایا ہے۔ اپنے دعوے کی دلیل میں قرآن کی آیات پیش کی

ہیں۔علماء اس پر غور فرمائیں کہ کیا یہ آیات اس معاملے میں استعمال کی جاسکتی ہیں؟ مولانا سمجھتے تھے کہ راست بازی وحق گوئی آج دنیا میں مظلوم ہے اور کوئی نہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر فاؤنڈیشن کمیٹی کے ممبران کی مخالفت مول لے حالانکہ خدا ان کو آزمائے گا محض وعدوں سے کام چلنے والا نہیں ہے۔مولانا کمیٹی کو مسلمانوں کو گمراہ کرنے والا مجمع سمجھتے تھے۔فاؤنڈیشن کمیٹی نے ایک ڈیپوٹیشن حکومت سے گفت و شنید کرنے کے لیے بنایا تھا۔اس ڈیپوٹیشن کی ممبری سے مظہر الحق صاحب نے استعفیٰ دے دیا تھا۔کچھ آپسی اختلافات کی بنا پر یہ استعفیٰ دیا گیا تھا۔مولانا کو موقع ہاتھ آیا اور اس واقعہ کو بنیاد بنا کر فاؤنڈیشن کمیٹی کو ہدف ملامت بنایا۔

’’مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کے پچھلے اجلاس کے واقعات میرے لیے واقعی پر از اشکال تھے میں دیکھ رہا ہوں کہ زمانہ کس قدر پر آشوب ہے اور حق وراستی کی مظلومی کس درجہ درد انگیز حد تک پہنچ چکی ہے کوئی نہیں جو خدا کی خوشنودی کی خاطر اس کے چند بندوں کا غصہ جھیل لے۔‘‘[۶]

مولانا آزاد فاؤنڈیشن کمیٹی کو حق اور راستی کے خلاف جنگ کرنے والا ایک مجمع سمجھتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ اس کمیٹی کا ہر کام راست بازی کے خلاف ہے اور انھیں صدمہ تھا کہ کوئی بھی ایسا نہیں جو خدا کی خاطر ان سازش کرنے والوں کی مخالفت کرسکے۔خدا کو بمقابلہ کمیٹی رکھ کر مولانا مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ کرنا چاہتے تھے۔مولانا کمیٹی کو بے ایمان اور گمراہ خیال کرتے تھے۔اپنے گمراہ خیالات میں وہ اس قدر شدید تھے کہ مندرجہ ذیل قرآن کی آیت اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کی۔

’’جو لوگ دنیا سے تعریف و مدح مانگتے ہیں ان کو پہلے بتا دینا چاہیے کہ اس کے لیے انھوں نے کیا کھویا ہے۔‘‘ (قرآن: ۲۹:۴)

ترجمہ: کیا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ زبان سے ایمانداری وراستی کا دعویٰ کریں گے اور بغیر آزمائے ہوئے چھوڑ دیے جائیں گے (حالانکہ) جو لوگ ان سے پہلے گزر چکے ہیں خدا نے ان کو بھی آزمائش میں ڈالا



تھا (اور یہ ناگزیر عمل ہے) عنقریب خدا ان لوگوں کو معلوم کر کے رہے گا جو اپنے دعوئے صداقت میں سچے ہیں اور ان کو بھی جو اپنے اندر جھوٹ کے سوا کچھ نہیں رکھتے۔کیا جن لوگوں کی قوتیں اعمال بد میں خرچ ہو رہی ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے قابو سے باہر ہو جائیں گے۔‘‘[۷]

مظہر الحق نے اس کمیٹی سے ذاتی وجوہات کی بنا پر استعفیٰ دے دیا تھا۔مولانا نے اس خبر کو حق و باطل کی جنگ میں حق کی فتح سے تعبیر کیا۔ان کا خیال تھا کہ مظہر الحق نے صرف استعفیٰ ہی نہیں دیا ہے بلکہ حقیقی شان اسلامی کا نمونہ مسلمانوں کے سامنے پیش کیا ہے۔جس کی تمام ممبران کو پیروی کرنا چاہیے۔قرآنی آیت کو استعمال کر کے تمام ممبران سے فرمایا کہ وہ بھی استعفیٰ دے دیں یعنی کوئی پہلو مولانا نے فاؤنڈیشن کمیٹی کی مخالفت کا باقی نہ چھوڑا۔

’’مسٹر مظہر الحق نے مسلم یونیورسٹی کے ڈیپوٹیشن کی ممبری سے استعفیٰ دے دیا۔میں اپنے عقیدے اور اپنی بصیرت کے مطابق یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ انھوں نے استعفیٰ نہیں دیا ہے بلکہ سچائی اور راست بازی کی ایک مثال عظیم قوم کے سامنے پیش کی ہے...... خدا نے مومنوں کی سب سے بڑی خصلت یہ بتائی ہے کہ (**یعاھدون فی سبیل الله ولا یظلمون** ......(حق کی راہ میں جہد وسعی کرتے ہیں اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہیں کرتے) مجھ کو اعتراف ہے کہ مسٹر مظہر الحق نے اسی حقیقی مصلحت ایمانی کا نمونہ قوم کو دکھلایا ہے۔**وفی ذالک......المتنافسون** (اور یہی چیز ہے جس کی پیروی کرنے والوں کو پیروی کرنی چاہیے۔‘‘

اسی مضمون میں آگے دعا فرمائی کہ مظہر الحق کو اجر عظیم ملے اور ایسی ہی قوم پرستی کی مثالیں سامنے آئیں۔

’’نہیں سمجھتا کہ اس کے سوا اور کیا کہوں کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت جلیل وعمل عظیم کے لیے ان کو جزائے خیر دے اور اس وقت کو دکھانے میں

زیادہ دیر نہ کرے جب قوم پرستی اور راست بازی کی ایسی ہی مثالیں بکثرت قوم کے سامنے ہوں۔'' ۸

## حکومت کی بھیک اور جاہل مطلق لیڈران

اگست ۱۹۱۲ء کے الہلال میں مولانا کا ایک اور مضمون شائع ہوا۔ اس وقت یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی یونیورسٹی کی اندرونی خودمختاری کا مطالبہ کر رہی تھی اور حکومت کچھ شرائط پیش کر رہی تھی۔ یوں گفت وشنید کا سلسلہ جاری تھا اور کچھ تلخیاں پیدا ہوگئی تھیں۔ مولانا نے اس ماحول کا فائدہ اٹھا کر اپنے خیالات کا اظہار اس مضمون میں کیا کہ مسلم قوم چالیس سال تک حکومت کی بھیک پر پلتی رہی اور سیاسی جدوجہد کو جرم سمجھا اس لیے حکومت اس کی بات کیوں سنے۔

''جو قوم چالیس برس تک محض حکومت کی بھیک، دریوزہ گری پر زندگی بسر کرتی رہی جس نے ہمیشہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے انکار کردیا۔ جس نے ہر موقع پر سیاسی جدوجہد کو ایک جرم اور بغاوت سمجھا...... آج اسے کیا حق ہے کہ گورنمنٹ اس کی پرواہ کرے کیوں نہ اس کو ذلیل وخوار بنایا جائے۔'' ۹

مولانا کے نزدیک مسلمان چالیس برس تک بھیک پر بسر کرتے رہے یعنی تعلیم کے لیے جو کوششیں علی گڑھ تحریک کے ذریعہ کی گئیں وہ بھیک مانگنے سے مماثلت رکھتی ہیں...... سیاسی جدوجہد کو مسلمانوں نے کبھی جرم نہیں سمجھا ہاں کانگریس کے خطرناک عزائم کو مدنظر رکھتے ہوئے سرسید نے مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کا مشورہ دیا تھا اور اپنی جماعت الگ بنائی تھی۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان بہت بھولے بھالے ہیں اور انھوں نے ہمیشہ ہی اپنے لیڈروں کی بات مانی حالانکہ وہ قائدین جاہ پرست اور جاہل مطلق تھے اور انھوں نے کبھی بھی مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کا خیال نہیں کیا۔

''مسلمان تو ایک ایسی قوم ہے کہ شاید ہی دنیا میں انسانوں کا کوئی گلہ اتنا خوش عقیدہ اور تقلید دوست ہو...... لیکن بدبختی یہ ہے کہ ہم میں جو گروہ آج رہنمائی کی موٹر پر سوار ہے اور جس نے لیڈری کا تخت خود



ہی بچھایا ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی رسم تاجپوشی ادا کی ہے اس نے اپنی دنیوی عزت وشوکت اور جاہ ونمائش کا جوا کھیلنے کے لیے اپنی امت مظلومہ کو ایک بازیچہ بنالیا ہے...... مسلمانوں نے اپنے لیڈروں کی گاڑیاں کھینچی ہیں ان کی چیخ و پکار پر ہزاروں اور لاکھوں روپیہ نکال کر رکھ دیے ہیں۔ ان کے ہر حکم کو فرمان الٰہی سمجھ کر اپنا نصب العین بنایا ہے اور یہ سب کچھ ان جاہ پرست جاہل مطلب اور عبدۃ الحکام لیڈروں کے ساتھ کیا ہے جنھوں نے ایک لمحے کے لیے بھی ان کو فائدہ پہنچانے کا خیال نہیں کیا۔'' ۱۰

مولانا محسن الملک، آغا خان، محمد علی جوہر سے بہت زیادہ حسد کرتے تھے جن لوگوں کو جاہل مطلق اور جاہ پرست مولانا فرما رہے ہیں مولانا زندگی بھر بھی ان کے پاسنگ برابر بھی نہ ہوسکتے تھے اگر مسلم مفاد کے خلاف بول کر ہندوؤں کی حمایت حاصل نہ کرتے۔ تعجب تو یہ ہے کہ آج الہلال کے سارے زمانے میں چرچہ ہے تمام مسلم دانشوران اس کی تعریفوں میں رطب اللسان رہتے ہیں یہ مولانا کا ہی جاری کیا ہوا طریقہ ہے کہ مسلمانوں کو برا کہو اور ہندوؤں کی حمایت کرکے بڑے بڑے عہدے حاصل کرو۔ لہٰذا مولانا کانگریس کے صدر بنائے گئے اور نئی تعلیم اور سائنس و انگریزی علوم سے مطلق ناواقفیت کے باوجود وزیر تعلیم بنائے گئے کہ اصلی کام تو آئی اے ایس سکریٹریز کو کرنا ہوتا ہے وزیر تو محض انگوٹھا لگاتا ہے۔

''خیر تو یہ ایک داستان مسلسل ہے جس کو کسی دوسرے وقت کے لیے اٹھا رکھنا چاہیے۔ لیکن مسلم یونیورسٹی کے شوراشوری کی بے نمکی میں ہمارے لیے ایک موثر سبق ہے۔'' ۱۱

انھیں وجوہات کی بنا پر مسلم یونیورسٹی میں ہمیشہ مولانا آزاد کو اچھے ناموں سے یاد کیا جاتا رہا ہے۔

''ہم یہ پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیڈروں کو اب گورنمنٹ کی شکایت کرنے کا کیا حق ہے؟ کیوں وہ مسلمانوں کی امیدوں کا لحاظ

کرے؟ کیوں وہ اپنے دروازے کے ایک دریوزہ گر کو جس نے
ہمیشہ چھوڑی ہوئی ہڈیوں اور روٹی کے باسی ٹکڑوں کو آنکھوں سے
لگا کر کشکول میں ڈال لیا ہوا اور اتنی ہی فیاضی پر خوش ہو کر اپنے معطی
کو حاتم وقت بتلایا ہو آج اتنی فیاضی کو بھی مصلحت کے خلاف دیکھ کر
جھڑک نہ دے۔''۱۲؎

کوئی کہہ سکتا ہے کہ چچوڑی ہوئی ہڈیاں اور باسی روٹی کے ٹکڑے مولانا اور ان کے ہم نواؤں نے ضرور چنے اور کانگریس نے آزادی کے بعد ایجوکیشن منسٹری مولانا کے کشکول میں ڈال دی۔ مولانا نے اس کو سر اور آنکھوں پر لگایا اور مسلم قوم ماری کاٹی جاتی رہی، ذلیل کی جاتی رہی، ایسے وقت میں خاموش رہنے کے صلے میں ان کو سنگیت ناٹک اکیڈمی اور للت کلا اکیڈمی وغیرہ کا سرپرست بنایا گیا۔

''اب شاید لکھنؤ میں کوئی جلسہ کیا جائے گا ہمارے ایک دوست (جو
یونیورسٹی کمیٹی کے ممبر بھی ہیں) کہنے لگے کہ گورنمنٹ کے اس حکم پر
اب عام اَجیٹیشن کیا جائے گا۔ اللہ اللہ اب مسلمانوں کے دشمنوں کو
بھی اَجیٹیشن کی تعلیم دی جاتی ہے اور ہاں اب شاید (اطیعو اللہ
واطیعوالرسول) کی آیت قرآن سے نکال دی گئی اور سب سے زیادہ
یہ کہ وہ چالیس برس کی ''مسلمہ قومی پالیسی'' بزرگ سرسید کی پولیٹیکل
شاہراہ، قومی جدوجہد کی بے خطر راہ وغیر ہو غیرہ من الخرافات کے
پر از حکمت گوناگوں مصالح بوقلمون اسباق کیوں بھلا دیے گئے؟ یہ کیا
بدعت سیئہ کفر و ذلالت صریح ہے جسکی ملت بیضا مصلحین مرتکب
ہو رہی ہے؟ یہ تو ہمسایہ قوم کے باغیانہ اعمال تھے جن سے مسلمانوں
کی قوم من حیث القوم الحمدللہ ہمیشہ مجتنب رہی اوا گر کبھی کسی شرذمۂ
قلیل کو ہندوؤں کی چالاکیوں نے گمراہ کیا بھی تو مسلمان لیڈروں
نے ان کی اصلاح کر دی۔''۱۳؎

مولانا کے نزدیک ہندو ہی ملک کی مجاہد قوم تھی اور مسلمان انگریزوں کی وفاداری کی وجہ سے



سیاسی جدوجہد کے میدان سے الگ رہے۔ یہ باغیانہ اعمال صرف ہندو ہی کر سکتے تھے۔ مولانا طنز فرما رہے ہیں کہ اب کیوں مسلمان اَجیٹیشن کی راہ اپنا رہے ہیں یعنی اگر مسلمان اپنے کسی جائز مطالبے کے لیے اَجیٹیشن چلائیں تو وہ درست نہیں کہ پہلے کیوں ایسا نہیں کیا تھا۔

### شیعہ کالج لکھنؤ

مولانا آزاد نے شیعہ کالج کے قیام کی بہت عجیب ڈھنگ سے مخالفت کی ہے۔ پہلی یہ کہ علی گڑھ اور شیعہ کالج کے درمیان اختلاف بڑھانے کی کوشش کی دوسرے یہ کہ انگریزوں کا ساتھ لیے جانے کی مخالفت کی۔ فروری ۱۹۱۶ء کے البلاغ میں ایک مضمون ''شیعہ کالج'' کے عنوان سے شائع کیا۔ اس میں شروع میں اتحاد بین المسلمین پر زور دیا اور آخر میں فرمایا:

''یہ ہیں میرے عقائد، یہ ہے میرا مسلک اور یہ ہے وہ بصیرت راسخہ
جو کتاب وسنت نے مجھے عطا فرمائی ہے اسی بصیرت نے مجھ کو ہمیشہ
فریقانہ نزاعات سے الگ رکھا اور وہی آج مجھ کو مجبور کرتی ہے کہ اپنے
عزیزوں اور بھائیوں کے آگے جنھوں نے اپنی مصلحت پر غیروں
کے مقاصد کو ترجیح دی ہے دشمنوں کی طرح نہیں بلکہ دوستوں کی طرح
............ مجوزہ شیعہ کالج کے طرز و اسلوب کار سے اپنا اختلاف پیش
کروں۔''۱۴؎

۲۵ رفروری ۱۹۱۶ء کو پھر ایک مضمون ''شیعہ کالج'' کے عنوان سے البلاغ میں شائع کیا جس میں ایک نئے پہلو سے شیعہ کالج کے قیام کی مخالفت کی اور علی گڑھ اور شیعہ کالج کے بانیوں میں تفرقہ کا بیج بونے کی کوشش کی۔ اس مقصد کے لیے سرسید کے ایک بڑے مرکز تعلیم کے نظریہ کا سہارا لے کر علی گڑھ تحریک سے وابستہ حضرات شیعہ کالج کی مخالفت کی تلقین کی۔ اس مضمون کے شروع میں سرسید کی اس پالیسی کی مخالفت کی ہے کہ مسلمان صرف تعلیم کے ذریعہ ہی ترقی کر سکتے ہیں۔

''ان لوگوں نے اپنی تقلید کا ایک نیا بت بنایا ہے اس کا نام رکھا ہے
''سرسید کی پالیسی'' یونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لیے ایک
مخصوص بت ہوتا تھا۔ لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بت بنایا

ہے اور اس کے اختیارات اس قدر وسیع ہیں کہ علم وعمل کا کوئی گوشہ اس سے خالی نہیں۔ یہ کہتے ہیں کہ ہم سرسید کی پالیسی سے سرمو تجاوز نہ کریں گے اور مسلمان صرف وہی ہے جو سرسید کی پالیسی پر نہ صرف ایمان مجمل بلکہ ایمان مفصل کا اقرار کرے۔''۱۵؎

''مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ'' کے عنوان سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک رزولوشن سرسید نے پاس کروایا تھا جس میں مسلمانوں کی قسمت کو تعلیمی ترقی سے وابستہ کیا گیا تھا۔ مولانا نے اس میں اتنا اضافہ اور کردیا کہ اس رزولوشن میں یہ تھا کہ مسلمانوں کی ترقی جب تک کہ وہ متفرق تعلیمی کوششوں کو ترک نہ کردیں گے ناممکن ہے۔

اس رزولوشن کو بنیاد بنا کر مولانا نے علی گڑھ والوں کو للکارا کہ اب جب کہ لکھنؤ میں شیعہ کالج بن رہا ہے تم اس کی مخالفت کیوں نہیں کررہے ہو؟ سب گونگے اور بہرے کیوں بن گئے؟

''سرسید مرحوم کی پالیسی کا اس بارے میں یہ حال تھا کہ انھوں نے پہلی لکھنؤ کانفرنس اور نیز میرٹھ کانفرنس میں خاص رزولوشن پیش کیے کہ جب تک مسلمان اپنی متفرق اور علیحدہ کوششوں کو ترک کرکے ایک مکمل تعلیمی مرکز نہیں بنالیں گے ان کی کشتی طوفان ہلاکت سے نہیں نکلے گی چنانچہ انھوں نے اس رزولوشن کا نام ''مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ'' رکھا............ میں پوچھتا ہوں کہ علی گڑھ پارٹی نے اس وقت اس کی مخالفت و اصلاح اور کلمۂ حق کے اعلان کے لیے کیا کاروائی کی ہے؟ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اس کا موضوع صرف تعلیم ہے مسئلہ تعلیم قوم کی اس یکسر ہلاکت و بربادی کے لیے کون سی صدا بلند کی ہے؟ یہ کیا کہ علی گڑھ کالج کی بستی کا ہر فرد یکسر بہرا گونگا بن گیا ہے۔ جیسا کہ سرسید نے نہیں بلکہ صاحب شریعت نے کہا ہے۔''**الساکت عن الحق شیطان اخرش** ''............اور یہ کون ہے جس نے تمام مصلحین قوم ماہرین فلسفۂ تعلیم ............کی زبانوں پر قفل لگادیے ہیں کہ کسی



کے حلق سے آواز نہیں نکلتی اور سب پر ہلاکت کی چپ اور موت کی خاموشی چھا گئی ہے؟ **اموات غیر احیاء ولا یشعرون** (قرآن:۱۶:۲۱)۱۶؎

آخر میں علی گڑھ پارٹی کو مولانا للکارتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمہارا مسلک مرکزیت کہاں ختم ہوگیا؟ اب کیوں خاموش ہو اور شیعہ کالج کی مخالفت کیوں نہیں کرتے۔ اس خاموشی کا جواب بھی مولانا کے پاس ہے،انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ کیونکہ انگریز گورنر شیعہ کالج کی حمایت کررہا ہے اس لیے یہ لوگ اس کی مخالفت نہیں کررہے۔ کیا خوب منطق ہے۔

''تمہارا مسلک مرکزیت کہاں گیا؟ تمہاری چہل سالہ محنت اکارت جارہی ہے تم کہاں چھپ گئے ہو؟ تمہارے امام معصوم کا مذہب ذبح کیا جارہا ہے تم کیوں نہیں بولتے؟ تم بھلا ان سوالات کے جواب کیا دو گے میں خود ہی حقیقت بے نقاب کیے دیتا ہوں......اصل یہ ہے کہ تمہارے صوبے کا سب سے بڑا حاکم اعلانیہ شیعہ کالج کی تحریک کا ساتھ دے رہا ہے یہ دیکھ کر تمہارے ہوش وحواس غائب ہوگئے ہیں اور سارے ڈر و ہیبت کے تمہاری جان نکلی جارہی ہے۔ تم دیکھتے ہو مگر بول نہیں سکتے، تم کہتے ہو کہ اگر ہم نے ذرا بھی زبان ہلائی تو عجب نہیں کہ ہم دربار شاہی سے مردود ہوجائیں۔''۱۷؎

یہ ہے مولانا کے تصور کی اڑان۔ ان کا ذہن عجائب روزگار تھا اور طرح طرح کے شاخسانے تراشتا رہتا تھا۔ خود ہی سوال قائم کیا اور خود ہی جو چاہا جواب لکھ دیا اور قرآن تو ہے ہی مولانا کی حمایت کرنے کے لیے۔

''آہ ایک انسان کے ڈرنے تمہاری روح پر ایسی ہلاکت طاری کردی ہے کہ تم اس چیز کو زبان سے نہیں نکال سکتے جس کو تمہارا دل کہہ رہا ہے، اے مست ایمانو! تم انسان سے ڈرتے ہو مگر افسوس کہ تمہارے دل سے خدا کا خوف اس طرح نکل گیا ہے جس طرح کبوتر اپنے گھونسلے سے نکل جاتا ہے۔**علی خون من فرعون** ......۱۸؎۔

یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر تم میرے مقابلے میں بالکل بے دست و
پا ہو جاتے ہو اور تمام دنیا دیکھ لیتی ہے کہ حق کس کے ساتھ ہے۔‘‘ ۱۹

## مسلمانوں کی گمراہی: تعلیم، مسلم یونیورسٹی اور مسلم لیگ

الہلال ستمبر ۱۹۱۲ء کی اشاعت میں مولانا نے ’’بنیادی گمراہی‘‘ کے عنوان سے ایک مضمون شائع کیا۔ یہ مضمون مولانا آزاد کی فکر کا آئینہ دار ہے کہ اس زمانے میں وہ کس انداز سے سوچتے تھے اور کن کن کاموں کو مسلمانوں کے حق میں مضر سمجھتے تھے۔ تعلیم اور مسلم یونیورسٹی تحریک کو بھی مولانا مضرت رساں سیاست پر قربان کر دینے کے حق میں تھے۔ جس انداز سے اور جن الفاظ میں وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے وہ ایک قابل توجہ بات ہے۔ مولانا ہندوؤں کو ملک میں کام کرنے والی اصلی جماعت سمجھتے تھے۔ سرسید کی تعلیمی تحریک اور بعد میں مسلم یونیورسٹی تحریک دونوں مولانا کی نظر میں اس لیے شروع کی گئی تھیں کہ مسلمان ہندوؤں سے علیحدہ رہیں یعنی مسلمان کانگریس میں شریک نہ ہوں۔

’’سب سے پہلے یہ ہوا کہ ملک میں کام کرنے والی اصلی جماعت یعنی ہندوؤں سے مسلمان الگ ہو گئے اور اس طرح عرصہ تک کے لیے ملکی مطالبات کی فتح یابی سے گورنمنٹ مطمئن ہو گئی اور ساتھ ہی یہ بھی ضروری تھا کہ ان کو بیکار نہیں بیٹھا چاہیے ورنہ بیکاری سے اکتا کر راستہ کی تلاش میں ضرور نکلیں گے۔ کوئی مشغلہ ایسا ہونا چاہیے جو عرصہ تک ان کو اپنے میں الجھائے رکھے اور اصلی کاموں کی طرف متوجہ ہونے کی فرصت نہ دے۔ تعلیم کو مسلمان پہلے ہی سے لیے بیٹھے تھے اسی لیے اعلیٰ تعلیم کے بال و پر پھیلا کر ایک ایسا الف لیلیٰ کا عجیب الخلقت پرندہ بنایا جو اپنے پر کھول دے تو سورج کو زمین پر جھانکنے کے لیے کوئی سوراخ نہ ملے۔‘‘ ۲۰

یعنی سرسید نے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت محسوس کر کے مسلمانوں کو اس کی طرف راغب کرنے کی جو کوشش کی اس کے پس پردہ یہ سازش تھی کہ مسلمان ہندوؤں سے الگ



ہو جائیں جو مولانا کی نظر میں کانگریس کے جھنڈے تلے حریت کی تحریک چلا رہے تھے۔ مولانا نے خیال ظاہر کیا کہ جس وقت ملک کی جائز آزادی کے مطالبات میں ہندو اپنا وقت و روپیہ خرچ کر رہے تھے مسلمان تعلیم کی ٹھنڈی لاش لیے پھر رہے تھے۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا تعلیم کے معنی سے ہی ناواقف تھے۔ ورنہ تعلیم کو ٹھنڈی لاش سے تشبیہ دینا کسی ناسمجھ آدمی کا ہی کام ہو سکتا ہے۔

’’قوم کی وہ قوتیں جو یقیناً زمانے کے قدرتی اثرات سے متاثر ہو کر ملکی تحریکوں میں صرف ہوتیں تمام تو صرف ایک اعلیٰ تعلیم کے شور و واویلا کے پیچھے مٹا دی گئیں اور جب کہ ہم سے ایک دیوار کے فاصلے پر ملک کی جائز آزادی، ملکی حقوق کے مطالبات کی سرگرمیوں میں ہمسایوں کے جذبات و امیال صرف ہو رہے تھے ہم اپنی کانفرنسوں، اپنے بڑے بڑے مجمعوں، اپنی شاندار تقریروں، اپنے قومی اخباروں کے صفحوں کے اندر صرف ایک افسانہ تعلیم کی سرد لاش اٹھائے پھر رہے تھے۔ قومیں اگر وطن پرستی کے نشہ میں چور تھیں تو ہم تعلیم کے خمار میں انگڑائیاں لیتے تھے ہمسائے اگر ملکی آزادی کے آفتاب کے نیچے کھڑے تھے تو ہمارے سر اور چہرے تعلیم کی شبنم سے بھیگ رہے تھے۔‘‘ ۲۱

ہمسائے یعنی ہندو مولانا کے نزدیک ملکی آزادی کے لیے لڑ رہے تھے اور مسلمان فقط تعلیم کے لیے کوشش کر رہے تھے۔ مولانا کو شاید یہ نہیں پتہ تھا کہ اس وقت ہندو یونیورسٹی بنائے جانے کی تحریک زور و شور سے چل رہی تھی اور ۱۹۱۶ء میں ہندو یونیورسٹی کا قیام عمل میں آ گیا۔ مولانا کے نزدیک وطن ایسے خدا کا درجہ رکھتا ہے جو خدائے وحدہ لاشریک سے بھی بلند تر ہے۔ مولانا کی کوشش تھی کہ مسلمان ہندوؤں کی قیادت میں ملک کو اپنا دیوتا بنا لیں اور پرستش کریں جیسا کہ وہ اسلامی توحید کو چھوڑ کر خود کرتے رہے۔

’’اعلیٰ تعلیم کی گرہ سلجھانے میں ہم نے چالیس برس سے زیادہ صرف کر دیے لیکن انسان جو سونے اور جاگنے دونوں کے لیے بنایا گیا ہے

ممکن نہیں کہ صرف سوتا رہے چالیس برس کے مرض النوم کے بعد اب خود بہ خود طبیعتیں کروٹیں لینے لگی ہیں۔ بالآخر تعلیم کے افسانے کی خواب آور قوت گھٹنے لگی اور مسلمان بھی اب اس افسانے سے اکتا گئے۔ یہ وہ وقت تھا کہ گورنمنٹ ہندوستان کے آنسو پوچھنے کے لیے رفاہی اسکیم کا رومال جیب سے نکال رہی تھی اور ملک میں ایک انقلاب ہونے والا تھا اس وقت ممکن تھا کہ مسلمان چالیس برس سونے کے بعد ہوشیاری کی آنکھیں کھولتے اور ہندوستان کی جاگنے والی قوم ہندوؤں کے ساتھ شامل ہو جاتے کیونکہ پرانے مشغلۂ تعلیم میں اب زیادہ دلچسپی باقی نہیں رہی تھی اور پولیٹیکل کاموں کا اسٹیج ملک بھر میں صرف کانگریس ہی تھا۔ پس ضرور ہوا کہ اب تبدیلی ذائقہ کے لیے کوئی نیا کھلونا ہماری گود میں ڈال دیا جائے۔ یہ کھلونا ہماری نئی ضلالت یا غفلت بیداری نما مسلم لیگ تھا۔'' [۲۲]

مولانا کی اکثر تقریروں میں چالیس سال ہونے یا گمراہی میں بسر کرنے کا ذکر بہت ملتا ہے۔ اکثر مولانا نے یہ لکھا ہے کہ چالیس سال کی غلط روی کے بعد اب مسلمانوں کو سنبھلنا چاہیے۔ یہ خاص توجہ کے لائق بات ہے۔ مولانا کی اس تحریر کے وقت سرسید کو علی گڑھ میں مدرسہ قائم کیے ہوئے تقریباً چالیس سال ہوگئے تھے۔ سرسید کے آخر دور میں مسلمانوں میں مکمل اتحاد تھا کہ سرسید کا بتایا ہوا راستہ بالکل درست ہے۔ یہ مولانا آزاد کا کارنامہ ہے کہ یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے خلاف انھوں نے آواز اٹھائی۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمان اب شاید ہندوؤں کی قیادت قبول کر لیتے کہ تعلیم کا نشہ اتر رہا تھا لیکن اب ان کو ایک نیا کھلونا دے دیا گیا اور وہ کھلونا مسلم لیگ تھا۔ ہندو مولانا کے نزدیک جاگنے والی اور کام کرنے والی قوم تھی کیونکہ انھوں نے کانگریس بنائی تھی وہ چاہتے تھے کہ مسلمان تعلیم کو چھوڑ کر ہندوؤں کے پیچھے چلنے لگیں۔ اپنا کوئی سیاسی تشخص اور وژن پیدا نہ کریں۔ مولانا نے تمام عمر ہندوؤں کی دولت کے بل بوتے پر اسی کام میں صرف کردی کہ مسلمان کہیں سیاسی طاقت نہ بن جائیں۔ مسلمانوں کو صرف ہندوؤں کے پیچھے چلنا چاہیے۔ اس مشن کی



حمایت میں قرآن کی دلیلوں سے ان کی ہر تحریر و تقریر پر رہتی تھی۔

''ہم کو سمجھایا گیا کہ آج سے تیس برس پہلے جو اسباب پالیٹکس سے الگ رہنے کے تھے آج پالیٹکس میں در آنے کے بعد بھی قائم ہیں اس سبق کہنہ کو پھر دہرا لو تعلیم کی کمی کی قلت، میجارٹی کا خلفشار، عناصر کی مسابقت۔ اس لیے اگر ملکی حقوق کے میدان میں آؤ گے تو ہم سایہ قومیں تم سے بازی لے جائیں گی۔ پس تمہاری سیاست یہی ہے کہ پہلے اپنے حقوق ہندوؤں کے مقابلے میں تو حاصل کرلو۔ انھوں نے اپنے غلبۂ تعلیم و تعداد سے تمہاری ترقی کی راہیں تم پر بند کردی ہیں اور تمہارے قومی حقوق چھین کر غصب کر لیے ہیں۔ اصل پالٹکس وہی ہے کہ ان راہوں کو ہمسایوں کے حملوں سے محفوظ کرلو۔'' [۲۳]

اس تحریر سے تیس سال پہلے کا عرصہ تقریباً وہی زمانہ ہے جب سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس کی سیاست سے دور رہنے کی تلقین کی تھی کہ مسلمان تعلیم میں کم ہیں، تعداد میں کم ہیں ان کے لیے کسی بھی ایجیٹیشن میں شریک ہونا خطرناک ہے۔ مولانا اس نظریہ کے بہت خلاف تھے وہ تو تعلیم ہی کے خلاف تھے اور سمجھتے تھے کہ ہندوؤں کی تعلیم میں پہل اور تعداد کا زیادہ ہونا کسی بھی طرح مسلمانوں کے لیے خطرے کا باعث نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو تو نہ تعلیم حاصل کرنی چاہیے اور نہ اقلیت ہونے سے ڈرنا چاہیے صرف آنکھیں بند کرکے کانگریس کی سیاست میں کود پڑنا چاہیے۔ یہ مولانا کی عجیب و غریب منطق ہے جس کا کوئی بھی حامی نہیں ہوسکتا۔ انھوں نے اتنی لمبی چوڑی تمہید کے بعد یہ ثابت کیا کہ مسلمان ہمیشہ ہی غلط راہ پر چلتے رہے۔ پہلے یہ کہ تعلیم میں چالیس سال ضائع کردیے اس کے بعد مسلم لیگ بنائی یعنی سیاسی شناخت کی بیکار کوشش کی اور اب اسی غلط راہ پر چلتے ہوئے مسلم یونیورسٹی قائم کرنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔ مولانا کے نزدیک یہ گمراہی کی آخری منزل تھی۔

''گزشتہ تمہید سے یہ دکھلانا مقصود تھا کہ ہمارا قدم جب کبھی اٹھا غلط راہ پر اٹھا۔ جس زمانے نے ہندوؤں کا ہاتھ پکڑا تھا اس کو ہماری رہنمائی سے انکار نہ تھا کسی نہ کسی طرح ہم بھی صحیح راہ پر چل نکلتے مگر ہمارے

لیڈروں نے ہمیشہ ہمارے سامنے کوئی نہ کوئی کھلونا ڈال دیا۔ جس کے مشغلے میں الجھ کر ہم کو اصلی کاموں کو اختیار کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی پہلے اعلیٰ تعلیم میں چالیس سال بسر کرادیے پھر جب اس سے اکتا گئے اور دیکھا کہ قابو سے باہر ہورہے ہیں تو مسلم لیگ کا طلسم کھڑا کر دیا۔ اسی زنجیر کی آخری کڑی مسلم یونیورسٹی کی تحریک تھی جو عین ایسے موقع پر شروع کی گئی جبکہ ملک کے در و دیوار سے تغیر وتبدل کی صدائیں اٹھنے والی تھیں...... اتنے طویل عرصہ کی غلط روی کے بعد اب شاید صحیح راستے کی تلاش شروع ہوجاتی لیکن مسلم یونیورسٹی کی ایک ایسی طول طویل داستان شروع ہوگئی جس کے پیچ در پیچ قصوں کو سنا کر اور ہر طرف سے کان بند کر دیے گئے۔'' ۲۴

مولانا ہندوؤں کو صحیح راہ پر گامزن سمجھتے تھے لیکن اس کی وجوہات پر انھوں نے شاید کبھی غور کرنے کی زحمت نہیں کی۔ کوئی بھی قوم بغیر تعلیم حاصل کیے ہوئے کسی بھی طرح کی کوشش نہیں کر سکتی۔ ہندو ۱۸۱۶ء سے بھی پہلے سے تعلیم کی طرف متوجہ تھے اور مسلمان سرسید کی کوششوں سے ۱۸۷۵ء میں کچھ کچھ تعلیم میں دلچسپی لینے لگے تھے مگر یہ بھی مولانا آزاد جیسے لوگوں کو گوارا نہ تھا اور وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان کسی طرح یہ راستہ چھوڑ دیں۔ کانگریس ہندوؤں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بنائی اور مسلم لیگ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ نے بنائی۔ اگر مولانا مسلمانوں کے ہمدرد ہوتے تو تعلیم سے نہ روکتے بلکہ اس کے لیے کوشش کرتے۔

## انفاق فی سبیل الشیاطین (شیطان کے راستے میں خرچ کرنا)

پہلی جنگ عظیم میں ترکی جنگ میں ملوث تھا۔ خلافت عثمانیہ کا آخری دور تھا۔ مسلمان خلافت عثمانیہ کی بقا میں بہت زیادہ دلچسپی رکھتے تھے۔ مولانا آزاد کو ایک نادر موقع مسلم یونیورسٹی تحریک کی مخالفت کا ہاتھ آیا۔ حکومت کی عائد کردہ شرط تھی کہ مسلمان پہلے تیس لاکھ روپیہ جمع کریں تو یونیورسٹی ان کو مل سکتی ہے۔ ترکی کے مسلمانوں کی مدد کے لیے بھی ہندوستان میں روپیہ جمع کیا جارہا تھا۔ مولانا کی رائے تھی کہ تیس لاکھ روپیہ جو یونیورسٹی کے لیے جمع کیا گیا



تھا اسی روپیہ کو مسلمانوں کی مدد کے لیے ترکی بھیج دیا جائے۔ دلیل ملاحظہ کریں:

''مسلمان اگر علی گڑھ یونیورسٹی پر اسلام کو ترجیح دیں اگر وہ یہ سمجھیں کہ اسلام کے دم سے علی گڑھ ہے مگر علی گڑھ سے اسلام کی زندگی نہیں ہے تو وہ اس وقت حفظ کلمۂ اسلام کے لیے بغیر کسی مشکل میں پڑے تیس لاکھ روپیہ کی شاندار مالی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔'' ۲۵

قائدین یونیورسٹی سے مولانا مخاطب ہونا ضروری نہیں سمجھتے تھے کہ ان کے دلوں کا حال مولانا کے اوپر بالکل واضح تھا۔ البتہ عام مسلمانوں سے ان رہنماؤں کے خلاف اپیل فرمائی۔

''میں ان لوگوں کے دلوں کی حالت جاننے کے لیے عام نظروں سے بہتر فراست رکھتا ہوں جو آج مسلمان ہند کی مسند رہنمائی و ریاست پر متمکن ہیں پس ان سے میرا خطاب نہیں اور نہ تخاطب سے کوئی نتیجہ حاصل۔ البتہ عام مسلمانوں سے التجا کرتا ہوں کہ اس وقت ہماری تیرہ سو برس کی عزت جو ڈوبنے کے قریب تھی ڈوب رہی ہے وقت تجویزوں اور دعوتوں کا نہیں ہے۔ اولین کام روپیہ کی اعانت ہے اور تیس لاکھ روپیہ آپ کے پاس فراہم شدہ ہے۔ پس یہ کیا بے غیرتی اور کیسی دل و روح کی موت ہے کہ زخمی ترکوں کی زبان سے العطش العطش کی چیخیں آرہی ہیں آپ کے پاس پانی کا ایک لبریز حوض موجود ہے مگر ان تشنہ کاموں کے پاس ایک قطرہ بھی نصیب نہیں۔'' ۲۶

## اللہ اور ملائکہ کی لعنت ہو یونیورسٹی پر

اس کمزور دلیل کو بنیاد بنا کر مولانا نے یونیورسٹی پر اللہ اور اس کے ملائکہ کی لعنت بھیجی۔ ایک معمولی ذہن رکھنے والا انسان بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ تیس لاکھ روپیہ سے کسی جنگ کے نقشہ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے یہ نہیں ہوسکتا کہ مولانا اس بات سے واقف نہ ہوں مگر مولانا کو تو بہر صورت یونیورسٹی بننے کی مخالفت کرنی تھی لہٰذا کی اور خوب جم کر کی۔ ایسا لگتا ہے کہ مولانا کو یونیورسٹی کی افادیت کا علم ہی نہیں تھا بلکہ وہ جان بوجھ کر اکثریت کو خوش کرنے کے لیے ایسا کر رہے تھے۔

''کمبخت یونیورسٹی مسلمانوں کے کیا کام آئے گی جب آج فلی پولی

''اور قرق قطسی کے میدانوں کے زخمیوں کو اس کے فنڈ سے مرہم کی ایک پٹی بھی نصیب نہیں۔ حالانکہ یہ الفاظ میرے مطلب کے اظہار کے لیے کافی نہیں مجھ کو کہنا چاہیے کہ اللہ اور اس کے ملائکہ کی لعنت ہو اس یونیورسٹی پر جس کا تیس لاکھ روپیہ ہندوستان کے بنکوں میں جمع ہو اور مسلمان زخمیوں کی صفیں میدان قتال کی برف باری میں ایڑیاں رگڑ رہی ہوں۔'' ۲۷

مولانا یونیورسٹی کو طوق لعنت سمجھتے تھے۔ مسلمانوں کو للکارا کہ ہمیں سب سے پہلے اسلام عزیز ہونا چاہیے اور اسلام و مسلم یونیورسٹی دونوں میں سے کوئی ایک چیز پسند کرنی چاہیے۔ یہ تجویز بھی انہیں منظور نہ تھی کہ ترکوں کے لیے الگ سے جمع کر لیا جائے کہ علی گڑھ کے لیڈران محمد علی جوہر وغیرہ حضرات نے الگ سے چندے کی اپیل کی تھی۔ مولانا اس اپیل کے بھی خلاف تھے اور بضد تھے کہ یہی روپیہ ترکی بھیجنا چاہیے تاکہ یونیورسٹی کا پروگرام ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے اور طوقِ لعنت تو مولانا نے کانگریس کا اپنے گلے میں ڈال رکھا تھا۔

''لیڈران قوم کو یونیورسٹی عزیز ہے گو وہ غلامی اور استبداد کا ایک نیا طوق لعنت ہو لیکن اے اخوان ملت! ہم مومن ہیں اور ہم کو ہر شے سے پہلے اسلام عزیز ہونا چاہیے پھر جب نماز اور حج سے بھی بڑھ کر ہمارا فرض ترکوں کی مدد ہے تو ہم یونیورسٹی کی کیا حقیقت سمجھتے ہیں؟ یہ کہنا کہ ایک نیک کام کے لیے دوسرے اچھے کام کو چھوڑ دینا ضروری نہیں اور مسلمان ترکوں کے لیے بھی روپیہ جمع کر لیں بالکل مغالطہ ہے کیونکہ آج مسلمانوں کے لیے اور نیک کام ہی کہاں باقی ہے۔'' ۲۸

بڑے بڑے معزز مسلمانوں نے اپنی خاص جیبوں سے لاکھ لاکھ روپیہ تک یونیورسٹی فنڈ کے لیے دیا تھا۔ اس زمانے کا ایک لاکھ روپیہ آج کے ایک کروڑ روپیہ سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ ان مخلصین قوم کو مولانا نے خوب خوب گالیاں دیں۔ ان کو منحوس کہا اور کہا کہ یہ لوگ شیطان کے راستہ میں خرچ کرنے والے ہیں یعنی یونیورسٹی کے لیے خرچ کرنا شیطان کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ ملاحظہ کریں۔



''رہی یہ بات کہ جن بڑے بڑے رئیسوں نے ایک ایک لاکھ روپیہ دیا ہے، وہ اسے گوارہ نہ کریں گے تو جو لوگ اس خیال کے ہوں وہ فوراً اپنا اپنا روپیہ واپس لے کر ہماری راہ سے ہٹ جائیں اور اپنی شوکت کی نجاست سے تمام مسلمانوں کی اسلام پرستی کے تقدس کو ملوث نہ کریں خدا اپنے کلمۂ توحید کی حفاظت کے لیے منافقوں کی اعانت کا محتاج نہیں ہے جن لوگوں کی دولت انفاق فی سبیل الشیطان کے لیے ہے ان کو انفاق فی سبیل اللہ کی توفیق کب مل سکتی ہے۔'' ۲۹

## مسلم یونیورسٹی کا نصاب

معمولی تعلیم یافتہ انسان بھی نصاب تعلیم کے معنی بخوبی جانتا اور سمجھتا ہے۔ مولانا آزاد نے اپریل ۱۹۱۳ء کے الہلال میں ایک عظیم مسلم یونیورسٹی نصاب تعلیم کے عنوان سے شائع کی۔ عنوان پر غور کریں اور اشعار ملاحظہ کریں۔ (غالب گمان ہے کہ یہ نظم علامہ شبلی کی لکھی ہوئی ہے)

نظم

ہمارے لیڈروں کے مشغلے اب بڑھتے جاتے ہیں
کہ اب سازش کی بھی باقاعدہ تعلیم ہوتی ہے
ہماری مجلس قومی کے جب اجلاس ہوتے ہیں
تو اخلاقی قوائد میں بھی کچھ ترمیم ہوتی ہے
ادھر اسٹیج پر سرگوشیاں ہوتی ہیں آپس میں
اشاروں میں ادھر فردِ عمل تقسیم ہوتی ہے
طلسم چشم وابرو کے جو اسرار نہانی ہیں
نوآموزوں کو ان کی دم بدم تعلیم ہوتی ہے
بٹھائے جاتے ہیں کالج کے لڑکے صدر وبائیں ہیں
سکھائی جاتی ہے جو کچھ نئی اسکیم ہوتی ہے
یہاں تک تو خدا کے فضل سے ہم نے ترقی کی
اب آگے دیکھئے اس فن میں کیا ترمیم ہوتی ہے

## صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کا جواب

مولانا آزاد کو مسلم یونیورسٹی تحریک سے اتنی شدید نفرت تھی کہ اس کے لیڈروں کے خلاف لکھنے میں شرافت تک کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے تھے اور قطعاً خیال نہ کرتے کہ کس کے بارے میں کیا کہہ رہے ہیں۔ اگست ۱۹۱۲ء کے الہلال میں ایک مضمون میں راجہ صاحب محمود آباد پر بے بنیاد الزام تراشیاں کیں جس کا جواب صاحبزادہ آفتاب احمد نے دیا یہ جواب بھی الہلال میں شائع ہوا مولانا نے خیال ظاہر کیا تھا کہ روپیہ سے جو یونیورسٹی لی جارہی ہے وہ اس روپیہ کی قیمت کی ہے بھی یا نہیں؟ یعنی یہ بھی گویا کسی زمین یا باغ کا سوادتھا یا تجارت ہو رہی تھی۔

”یہاں یہ سوال نہیں ہے کہ نہ ہونے سے کسی کام کا ہونا بہرحال بہتر ہے۔ بلکہ دیکھنا یہ ہے کہ ایک کروڑ روپیہ سے جو متاع خریدی جارہی ہے وہ اس قیمت کی ہے بھی کہ نہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ جو مخصوص ممبران روپیہ دینے والوں کی نیابت کا دعویٰ کر کے شملہ جاتے رہے ہیں انھوں نے اپنا فرض پورا کیا کہ نہیں۔“ ۳۰

مولانا راجہ صاحب محمود آباد کو بددیانت سمجھتے تھے ان کا خیال تھا کہ آزاد خود مختار یونیورسٹی گورنمنٹ نہیں دے سکتی۔ اپنی طرح وہ راجہ صاحب جیسے قائدین کو بے ایمان سمجھتے تھے۔

”سب سے پہلے قوم کو راجہ صاحب سے پوچھنا چاہیے کہ شکوہ وشکایت کا ہنگامہ ہوتا رہے گا۔ خود اپنی نسبت تو یقین دلائیں کہ ۳۰ لاکھ روپیہ دینے والوں کی نیابت کہاں تک انھوں نے دیانت وصداقت سے انجام دی ہے۔ یونیورسٹی کے متعلق بھی اپنی عادت کے مطابق ان لیڈروں نے یہی سمجھا تھا کہ قوم نے نہ کبھی پوچھا ہے اور نہ کبھی پوچھے گی۔ روپیہ لیتے جائیں اور وقت ٹالتے جائیں۔ بند کمروں میں بیٹھ کر جو کچھ کرنا ہے کرلیں گے.......... بارہا پوچھا گیا کہ آخر یونیورسٹی ہے کیا شے.......... گورنمنٹ کیوں کر ایک



آزاد یونیورسٹی کا چارٹر دے سکتی ہے مگر یونیورسٹی بھی (استواء علی العرش) کا مسئلہ تھی کہ ہمیشہ یہی جواب ملا (اس کی حقیقت مجہول ہے مگر اس پر اعتقاد واجب ہے اور اس کی نسبت سوال بدعت)“ ۳۱

صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے مولانا کا مضمون پڑھا اور جواب دینا ضروری خیال کیا۔ انھوں نے لکھا کہ:

”میں نے اس وقت آپ کے اخبار اگست ۱۹۱۳ء میں مضمون پڑھا جو جناب نے مسلم یونیورسٹی پر تحریر فرمایا ہے، جس قدر آپ نے اپنے بیش بہا خیالات کا اظہار فرمایا ہے اس کی......البتہ آپ نے اپنے مضمون کے آخر میں جناب والا آنریبل راجہ علی محمد خاں صاحب پریسیڈنٹ کانسٹی ٹیوشن کی نسبت خاص طور پر جو کچھ لکھا ہے چونکہ اس کا تعلق واقعات سے ہے اس لیے میں اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ جو صحیح حالات ہیں وہ پبلک کو معلوم ہوں اور ایک ایسا شخص جو ہر طرح پر قوم کے شکریہ کا مستحق ہے اس کے متعلق قوم میں غلط فہمی نہ ہو......“ ۳۲

اکثر انگریز حکام یونیورسٹی دینے کے خلاف تھے اور یہ بات پسند نہ کرتے تھے کہ مسلمانوں کی بھی کوئی یونیورسٹی ہو مگر راجہ صاحب نے کمیٹی کے مطالبات کو پیش کرنے میں اس بات کا کچھ خیال نہ کیا کہ حکومت ان سے ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ صاحبزادہ آفتاب صاحب اس کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق ابتداء سے اس وقت تک گورنمنٹ کے ساتھ جو کارروائی ہوئی ہے اس کی نسبت مجھ کو ذاتی علم ہے اور اس کے لحاظ سے میں دعویٰ کے ساتھ اس بات کو کہہ سکتا ہوں کہ راجہ صاحب ممدوح نے کبھی کسی معاملے میں اس خیال سے کہ گورنمنٹ یا گورنمنٹ کا کوئی عہدیداران سے خوش ہو قومی مقاصد کو کبھی فراموش نہیں کیا بلکہ جس جرات اور بے باکی سے انھوں نے قومی مقاصد کی حفاظت کی ہے اس سے ہم سب کو ایک گونہ حیرت ہے کہ باوجود

مسلمان تعلقدار ہونے کے انھوں نے ذاتی نفع نقصان کا کچھ خیال نہیں کیا۔ سب جانتے ہیں کہ ہمارے صوبے کے لیفٹننٹ گورنر مجوزہ یونیورسٹی کی تحریک کو پسند نہیں کرتے اور ہمارے صوبے کے انگریز عام طور پر اس کے موافق نہ تھے لیکن راجہ صاحب موصوف نے ان حالات کی کبھی پرواہ نہ کی............ میں نہیں سمجھتا کہ آپ کا وہ معتبر ذریعہ کون سا ہے جس کی بنا پر آپ نے راجہ صاحب موصوف پر ایسا بے بنیاد الزام لگایا راجہ صاحب نے جو قومی خدمت کی ہے وہ قوم اور پبلک کے سامنے ہے نہ وہ کسی اعتراف کی محتاج ہے اور نہ بیجا نکتہ چینی سے اس کو کسی قسم کا اندیشہ ہے۔''[۳۳]

**حواشی:**

(۱) عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، ص:۲۴۱
(۲) الہلال، مارچ ۱۹۱۶ء، ص:۲۴۲
(۳) ایضاً
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً
(۶) الہلال، مارچ ۱۹۱۳ء، ص:۱۵۸
(۷) ایضاً
(۸) الہلال ۴/اگست ۱۹۱۳ء، ص:۳
(۹) ایضاً
(۱۰) ایضاً
(۱۱) ایضاً
(۱۲) ایضاً، ص:۴



(۱۳) ایضاً، ص:۵
(۱۴) البلاغ، ۱۸/فروری ۱۹۱۶ء، ص:۴
(۱۵) البلاغ، ۲۵/فروری ۱۹۱۶ء، ص:۳
(۱۶) ایضاً
(۱۷) ایضاً
(۱۸) ایضاً، ص:۴
(۱۹) القرآن الحکیم (۸۲/۱۰)
(۲۰) الہلال، ستمبر ۱۹۱۲ء، ص:۸
(۲۱) ایضاً
(۲۲) ایضاً
(۲۳) ایضاً
(۲۴) الہلال، ۵/نومبر، ۱۹۱۲ء، ص:۶
(۲۵) الہلال، ستمبر، ۱۹۱۲ء، ص:۸
(۲۶) ایضاً، ص:۲
(۲۷) ایضاً
(۲۸) ایضاً
(۲۹) ایضاً
(۳۰) الہلال ۷/اگست ۱۹۱۴ء، ص:۴
(۳۱) ایضاً
(۳۲) الہلال ۲۲/اگست ۱۹۱۲ء، ص:۱۱
(۳۳) ایضاً

# قصص اسرائیل

## سامری اور سرسید

گزرے ہوئے صفحات میں اس کا ذکر ہو چکا کہ مولانا آزاد گمراہی کی تین منزلیں سمجھتے تھے پہلی وہابیت پھر نیچریت اور تیسری منزل الحاد قطعی کی۔ان کے خیال میں سرسید کو یہی منزلیں پیش آئی تھیں۔مولانا نے الہلال کی ستمبر ۱۹۱۳ء (ص:۲۳۹) کی اشاعت میں قصص بنی اسرائیل کے عنوان سے بنی اسرائیل کا قصہ بیان کیا ہے۔اگر صرف اتنا ہی ہوتا تو کچھ مضائقہ نہ تھا بلکہ بہت نیک کام تھا کہ مسلمانوں کو پرانی تاریخ سے روشناس کرایا جارہا ہے لیکن یہ تو مولانا کی فطرت کے خلاف ہوتا کہ قرآن کی کوئی آیت یا حکایت بغیر کسی مطلب اور اپنے مخالفین کو نیچا دکھانے کے محض علمی مقصد سے بیان کی جائے لہٰذا اس واقعہ سے کس طرح انھوں نے سرسید کی توہین کی ہے اس سے مولانا کے خاص رجحان اور فطرت کی نشاندہی ہوتی ہے۔مضمون تو بہت لمبا ہے مختصراً ہم اس طرح بیان کرسکتے ہیں کہ:

حضرت ابراہیم کے دو بیٹے پیدا ہوئے ایک حضرت اسماعیل اور دوسرے حضرت اسحاق، اسماعیل ملک عرب میں جا بسے اور اسحاق کنعان میں۔حضرت اسحاق سے یعقوب پیدا ہوئے جن کا دوسرا نام اسرائیل تھا اور ان کی اولاد بنی اسرائیل کہلائی۔حضرت یعقوب کے بارہ بیٹوں میں سے ایک یوسف تھے جن کو ان کے بھائیوں نے حسد کی وجہ سے مصر جارہے ایک قافلے کے ہاتھوں فروخت کردیا۔آخر حضرت یوسف مصر کے بادشاہ ہوئے اور بنی اسرائیل کی حکومت مصر میں قائم ہوگئی اور وہ وہاں ایک مدت تک عزت ووقار کی زندگی گزارتے رہے تا آنکہ فرعون مصر نے ان کی حکومت چھین لی اور ان کو ذلیل وخوار کیا۔

اسی تناظر میں مولانا ہندوستان کی کیفیت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:



''ہم بھی جس سرزمین میں گئے ایک مدت تک عزت ووقار کی زندگی بسر کرتے رہے تا آنکہ فراعنہ مصر نے ہم کو ہماری شہنشاہیوں سے معزول کیا...... ہمارے عزت وجلال کے تخت کو الٹ دیا...... بنی اسرائیل کا ایک فرعون تھا لیکن ہمارے سامنے فراعنہ زمانہ کی ایک جماعت ہے۔''[1]

جب فراعنہ مصر کے ظلم وستم حد سے گزر گئے تو خدا نے موسیٰ کو پیدا کیا جنھوں نے فرعون کی غلامی سے بنی اسرائیل کو نجات دلائی اور فراعنہ کو بحر احمر میں ڈبو دیا۔عبور بحر احمر کے بعد بنی اسرائیل میں سامری پیدا ہوا۔

''جس نے بنی اسرائیل کو دین موسوی سے بیزار کیا۔ان کی جماعت سیاسیہ کو منتشر کردیا۔سونے چاندی کے زیوروں کو بزور سحر گائے کی صورت میں ڈھال کر خدا بنایا...... مسلمانوں کے بھی ہر دور موسیٰ میں خود ان کی قوم سے سامری اٹھے جنھوں نے حق کے ابطال اور باطل کے احقاق کی کوشش کی...... خود اس ہندوستان میں بھی ایک سامری اٹھا جس نے اپنی جاہ وعزت کے جادو سے مسلمانوں کو عجیب وغریب کرتب دکھائے اس نے ملت بیضا کی تحقیر کی قلوب کو مذہب سے بیزار کیا۔مسلمانوں کی جمعیت سیاسی کو منتشر کیا اور خدا سے مغرور ہو کے اصنام حیوانیہ کے آگے نہیں بلکہ انسانی بتوں کے آگے اپنا اور تمام قوم کا سر جھکا دیا اور اس خلیل کے فرزندوں کو بت پرستی کی دعوت دی جس نے کہا تھا (تمہارا خدا وہ ہے جو آسمان و زمین کا خدا اور خالق ہے)۔''[2]

یہ کون شخص تھا جس کے بارے میں مولانا فرما رہے ہیں کہ خود اس ہندوستان میں بھی ایک سامری اٹھا جس نے ملت کی تحقیر کی اور مسلمانوں کو انسانی بتوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کیا۔کیا مولانا سرسید کی طرف اشارہ کررہے ہیں؟

''وہ خدا کی عجائب قدرت کا منکر تھا۔لیکن انسانی خداؤں کی قدرت و

استیلاء سے مرعوب تھا وہ گو ملکوت صفت انسانوں کے خوارق عادات
اور دلائل معجزات کا قائل نہ تھا لیکن وہ خود شیاطین الانس کے ”عمل زیر لبی“
کا معمول اور سحر خوش لقبی سے مسحور تھا۔ اس نے سونے چاندی کے سکوں
کو تبدیل کیمیاوی کر کے ایک صنم خاکی بنایا جس سے صدائے باطل پرستی
اٹھتی تھی اور پھر کہا (دیکھو تمہارا اور موسیٰ کا خدا یہ ہے)۔“ ۳

یہی تو وہ الزامات ہیں جو سرسید پر لگائے گئے کہ وہ معجزات کے قائل نہ تھے اور وہ شیاطین انس یعنی انگریزوں کی غلامی پر خوش تھے۔ سرسید نے ہی تو مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی بنائی جس کے تحت مسلمانوں کو بتایا گیا کہ علم حاصل کرو اور کانگریس کے نیشنل ازم کے دھوکہ میں نہ آؤ۔ اس سے صرف ہندوؤں کا بھلا ہوگا آگے آگے یہ بات اور صاف ہو جاتی ہے۔

”ان اسرائیلان زمانے کی نادانی کتنی عجیب اور ان کی ناحقیقت شناسی کتنی دردانگیز ہے جو ایک جبار و قاہر قوم کی سطوت وقہر سے خوفزدہ ہوئے؟ اور پھر عجیب تر اور دردانگیز تر یہ کہ اس نے کہا ہم اس ارض مقدس میں اس وقت داخل ہوں گے جب خود دشمن اسکو ہمارے لیے خالی کر دیں گے۔ نادانوں پر غور کرو یہ قاہر و جابر قوم خود اس ارض مقدس میں کس طرح داخل ہوئی کیا اس کے دشمنوں نے شہر اس کے لیے خود خالی کر دیا...... اسرائیلی جو اپنے سینوں میں خوفزدہ قلوب رکھتے تھے اور قلوب میں قنوط یاس کے سبب شرک وکفر کی سیاہی وظلمت تھی ڈرے کہ ”قوم جبار“ جو ان سے ظاہری ساز وسامان میں زیادہ ہے ان کو پامال نہ کر دے۔“ ۴

اسرائیلان زمانہ یعنی اس دور کے بھٹکے ہوئے مسلمان جو اپنے دلوں میں خوف رکھتے تھے اور خوف کی وجہ سے شرک اور کفر کی سیاہی ان کے قلوب پر چھا گئی تھی انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے کے لیے راضی نہیں کیونکہ انگریز ان سے ظاہری ساز وسامان میں زیادہ تھے اور ہمارے حضرت بغیر ساز وسامان کے انگریزوں سے لڑانا چاہتے تھے۔ آگے لکھا کہ:

”لیکن اے خدا جن پر چالیس سال تک تیرا غضب بھڑکا وہ اپنی سزا



کو پہنچ چکے اور اب اپنی چہل سالہ گمراہی کے بعد تیری طرف جھکے
ہیں اور اب وہ صداقت وحریت کے اس دروازے میں داخل ہونا چاہتے
ہیں تا کہ ارض مقدس کو جباروں کی نجاست سے پاک کر دیں۔“ ۵

یہ چہل سالہ گمراہی کیا ہے؟ ۱۸۷۵ء میں مدرسۃ العلوم علی گڑھ میں سرسید نے قائم کیا یعنی مولانا کی تحریر کے وقت اس واقعہ کو تقریباً چالیس سال گزر چکے تھے۔ یہ اللہ کا غضب تھا جو مسلمانوں پر بھڑکا اور مسلمانوں پر تمام عذاب خداوندی اسی چہل سالہ گمراہی کا نتیجہ تھا۔ نہ سرسید اور ان کے رفقاء نئی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو راغب کرتے اور نہ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے۔ اسی سلسلہ کی ایک کڑی مولانا کی ایک اور تحریر ہے انھوں نے فروری ۱۹۱۳ء کے الہلال میں لکھا:

”اسلام دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ انسانوں سے ان تمام اقتدار کو چھین لے جن کے ذریعہ وہ تحکم اور جبر کے ساتھ غیر مسئولانہ حکومت کرتے ہوں......اسلام اس کا دشمن ہے اور اس کو شرک فی الصفات قرار دیتا ہے کیونکہ اس کے نزدیک غیر مسئول ہونا اللہ کی صفت ہے پس جو شخص اس صفت کو اللہ کے سوا کسی اور طاقت میں تسلیم کرتا ہے وہ خدا کی صفت میں دوسرے کو تسلیم کرتا ہے......بس یہ ایک شرک جلی تھا جو ایک بت پرستی کی صورت تمام پیروان توحید پر مسلط ہو گیا تھا۔ ہر شخص جو علی گڑھ کو چندہ دنے کے لیے روپیہ رکھتا ہو ہر شخص جس کے پاس علم کی جگہ چاندی سونا ہو، ہر دولت مند جو کسی اجتماع کے موقع پر ایک پرتکلف ڈنر دے سکتا ہو، ہر رئیس جس کے پاس سازشوں کے لیے بہت سی موٹر کاریں ہوں......اس امر کا قدرتی حق رکھتا تھا کہ سات کروڑ انسانوں کا اپنے تئیں معبود ومسجود ظاہر کرے۔ **وکذالک حوالنا...... ومایشعرون** ۶ (ترجمہ) اور اس طرح ہم نے ہر انسانی آبادی میں بڑے بڑے لوگ پیدا کیے وہی ان میں بداعمال بھی تھے تا کہ ان آبادیوں میں مکر وفریب پھیلائیں حالانکہ وہ

جس قدر مکر کرتے ہیں اپنے ہی ساتھ کرتے ہیں مگر وہ اس حقیقت کو
نہیں سمجھتے۔'' ۷

اب تو قرآن کی آیت بھی سرسید اور علی گڑھ کے سلسلے میں نازل ہوگئی۔کون ایسا بدعقیدہ مسلمان ہوگا جو مولانا کی بات پر یقین نہ کرے کہ ہر انسانی آبادی میں بڑے بڑے لوگ خدا نے پیدا کیے جو گمراہ تھے۔یعنی وہ تمام لوگ جو علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی بنانے کے لیے چندہ دیتے تھے اور جن کے پاس علم کے سوا ہر چیز تھی بداعمال تھے اور مسلمانوں کے تئیں اپنے آپ کو معبود ظاہر کرتے تھے اور یہ ایک کھلا شرک تھا جو ایک کھلی بت پرستی کی صورت میں تمام مسلمانوں پر مسلط کر دیا گیا تھا۔

## مولانا اور گاندھی جی کا رام راجیہ

سرسید اور ان کے دوستوں کے لیے تو یہ فتویٰ مولانا نے دے دیا۔اب ذرا ادھر بھی نگاہ ڈالیں کہ جو کھلے مشرک تھے اور کروڑوں بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے ان کے بارے میں مولانا کی کیا رائے ہے۔موہن داس کرم چند گاندھی نے ہمیشہ ہی ہندوستان میں رام راجیہ کا خواب دیکھا اور وہ انتہائی کٹر قسم کے ہندو تھے حالانکہ بہت فراخدل اور مسلمانوں سے میل چاہتے تھے یعنی جو مسلمان رام راجیہ پر اعتقاد رکھتے ہیں وہ ہمارے ساتھ آجائیں اور جو نہیں رکھتے ان کو بھی کسیطرح اس میں شامل کیا جائے۔Colling &Lappiere نے Freedom atmidnight میں لکھا ہے:

"NO MAN WAS EVER MORE TOLERANT, MORE GENUINELY FREE OF ANY TAINT OF RELIGIOUS PREJUDICE THAN GANDHI. HE DESPERATELY WANTED TO ASSOCIATE THE MUSLIMS WITH EVERY PHASE OF HIS MOVEMENT. BUT HE WAS A HINDU, AND A DEEP BELIEF IN GOD WAS THE VERY ESSENCE OF HIS BEING. INEVITABLY,UNINTENTIONALLY GANDHI'S CONGRESS PARTY MOVEMENT BEGAN TO TAKE ON A HINDU TONE AND COLOUR THAT AROUSES



MUSLIM SUSPICIOUNS. (P.27)۸

گاندھی جی چرخہ کاتنے کی مہم بہت مقبول ہوئی وہ خود روزانہ چرخہ کاتتے تھے تاکہ انگلینڈ سے آئے ہوئے کپڑے کا بائیکاٹ کر کے ہندوستانی خود اپنی بنائی ہوئی کھادی پہنیں اور اس طرح اقتصادی انقلاب برپا ہو۔گاندھی جی چرخہ کاتتے وقت زور زور سے رام رام کا ورد کیا کرتے تھے۔

THE MAHATAMA BEGAN TO MURMUR RAMA, RAMA, RAMA IN RHYTHM TO THE CLICK, CLICK OF THE SPINNING WHEL.(P.48)۹

جواہر لال نہرو اعتراف کرتے ہیں کہ گاندھی جی اپنی تقریروں میں اکثر رام راجیہ کا ذکر کیا کرتے تھے جو ان کو برا لگتا تھا۔اس کے علاوہ جواہر لال نہرو نے اپنی آپ بیتی میری کہانی میں مولانا مولویوں کا تذکرہ بڑے تحقیرانہ انداز میں کیا ہے۔وہ یہ سمجھتے تھے کہ یہ لوگ رجعت پسند ہیں لیکن جب تک کہ تحریر صحیح راستہ پر ہے ان رجعت پسند لوگوں کی موجودگی سے کانگریس کی تحریک پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا اور ظہر ہے کہ کانگریس میں اس وقت مولانا آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ ہی تھے۔ان حضرات کے بارے میں جواہر لال نہرو کی رائے پر حیرت ہوتی ہے۔

''بعض واقعات سے میں پریشان ہو جاتا تھا کہ سیاست میں مذہب کو اتنا دخل کیوں ہے مجھے یہ بات بالکل پسند نہ تھی۔مولوی مولانا اور سوامی جو کچھ اپنی تقریروں میں کہتے تھے اسے سن کر مجھے سخت صدمہ ہوتا تھا مجھے ان کی تاریخ عمرانیات اور اقتصادیات سب غلط معلوم ہوتی تھی ہر چیز کو مذہبی رنگ دے دینے سے روشن خیالی کا خاتمہ ہوگیا تھا۔گاندھی جی کے بعض بعض جملے بھی مجھے گراں گزرتے تھے مثلاً وہ اس زریں دور کو جو پھر لوٹ کر آنے والا تھا اکثر رام راجیہ سے تعبیر کیا کرتے تھے لیکن میں بے بس تھا اور یہ کہہ کر اپنے دل کو سمجھا لیتا تھا کہ گاندھی جی یہ الفاظ صرف اس لیے استعمال کرتے ہیں کہ لوگ انھیں جانتے ہیں او سمجھ سکتے ہیں۔لیکن میں نے ان چیزوں کی زیادہ پرواہ نہیں کی مجھے خود

> اتنی مصروفیت تھی اور تحریک اس زور و شور سے بڑھ رہی تھی کہ ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر دھیان دینے کا وقت ہی نہ تھا۔ ایک عام تحریک میں ہر قسم کے لوگ موجود ہوتے ہیں اس لیے جب تک ہم صحیح راستہ سے نہ بھٹکیں چند رجعت پسندوں کی موجودگی سے کیا حرج تھا۔''۱۰

سرسید جو ہمیشہ مسلمانوں کی بھلائی اور ترقی کی کوششوں میں لگے رہے ان کی مولانا آزاد نے ہمیشہ تحقیر کی اور کبھی عزت سے نام نہ لیا۔ معدودے چند مواقع کے ایک بار مسلم یونیورسٹی کے جلسہ تقسیم اسناد میں بحیثیت مہمان خصوصی تقریر کرتے ہوئے سرسید کے تعلیمی مشن کی تعریف کی لیکن مولانا گاندھی جی کے معہ ان کے نظریۂ رام راجیہ کے بے انتہا معتقد تھے اور ان کی عظمت سے مولانا کا دل لبریز تھا۔ گاندھی جی کے قتل کے بعد فروری ۱۹۴۸ء میں ان کی یادگار قائم کرنے کے سلسلہ میں ایک جلسہ ہوا، جس کی صدارت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

> ''جب میں پہلی دفعہ مہاتما جی سے ملا اس وقت میں ان کا معتقد نہیں تھا۔ میری آنکھوں پر اعتقاد کی پٹی نہ تھی لیکن اس کے بعد ان کی ہر ہر چیز نے ان کی عظمت میرے دل میں راسخ کر دی اور جو دن گزرا میرا اعتقاد ان کے بارے میں بڑھتا ہی گیا۔''۱۱

مولانا گاندھی جی ہی کے معتقد نہ تھے بلکہ ہندو مذہب سے بھی متاثر تھے وہ سمجھتے تھے کہ گاندھی جی نے ہندو دھرم کی ایک ایسی تعبیر دی ہے جو قومی اور جغرافیائی حد بندیوں سے بلند ہے اور اگر انسان کا دماغ اسے سمجھ لے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔ اسی تقریر میں فرمایا:

> ''یہ نہ تھا کہ مہاتما جی ہندو نہ تھے وہ بے شک ہندو تھے لیکن انھوں نے ہندو مذہب و دماغ کی نئی تعبیر کی تھی اور ایک نیا زاویہ بنایا تھا جو تمام حد بندیوں پر چھا گیا تھا اور وہ ایک ایسی جگہ بن گئی کہ نہ وہاں جغرافیہ اور قومیت کی لکیریں چل سکتی ہیں اور نہ دوسری حد بندیوں کی دیواریں قائم رہ سکتی ہیں۔ یہ وہ بلندی ہے کہ اگر ہمارا دماغ وہاں تک پہنچ سکے تو اس سے بڑی کوئی خوبی نہیں ہے۔''۱۲

○



## حواشی:

(۱) الہلال، ستمبر ۱۹۱۳ء، ص: ۲۴۱

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً

(۶) الہلال، ۲۰ فروری ۱۹۱۳ء، ص: ۱۲۵

(۷) قرآن حکیم (۶: ۱۲۴)

(۸) ایضاً، ص: ۲۷

(۹) ایضاً، ص: ۴۸

(۱۰) میری کہانی، حصہ دوم، ص: ۱۲۹

(۱۱) خطبات آزاد، ص: ۳۴۹

(۱۲) ایضاً

# محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس پر مولانا کی رائے

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے بارے میں مولانا آزاد کی رائے خاصے کی چیز ہے اور اس کا پڑھنا قاری کو حیرت سے دوچار کرتا ہے۔ اولاً یہ کہ یہ کانفرنس کیا تھی اس کے اغراض و مقاصد کیا تھے اور وہ کس طرح اپنے مقاصد حاصل کرنے میں کامیاب ہوئی، یہ کہنا کہ مولانا ان تمام باتوں سے ناواقف تھے ہمارے خیال میں صحیح نہیں تو پھر اتنے غلط اور غیر فہمانہ انداز میں اس کے خلاف الہلال میں لکھنے کے کچھ اور معنی بھی ہماری سمجھ میں نہیں آتے سوائے اس کے کہ وہ بنگالی ہندوؤں کی شہ اور سپورٹ پر ایسا کر رہے تھے۔ بہرحال مولانا نے کیا کہا اس کو جاننے سے پہلے MEC کا مختصر تعارف بھی ضروری ہے۔ MEC سرسید نے ۱۸۸۶ء میں قائم کی جیسا کہ ہر انسان کے ساتھ ہوتا ہے سرسید کی زندگی بھی ایک خاص وقفہ کے بعد ختم ہونے والی تھی لہٰذا مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی کوششیں ان کی موت کے بعد بھی جاری رہیں، سرسید نے MEC کی بنیاد ڈالی۔ اپنی زندگی کے آخری گیارہ سالوں میں انھوں نے اس قومی انجمن کو ایک بہترین فعال اور مسلمانوں کی محبوب ترین تعلیمی کانفرنس بنا دیا۔ جس میں سیکڑوں اور ہزاروں میل کا سفر طے کر کے دردمندان ملت اور مسلمانوں کا تقریباً تمام ہی تعلیم یافتہ طبقہ جمع ہو کر ملت کو درپیش تعلیمی اور دوسرے مسائل پر دانشمندانہ بحثیں اور اظہار خیال کیا کرتا تھا۔ باثر مسلمان جو اس وقت تک ایسے کسی اجتماع اور اظہار خیال کے نادر طریقہ سے ناواقف تھے دور دراز حصوں اور مختلف طبقوں سے جوق در جوق اس میں شریک ہوتے تھے۔ اس کا پہلا جلسہ ۲۷ر دسمبر ۱۸۸۶ء کو مقام علی گڑھ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج منعقد ہوا اور اسکے مقاصد مندرجہ ذیل قرار دیے گئے۔

(۱) مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے جاری ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور بقدر امکان عمدگی سے اس تعلیم کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔



(۲) مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔

(۳) علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علماء جابجا طور پر خود تقویت دیتے ہیں ان کو تقویت دینا اور اس کو بدستور قائم اور جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔
جو تعلیم قدیم طرز پر دیسی مکتبوں میں جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں کرنا، قرآن خوانی اور حفظ قرآن کی جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان کے قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

مذکورہ بالا مقاصد کے عمل میں لانے کی تدبیر یہ اختیار کی گئی کہ مختلف جگہوں کے ممتاز آدمی جو خواہش ظاہر کریں ان کے شہر میں کانفرنس کا انعقاد ہو اور وہی لوگ تاریخیں طے کریں اور انتظامات وغیرہ کا ذمہ لیں اور وہاں کے مسلمانوں کے مدارس، مکاتب، صنعت و حرفت وتجارت و زراعت وغیرہ کی ترقی و تنزلی کے حالات تحریر کر کے کانفرنسوں کے جلسوں میں بھیجتے رہیں۔ سب سے بڑا فائدہ جو اس قومی مجلس سے ہوا وہ یہ تھا کہ ہر سال مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر جس کی تعداد بعض اجلاسوں میں ہزاروں سے تجاوز کر گئی نہ کسی سیر و تماشہ کی غرض سے نہ کسی حاکم کے حکم سے نہ کسی ذاتی منفعت کے لیے بلکہ محض اس خیال سے کہ جو مجمع قوم کی بھلائی کے ارادے سے ہوتا ہے اس میں شریک ہوں، دور دراز سفر کی تکلیف آمدورفت کا خرچ برداشت کر کے کانفرنسوں کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے۔ اس طرح ایک پراگندہ قوم کے اجزا میں اتحاد قائم ہوتا گیا اور اس سے مسلمانوں میں بالعموم تعلیم کا خیال زیادہ ہو گیا خصوصاً جس شہر میں اجلاس ہوتا تھا وہاں پر زیادہ اثر ہوتا تھا ''کانفرنس ہی کی تحریک سے بہت سے عمدہ اور نہایت عمدہ رسالے، مضامین اور لکچر ایسے تیار ہو گئے جس سے اردو لٹریچر میں اضافہ ہوا جیسے مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم الجبرہ مضمون، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین، مسلمانوں کی ترقی وتنزلی کے اسباب، ابوریحان بیرونی کی لائف...... مولانا نذیر احمد، نواب محسن الملک اور آنریبل سید محمود کے لکچر اور اسپیچیں وغیرہ۔[۱]

اسی کانفرنس کی تحریک سے الہ آباد یونیورسٹی نے ''کاکس ہسٹری'' کو جس میں مسلمانوں کے لیے توہین آمیز مضامین تھے ہائی اسکول کے کورس سے خارج کیا گیا اور جب

اس بات کی تحریک کی گئی کہ فارسی زبان کی تدریس الہ آباد یونیورسٹی میں بند کی جائے تو اسی کانفرنس کے ذریعہ اس غلط تحریک کو رکوادیا گیا۔اس کے علاوہ کانفرنس ہی کی تجویز کے مطابق نواب وقارالملک نے گورنمنٹ میں اس بات کی تحریک کی کہ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی مذہبی تعلیم کی اجازت دی جائے چنانچہ گورنمنٹ نے بعض شرائط پر اس کی اجازت کچھ جگہ دے دی۔

اس کے علاوہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسہ میں سرسید نے کانگریس کے مطالبات پر ایک مدلل تقریر لکھنؤ میں ۱۸۸۸ء میں کی۔یہ مسلمانوں کا سب سے پہلا سیاسی جلسۂ عام تھا جس میں ہندوستان میں جمہوری اداروں کی شروعات پر بحث کی گئی تھی۔اس کے بعد وقتاً فوقتاً سرسید نے کانفرنس کے پروگرام کے ساتھ ساتھ ہی اپنے سیاسی افکار سے ملت اسلامیہ ہندیہ کو سیاست کا پہلا سبق پڑھایا۔سرسید کے انتقال کے بعد کانفرنس کے جلسوں کا اہتمام محسن الملک کرنے لگے۔ملی خدمت اور قوم کے لیے کچھ کرنے کا جذبہ سرسید کے انتقال سے قوم میں بہت زوروشور سے پیدا ہوگیا تھا۔اسی کانفرنس کے جلسہ میں کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دیے جانے کی تجویز پاس ہوئی اور مختلف جگہوں پر کانفرنس کے جلسوں کے ذریعہ ہی چندہ جمع کیا گیا۔۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں کانفرنس کے جلسہ کے سلسلہ میں آئے مندوبین نے ہی میٹنگ کر کے تاریخ ہند کا سب سے اہم کارنامہ انجام دیا یعنی وقارالملک کی صدارت میں مسلمانوں کی مشہور سیاسی پارٹی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔

## کانفرنس سے نقصانات

ایسی سودمند اور قوم میں بالعموم ترقی اور تعلیم کا جوش دلانے والی جماعت کے سلسلہ میں مولانا آزاد نے الہلال کی دسمبر۱۹۱۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ یہ کانفرنس مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ کرنے کے لیے قائم کی گئی تاکہ مسلمان کانفرنس میں مشغول ہوجائیں اور کانگریس میں شرکت نہ کرسکیں۔

"یہ مسلمانوں کا تمام ملک میں ایک ہی عظیم الشان مجمع ہے جو ہر سال منعقد ہوتا ہے...... میں اس وقت بالکل پسند نہ کروں گا کہ علی گڑھ کانفرنس کی تاسیس وتشکیل کی تاریخ کا تجسس کروں نہ میں اس کی



ضرورت محسوس کرتا ہوں کہ لوگوں کو یاد دلاؤں کہ سرسید مرحوم نے کانفرنس صرف اس خیال سے قائم کی تھی تاکہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقابلے میں ایک ایسا مجمع کردیا جائے تو انھیں تاریخوں میں منعقد ہو جن تاریخوں میں کانگریس کا اجلاس منعقد ہوتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو کانگریس کی شرکت سے روکا جائے۔"۲؎

کیسا عمدہ طریقہ سرسید نے مسلمانوں کے لیے کانگریس سے علیحدہ رہنے کا نکالا تھا کہ بس جب کانگریس کا جلسہ ہوا اسی زمانے میں کانفرنس کا جلسہ کر دو مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہیں گے یقینی طور سے ایسا طریقہ سرسید کے ذہنِ دوررس میں کبھی نہیں آسکتا تھا۔کانفرنس کی کوئی عوامی ممبرشپ نہیں تھی اور نہ پورے سال اس میں شامل ہونے کی مہم چلائی جاتی تھی اس کے برخلاف کانگریس ایک سیاسی جماعت تھی جو ہمہ وقت ممبرشپ بڑھانے اور لوگوں کو اپنی طرف راغب کرنے کے درسی طریقے اختیار کرتی تھی۔سرسید نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھا اور اپنے زمانے میں کسی قابل ذکر مسلمان کو کانگریس میں نہ جانے دیا۔وہ طریقہ کیا تھا اس کا ذکر پہلے آچکا ہے یہاں صرف اتنا کہنا مقصود ہے کہ کانفرنس کے عظیم مقاصد تھے۔مولانا کی نظر میں کانفرنس سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا کہ مسلمان کانگریس کی سیاست سے علیحدہ ہوگئے ان کے خیال میں کانفرنس سے مسلمانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔

"اگر آج یہ سوال کیا جائے کہ کانفرنس کے وجود سے قوم کو کس قدر فوائد حاصل ہوئے اور کس قدر نقصان تو میں اس کا جواب دینا پسند کروں گا۔کانفرنس سے ایک اشد نقصان تو یہ ہوا کہ اس کا وجود بھی منجملہ ان موانع کے تھا جن کے ذریعہ مسلمانوں کو سیاست کے درس و ذوق سے روکا جاتا تھا اور پالیٹکس باغ عدن کا شجر ممنوعہ بن گیا تھا کہ

**لاتقربا هذه الشجرة فتكونا من الظالمين (قرآن۲:۲۳)**

درحقیقت اس سعی نے مسلمانوں کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ نہیں معلوم ہے کہ اس کی تلافی کبھی ہو بھی سکے گی یا نہیں۔"۳؎

کانفرنس کا مقصد مسلمانوں کو سیاست سے روکنا ہر گز نہ تھا ہاں دشمنوں کی سیاست میں

شامل ہونے سے روکنا ضرور تھا اور جس شجرِ ممنوعہ کے سائے میں مولانا نے ترقی کی۔ اسی مضمون کے آخر میں محسن الملک مرحوم کے بارے میں فرمایا کہ جب بھی وہ تقریر کرتے تھے مسلمانوں کی تعلیم اور تنزلی کا رونا لے کر بیٹھ جاتے تھے اور مولانا ان کو سننے سے بہتر یہ سمجھتے تھے کہ لحاف اوڑھ کر سولیا جائے۔ مولانا کو مسلمانوں کی ترقی اور تعلیمی پروگراموں سے کیا مطلب ہوسکتا تھا؟ ان کی نظر میں تو دو ہی چیزیں قوموں اور جماعتوں کے لیے اپنے اندر کشش رکھتی تھیں، مذہب یا سیاست یہاں دونوں میں سے ایک بھی شے نہیں صرف ایک مسئلہ تعلیم لوگ کہاں تک سنیں؟

''خدا بخشے نواب محسن الملک مرحوم اپنے آخری زمانے میں جب کبھی لیکچر دیا کرتے تھے تو اس قدر مجھے تکلیف ہوتی تھی کہ اٹھ کر اپنی قیام گاہ میں چلا آتا اور لحاف اوڑھ کر سو رہتا تھا کہ یہ اس سے ہزار درجہ بہتر اور پر تکلف و لذت بخش ہے......وہ جب کبھی کھڑے ہوتے تو تعلیم کے متعلق تقریر کرتے یا مسلمانوں کے تنزل و بربادی کا افسانہ چھیڑ دیتے۔......جس وقت سے لیگ قائم ہوئی ہے کانفرنس اور زیادہ بے رونق ہوگئی اگر اب کانفرنس کے اجلاس لیگ کے ساتھ نہ ہوں تو جلسہ کا ویسا ہی حال ہوجیسا.............۔''۴؎

محسن احسان کرنے والے کو کہتے ہیں اور احسان وہ عمل ہے جو بغیر کسی بدلے کی توقع کے کیا جائے۔ ہمارے اکابرین درسگاہ جنھوں نے لفظاً نہیں بلکہ حقیقتاً اپنا تن من دھن سب کچھ مسلمانوں میں تعلیم کو رائج کرنے اور انھیں تنزلی سے نکال کر باعزت بنانے میں لگا دیا اور اپنی بے لوث خدمت کے باعث ہمارے لیے قابل اقتدار بن گئے اور محسن قوم ہوئے۔ بانی درس گاہ کے دوست راس نواب سید مہدی جنھیں ہم ان کے اعزازی نام نواب محسن الملک سے عام طور پر جانتے ہیں سرسید کے انتقال کے بعد پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ جب انھوں نے ادارہ کی ذمہ داری سنبھالی تو ایم اے او کالج میں ۳۴۳ طلباء زیرِ تعلیم تھے۔ ۱۹۰۷ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو طلباء کی تعداد ۸۶۳ تک پہنچ گئی تھی جو صرف ان کی بے لوث لگن اور خدمت کا نتیجہ تھی۔ ان کو طلبا کالج سے بے پناہ محبت تھی۔



''اے میرے بچو! اور میرے قومی پھولو! میری زندگی اور موت تمہارے لے ہے تم یقین مانو کہ اگر تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی ہوگی تو میں اپنی قبر میں نہایت خوش آرام سے دلہن کے سونے کی مانند سوؤں گا اور خدا کا فرشتہ مجھ کو کہے گا ''نم کنومۃ العروس'' اور اگر خدانخواستہ تمہاری حالت دین و دنیا میں اچھی نہ ہوگی تو قبر میں بھی مجھ کو چین نہ ہوگا۔''۵؎

ایسے نیک خیالات رکھنے والے انسان اور ایسے بے مثال قومی خدمت کرنے والے شخص کے بارے میں مولانا کس قدر بے دردی سے لکھتے ہیں کہ وہ ہمیشہ مسلمانوں کی تنزلی و بربادی کا افسانہ چھیڑ دیتے تھے۔ یقینی طور پر جس کو جس کام کی لگن تھی اس نے وہ کیا۔ محسن الملک ملت اسلامیہ تھے سو تمام عمر خدمت میں گزادی اور مولانا نے تمام زندگی ایسے ایسے سچے محسنوں کی تنقید میں بسر کی اور مسلمانوں کی نہیں بلکہ غیر قوموں کی خدمت میں زندگی صرف کی نہ صرف خود ایسا کیا بلکہ پوری قوم کو اس کام میں لگانا چاہا۔

## مردے کو زندہ کرنے کی کوشش

۱۹۱۶ء میں مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا جلسہ علی گڑھ میں ہونا طے پایا تھا۔ مولانا آزاد نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو لکھا کہ میں جلسہ میں شریک ہوکر ''صراط مستقیم'' کے موضوع پر تقریر کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کی اجازت دی جائے۔ اس کا مقصد انھوں نے یہ ظاہر کیا کہ مسلمانوں کو معلوم ہوجائے کہ کانفرنس جو مسلمانوں کی ہمدردی اور خیر خواہی کا دعویٰ کرتی ہے آیا اس میں اسلام کی تبلیغ و دعوت کے لیے اجازت ہے کہ نہیں۔ مولانا مسلمانوں کو اسلام کی دعوت کانفرنس کے جلسہ میں پیش کرنا چاہتے تھے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں سمجھ گئے کہ مولانا کیا چال چلنا چاہتے ہیں۔ کانفرنس کی مخالفت کرنے کے لیے مولانا حسب معمول اسلام اور قرآن کا استعمال کرتے جیسا کہ اپنی تحریروں میں کیا کرتے تھے۔ گزشتہ سال ۱۹۱۵ء میں کانفرنس کا جلسہ راولپنڈی میں منعقد کیا گیا تھا تاکہ سرحد کے مسلمانوں میں بھی تعلیم کا رواج ہو کانفرنس کے آخری جلسہ میں مولانا کا نمبر آیا تو انھوں نے کانفرنس کے اغراض و مقاصد کی مخالفت کرتے ہوئے کانفرنس کی تعلیمی تحریک کے متعلق خیال ظاہر کیا کہ یہ ایسی کوشش ہے جیسے کوئی مردے کو رنگ و روغن کے ذریعہ زندہ کرنے کی کوشش کرے۔

ظاہر ہے کہ قرآن وحدیث کو حسب دستور استعمال کیا ہوگا چنانچہ عوام و منتظمین جلسہ پر اس کا جو اثر ہوا وہ بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے۔ان واقعات کو ذہن میں رکھتے ہوئے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے مولانا کو لکھا:

''آپ کو معلوم ہے کہ اس کانفرنس کے وجود کا مقصد اور موضوع تعلیمی تحریک کی اشاعت ان اصولوں کے مطابق ہے جو سرسیدؒ نے قائم کیے اور جن پر علی گڑھ کی تحریک مبنی ہے۔پس کانفرنس کے اسٹیج پر جو کچھ بھی تعلیمی تجاویز پیش ہوں اور ان کے متعلق جو کچھ تقریریں ہوں ان سب میں اصلی غرض کا ملحوظ رہنا ضروری ہے کانفرنس میں جو تعلیمی مسائل یا مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے متعلق جو تجاویز پیش ہوں ان سے اتفاق یا اختلاف کرنے کا ہر ایک ممبر کو حق ہے۔لیکن کانفرنس کے وجود کا جو مقصد وموضوع ہے اس پر کانفرنس کے پلیٹ فارم سے حملہ کرنے کا کسی کو حق نہیں۔اس قدر تمہید کے بعد اب میں آپ کو آپ کی وہ تقریر یاد دلاتا ہوں جو گزشتہ سال راولپنڈی کے اجلاس کانفرنس میں آپ نے فرمائی تھی اور جس میں آپ نے فرمایا تھا کہ کانفرنس کی تعلیمی تحریک ایسی ہے جیسے کہ کسی مردہ کو موم وروغن کے ذریعہ سے زندہ کرنے کی کوشش کرنا۔اس سے مجھ کو بحث نہیں کہ آپ نے جس رائے کا اظہار کیا تھا وہ صحیح ہے یا کیا؟......سالہا سال کی کوشش کے بعد بڑی مشکلات کا سامنا کرکے راولپنڈی میں کانفرنس کا اجلاس اس غرض سے کیا گیا تھا کہ سرحد کے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف توجہ ہو اور شمال مغربی اضلاع میں جو اسلامی خطہ ہے اور جو جہل کی تاریکی کی وجہ سے نہایت پستی کی حالت میں ہے اس میں تعلیم کے ذریعہ سے بیداری کا سامان پیدا ہو چنانچہ حتی الامکان مختلف تحریکوں اور لیکچروں کے ذریعہ حاضرین کو تعلیم کی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔لیکن آپ نے آخری اجلاس میں جو تقریر فرمائی اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ جو اثر کانفرنس کے مقاصد کی تائید میں پیدا ہوا تھا وہ بہت کچھ زائل ہو گیا۔''[۶]

غرضیکہ مولانا کو جلسہ میں شرکت کی اجازت نہیں دی گئی۔اس خط کے جواب میں



مولانا نے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کو خط لکھا کہ میں کسی بھی گوشہ میں خدا اور رسول کا پیغام پہنچا سکتا ہوں۔اگر بقول ان کے وہ خدا اور رسول کا ہی پیغام پہنچانا چاہتے تھے تو کانفرنس کے اسٹیج کی کیا حاجت تھی۔ان کے پاس تو بہت سے پلیٹ فارم تھے۔کانگریس کے پلیٹ فارم کے علاوہ الہلال والبلاغ تھے۔مقصد خدا اور رسول کا پیغام پہنچانا نہیں تھا بلکہ رسول اللہ کا نام نامی استعمال کرکے کانفرنس کے مقاصد کو نقصان پہنچانا تھا۔جیسا کہ اس سے پہلے وہ جلسۂ راولپنڈی میں کرچکے تھے۔اور جہاں تک ہوسکے مسلمانوں کی تعلیمی ترقیوں کی راہ میں روڑے اٹکانا تھا۔

''کانفرنس پنڈال آپ مجھ پر بند کرکے دیکھ لیں میں کسی اور گوشہ میں خدا اور اس کے رسول کا پیغام مسلمانوں تک پہنچا سکتا ہوں۔میرا ذاتی نقصان اس سے کچھ نہ ہوگا۔اگر کوئی شخص اس حماقت میں گرفتار ہے کہ کانفرنس کا پلیٹ فارم میرے لیے بڑی اور عجیب وغریب دولت ہے جس سے محروم ہوکر لٹ جاؤں گا تو اس کی حماقت بہت افسوس ناک ہے۔اگر آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس میں میری تقریر روک کرکوئی بڑی کامیابی حاصل کرسکتے ہیں تو بسم اللہ اس کا بھی تجربہ ہوجائے گا جیسا کہ چار پانچ سال سے بیسیوں تجربے آپ لوگ کرچکے ہیں مجھے اللہ اور رسول کی ان تعلیمات کو کہنا لکھنا مدون کرنا ہے جن کو میری بصیرت حق سمجھتی ہے۔''[۷]

○

**حواشی:**

(۱) حیات جاوید، ص:۳۴۷
(۲) الہلال، دسمبر ۱۹۱۳ء
(۳) ایضاً
(۴) ایضاً
(۵) ایم ایم ہال میگزین، ......، ص:۸۲
(۶) ایضاً، ص:۱۲۶
(۷) البلاغ ۱۶ر جنوری ۱۹۱۶ء، ص:۱۲۵

# اتحادِ اسلامی

## خلافت تحریک اور مسلم یونیورسٹی

مولانا آزاد کا نظریۂ پان اسلامازم بہت عجیب وغریب تھا وہ اسلام کے رشتے سے دنیا کے تمام مسلمانوں کو ایک قوم تصور کرتے تھے لیکن اسی رشتہ سے ہندوستان کے مسلمان ایک قوم نہ تھے حتیٰ کہ مسلمانوں کے لیے الگ سے تعلیمی کوششوں کو بھی وہ ناگواری کی نظر سے دیکھتے تھے کلکتہ میں اتحاد اسلامی کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے مسلم یونیورسٹی تحریک کو اتحاد بین المسلمین کے لیے نقصان دہ بتایا اور یونیورسٹی کے بننے نہ بننے کے مسئلہ کا موازنہ بقائے اسلام سے کیا:

> ''اے حضرات! یاد رکھئے آج اسلام کے لیے مسلمانوں کے لیے کوئی وطنی اور مقامی تحریک سود مند نہیں ہوسکتی...... ایک قوم جو ریگستان عرب سے دیوار چین تک آباد ہے اس کو زمین کے کسی خاص ٹکڑے کے تغیر سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔''[1]

یعنی چونکہ مسلمان عرب سے چین تک آباد ہیں لہٰذا کسی ایک جگہ کے ترقی کر لینے سے مسلمانوں پر کوئی اثر نہیں پڑ سکا۔ یہ بہت عجیب تر خیال ہے۔ تحریک جہاں بھی شروع ہو کوئی نہ کوئی مقام تو ہوگا ہی لہٰذا ہر تحریک مقامی کہلائی جاسکتی ہے۔ اسلام کی تحریک مکہ سے شروع ہوئی تو یہ تحریک بھی اس منطق سے مقامی کہلائی جاسکتی ہے۔ آگے فرمایا:

> ''جس قدر مقامی کوششیں آج عمل میں آرہی ہیں خواہ وہ مصر میں ہوں یا ترکی میں الجزائر میں ہوں یا اس تیرہ زار ہند میں میرے عقیدے میں یہ سب کچھ کاہن شیطان کا عمل السحر ہے۔ جو اس لیے



> سلاتا ہے کہ سونے والوں کا اس کو اٹھنا پسند نہیں۔'' (ایضاً)

یعنی یہ جو مقامی کوشش علی گڑھ میں مسلمانوں میں تعلیمی انقلاب لانے کی ہو رہی ہے کاہن شیطان کا جادو ہے۔

مولانا کی نظر میں اسلامی اخوت اور پان اسلام ازم کا جذبہ مسلمانوں سے ختم ہوگیا تھا اور اس کا ثبوت یہ تھا کہ مسلمان علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنا رہے تھے اگر اصلی اخوت اسلامی مسلمانوں میں باقی ہوتی تو مسلمان یونیورسٹی ہرگز نہ بناتے۔ مولانا کے ذہن میں عجیب وغریب خیالات ہر وقت آتے رہتے تھے اور جہاں جو دل میں آتا کہہ دیتے تھے معنی یا دلیل سے کوئی مطلب نہیں تھا صرف مقصد واضح تھا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کی جانے والی کوششوں میں رکاوٹ ڈالی جائے، فرمایا:

> ''ہم میں سچا پان اسلام ازم یا بالفاظ دیگر اصلی رشتہ اخوت دینی باقی نہیں رہا اور کیوں کر باقی رہے جب کہ ہندستان میں ایسے عظیم الشان اشغال ہمارے لیے موجود ہیں جو نفس اسلام کے بقا سے بھی زیادہ اہم ہیں۔ سب سے مقدم امر یہ ہے کہ ہمیں علی گڑھ میں ایک یونیورسٹی بنانی ہے اس کے لیے تیس لاکھ روپیہ جمع کرنا ہے۔ یہ مانا کہ دنیا کی کوئی سرزمین ہے جہاں خود اسلام کے بقا وفنا کا سوال درپیش ہے مگر اس کو کیا کیجئے کہ مسلم یونیورسٹی ہمارے قومی مقاصد کا اصلی نصب العین کعبۂ علی گڑھ کے شب زندہ داران عبادت کی چہل سالہ تہجد گزاری کی مراد آرزو اور ہمارے رہنمائے اول (یعنی سرسید) کی دی ہوئی شریعت تعلیم کا یوم تکمیل ہے۔''[2]

آگے طنز کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

> ''جس دن یونیورسٹی بن جائے گی اس دن **الیوم اکملت لکم دینکم............ اسلام دینا** کی وحی اسٹریچی ہال کی چھت پر نازل ہوگی۔''

مولانا اسلام کی سیاسی طاقت کے قائم رہنے کا انحصار اس بات پر سمجھتے تھے کہ مسلم یونیورسٹی نہ بنے۔ یا تو وہ اتنے ہی کم تر درجہ کی عقل کے انسان تھے کہ واقعی ان کا ایسا خیال تھا یا پھر یہ انتہائی

درجہ کی کینہ پروری اور چالاکی تھی کہ انھوں نے بھرے جلسہ میں ایسے خیالات کا اظہار کیا:

''اے عزیزانِ ملت! سوال قوموں اور ملکوں کی زندگی کا نہیں ہے
بلکہ اسلام کی زندگی کا سوال ہے فرض کیجئے کہ ہندوستان کے
مسلمانوں نے اپنی ترقی کے تمام منصوبے مکمل کر لیے اور ان کا ہر فرد
تعلیم اور دولت کا ایک مرتب طلائی بت بن گیا۔لیکن اگر سرے سے
خود اسلام کی سیاسی طاقت پر چھری چل گئی تو پھر علی گڑھ میں یونیورسٹی
ہی نہیں بلکہ سونے اور چاندی کی بہشت شداد ہی بن جائے مگر اس
کے حور و غلماں کس کا ترانہ گائیں گے۔'' (ایضاً)

معمولی تعلیم یافتہ انسان بھی اس دلیل کی بے وزنی اور خیال کی گمراہی کو بہ آسانی محسوس کرسکتا ہے کہ اگر یونیورسٹی نہ بنائی جائے تو اسلام کی سیاسی طاقت محفوظ رہے گی۔ پھر ایک یونیورسٹی اور بہشت شداد کا کیا تقابل۔ ہمارا ذہن و دماغ ان میں کسی طرح کی مماثلت قبول کرنے سے انکار کرتا ہے ایک عیش وجسمانی راحت اور سکون کی جگہ دوسری دماغ سوزی اور فطرت کے اسرار و رموز معلوم کرنے کا مرکز تعلیم۔ایسا لگتا ہے جیسے مولانا یونیورسٹی کے معنی سے ہی ناواقف تھے یا جان بوجھ کر ملت مسلمہ کو خلافت بچانے کا حیلہ کر کے ایک اہم تعمیری کام سے روکنا چاہتے تھے جو بفضل تعالیٰ پورا ہو کر رہا۔ملت اسلامیہ کے مجموعی ارادے مال و اسباب اور مخلص بزرگوں کی روز و شب کی محنت کا ثمرہ آج قوم کے سامنے زندہ و تابندہ ہے۔دنیائے اسلام میں جتنی بھی یونیورسٹیاں ہیں سب کی سب حکومتوں کی سرپرستی اور حکمرانوں کے حکم سے قائم ہوئیں۔لیکن یہ شرف علی گڑھ کو ہی حاصل ہے کہ ملت اسلامیہ کے اپنے پیسہ اور محنت سے اس کا وجود عمل میں آیا۔تحریک خلافت اور ترک موالات کا ایک شاخسانہ یہ بھی تھا کہ سرکاری اداروں کا بائیکاٹ کیا جائے اور جو طلبا وہاں سے نکلیں ان کی تعلیم کا انتظام نئے مدارس قائم کر کے کیا جائے اسی طرح کا ایک مدرسہ مولانا آزاد نے جامع مسجد کلکتہ میں اپنی نگرانی میں جاری کیا تھا اس میں بیشتر طلباء مدرسہ عالیہ کلکتہ کے تھے جو مولانا آزاد کی ترغیب پر وہاں سے نکل آئے تھے۔اس مدرسہ کا افتتاح گاندھی جی نے ۱۳؍دسمبر ۱۹۲۰ء کو کیا تھا۔ترک موالات کی تحریک پر جو طلبہ اپنی تعلیم اور کیریئر کو چھوڑ کر سیاسی



ایجیٹیشن میں شامل ہوگئے تھے ان کے بارے میں مولانا آزاد یہ کہتے تھے کہ انھوں نے احکام الٰہی کی پابندی کرتے ہوئے تعلیم چھوڑ دی یعنی یہ حکم الٰہی تھا کہ طلباء تعلیم چھوڑ دیں۔حکم الٰہی کی بھی خوب ہے اور مولانا آزاد کو ذرا بھی شک نہیں تھا کہ یہ طلباء احکام الٰہی کی پابندی کررہے ہیں اور انھوں نے دنیا پر دین کو ترجیح دی ہے۔

''یہ وہ جماعت ہے جس نے دین کو دنیا پر ترجیح دی ہے جس نے
مدرسہ عالیہ کی شاندار عمارت اور اس کے عالیشان ہوسٹل کو محض حکم
الٰہی کی پابندی اور سچے ہندوستانی کی حیثیت سے چھوڑ دیا۔اور اس
طرح وہاں سے نکلی ہے کہ اسے یہ بھی خبر نہ تھی کہ کہاں جاری ہے
کہاں رہے گی۔یہ وہ جماعت ہے جس نے بھوک پیاس کی سختی جھیلی
ہے اور جاڑے کی طویل راتیں زمین پر گزاری ہیں۔'' ۳؎

علی گڑھ میں اس تحریک کا کچھ ایسا زور نہ تھا،اس لیے مولانا نے علی گڑھ کے طلباء کی ملامت کی:

''علی گڑھ کے کسی طالب علم نے کالج نہیں چھوڑا جب تک دو دو گھنٹے
مجھ سے ردوکد کر کے اطمینان نہیں کر لیا کہ سرکاری تعلیم چھوڑنے کے
بعد بھی وہ روپیہ کما سکیں گے لیکن ان طلباء (مدرسہ عالیہ کے طلباء)
میں ایک بار بھی ایسا نہیں ہے جس نے یہ سوال کیا ہو بلکہ جس وقت
ان کو احکام شروع بتا دیے گئے فوراً اطاعت کا سر جھکا یا۔'' ۴؎

شریعت اور خدا و رسول کے الفاظ استعمال کیے بغیر مولانا کوئی بات نہیں کہتے تھے۔ یہاں بھی شریعت کا حوالہ دیا کہ یہ مولانا کی نظر میں شریعت کا حکم تھا کہ تعلیم چھوڑ دو۔ یہ کہنا کہ ہماری سیاسی جماعت کا حکم ہے یا انگریزوں سے لڑنے کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے ایک دوسری بات ہوئی لیکن شریعت کا حوالہ دینا یقینی طور سے صریح بے ایمانی ہوئی۔مولانا کی نظر میں موڈرن کالجوں میں دی جانے والی تعلیم علم کے حقیقی مقصد کو ختم کر دیتی ہے اور طلباء محض پیسے کمانے اور چاول، گیہوں پانے کے طلب گار ہو جاتے ہیں اور قدیم عربی مدارس میں پڑھنے والے طلباء ہی دراصل علم دوست ہیں:

> ''ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل کو پہنچائے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہو گیا...... یہ بڑی بڑی عمارتیں جو انگریزی تعلیم کی نوآبادیاں ہیں کس مخلوق سے بھری ہوئی ہیں؟ عشاقان علم اور شیفتگان حقیقت سے؟ نہیں ایک مٹھی گیہوں اور ایک پیالہ چاول کے پرستاروں سے۔علم کی اس عام توہین وتذلیل کی تاریکی میں سچی علم پرستی کی ایک روشنی برابر چمکتی ہے۔یہ ہندوستان کے طالبین علم کی وہ جماعتیں ہیں جو اسلام کے قدیم مذہبی علوم اور مذہبی زبان کے فنون مختلف عربی مدرسوں میں حاصل کر رہی ہیں۔(ایضاً)

علم بہرحال علم ہے چاہے کہیں حاصل کیا جائے۔لیکن مولانا کا یہ فتویٰ کہ صرف عربی مدارس میں ہی پڑھنے والے طلباء حقیقی معنوں میں طالب علم ہیں باقی نہیں شاید صحیح نہیں ہے۔تعلیم چھوڑ کر چلے آنے والے طلباء کی تعریف کرتے ہوئے ایک بار پھر کہا:

> ''یہ طبقہ جذبۂ علم پرستی اور رضائے الٰہی کے سوا اور کوئی دنیاوی غرض نہیں رکھتا اور اس لیے ہندوستان بھر میں علم کو علم کے لیے پڑھنے والی اگر کوئی جماعت ہے تو وہ عربی مدارس کی ہی جماعت ہو سکتی ہے۔''(ایضاً)

علم کے حوالے سے بھی یونیورسٹی میں پڑھنے والے طلباء کی مخالفت کر ڈالی کہ یہی گوشہ باقی رہ گیا تھا۔مدرسہ عالیہ کے طلباء نے چونکہ مولانا کے کہنے پر خلافت کی حمایت میں تعلیم چھوڑ دی تھی اس لیے ان کو بہلانے کے لیے ایسا کیا جا رہا تھا۔مولانا نے ہر پہلو اور ہر طریقہ سے یونیورسٹی بننے کی مخالفت کی اور یہ سب وہ بنگالی ہندو کانگریسیوں کی شہہ پر کر رہے تھے۔الہلال والبلاغ کلکتہ سے کانگریسیوں کی سرپرستی اور روپیہ سے نکلتے رہے ورنہ ایک سڑک چھاپ عالم جس کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو کیسے باتصویر رسالہ نکال سکتا تھا؟ میں نکلتے رہے۔تحریک خلافت سے بھی مولانا نے یونیورسٹی بننے کی مخالفت کا کام لینا چاہا۔دراصل مولانا خلافت عثمانیہ میں دلچسپی نہیں رکھتے تھے بلکہ ان کے اور گاندھی جی کے نزدیک یہ تحریک ہندوستان کے نیشنل ازم کو بڑھاوا دینے کا بہت بڑا ذریعہ بن گئی تھی



اور بارہا مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ خلافت کی پہلی منزل ہندوستان کی آزادی ہے چنانچہ ان کے خطبات جو خلافت کے پلیٹ فارم سے انھوں نے دیے ان سب میں یہ بات واضح ہو کر آتی ہے کہ مسلمانوں کو پہلے کانگریس کے نیشنل ازم میں شامل ہو کر جنگ آزادی لڑنی چاہیے۔ہندوؤں نے بھی تحریک خلافت کا ساتھ اسی نظریہ کے تحت دیا کہ اس سے انڈین نیشنل ازم مضبوط ہوگا جواہر لال نہرو لکھتے ہیں کہ مسلمانوں کا ترکی کی حکومت میں دلچسپی رکھنا اور دوسرے ممالک کے معاملات پر نظر رکھنا ہندوستانی نیشنل ازم کے مخالف نہ تھا اس لیے تعلیم یافتہ ہندو ان نظریات کو پسند کرتے تھے۔

> THE INDIAN MUSLIMS SOUGHT TO DRIVE SOME PSYCHOLOGICAL SATISFACTION FROM A CONTEMPLATION OF ISLAM'S PAST GREATNESS CHIEFLY IN OTHER COUNTREIS AND IN THE FACT OF CONTINUANCE OF TURKEY AS AN INDEPENDENT MUSLIM POWER,PRACTICALLY THE ONLY ONE LEFT.THIS FEELING WAS NOT OPPOSED TO OR IN CONFLICT WITH INDIAN NATIONALISM. INDEED MANY HINDUS ADMIRED AND WERE WELL ACQUAINTED WITH ISLAMIC HISTORY.(DISCOVERY OF INDIA, P.346)

خلافت تحریک دراصل ہندی مسلمانوں کے احساس کمتری کی پیداوار تھی کیونکہ پورے مغل مسلم دور میں کسی بھی بادشاہ نے ترکی کی خلافت کو نہیں مانا۔جب ہندوستان سے مسلم حکمرانی ختم ہونے لگی اور مسلمانوں میں محکومی کا احساس جاگنے لگا تو انھوں نے اس خیال میں پناہ ڈھونڈ لی کہ دنیا میں ہماری حکومتیں بھی ہیں اور ان میں ترکی کی خلافت سب سے اہم تھی لہٰذا ہند میں مسلم حکومتوں کے انہدام کے بعد ہی مسجدوں میں خطبہ جمعہ میں ترکی خلیفہ کا نام لیا جانے لگا۔

یہ طریقہ ۱۸۵۷ء کے بعد اور بھی زیادہ رائج ہو گیا اور ہندوستانی مسلمانوں نے اپنے آپ کو خلافت سے جوڑ کر نفسیاتی حفاظت کا احساس پیدا کر لیا۔سرسید کی زندگی میں جب ترکی اور روس کی جنگ میں خلافت کو خطرہ پیدا ہوا تو ہندوستانی مسلمانوں نے برطانوی ہند کی حکومت پر زور ڈالا کہ وہ ترکی کا ساتھ دے۔سرسید نے اس وقت بھی کسی باہری حکومت

کے لیے ملک میں تحریک چلائے جانے کی مخالفت کی تھی۔ کسی باہری حکومت سے وابستگی کے کیا معنی تھے اگر مسلم حکومت ہوتی یا مسلمان آزاد ہوتے تو وابستگی کچھ معنی بھی رکھتی۔ جب ہندوستان کے مغل بادشاہوں نے ان کو نہ مانا اور اس وقت مسلمانوں نے کچھ احتجاج نہ کیا تو غلام ہندوستان کے غلام مسلمان ان سے کس طرح کی وابستگی رکھ سکتے تھے لیکن کچھ جذباتی لوگوں نے تاریخ کو کلیتاً نظرانداز کرکے ہندوستان میں ایک زبردست تحریک خلافت کے قیام کی چلائی۔ اپنی حکومت تو ہزاروں میل سے آئے اجنبی تاجروں کو گنوا بیٹھے اور ہزاروں میل دور واقع ملک میں ہونے والے واقعات پر ہندوستان میں تحریک چلا کر اثرانداز ہونا چاہتے تھے۔ لہٰذا تاریخ نے بہت جلد فیصلہ بھی سنا دیا اور صرف دس گیارہ سال کے عرصہ میں نہ خلافت رہی اور نہ خلافت تحریک اور نہ اس کے قائدین۔ اگر فائدہ کسی کا ہوا تو کانگریس کا کہ وفادار جماعت باغی جماعت بن کر ابھر آئی بہت سے خلافت قائدین کو اپنی غلطیوں کا احساس ہوا جن میں علی برادران خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے اپنے علی گڑھ سے تعلق کی بنیاد پر پوری یونیورسٹی کو اس بے فائدہ اور نقصان دہ تحریک میں شامل کر دینا چاہا تھا مگر پوری طرح کامیاب نہ ہو سکے تھے۔ علی برادران نے سرسید کے اس مشورہ کے خلاف عمل کیا تھا کہ مسلمان خلافت ترکی میں کسی طرح کی دلچسپی نہ لیں کہ ان کی نظر میں خلافت کا دور صرف پہلے چار خلیفہ تک رہا تھا بعد کو خلافت ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تھی اور مسلم بادشاہوں نے خلیفہ کا نام اختیار کر لیا تھا۔ خلافت راشدہ شروع کے چار خلفاء تک محدود ہے اس کے علاوہ جتنے بھی بادشاہوں نے خلافت کا نام اختیار کیا خلیفہ نہیں کہلائے جا سکتے۔ شروع کے خلفاء کے بعد یہ منصب غلط اور ناواجب طریقے سے اپنایا گیا اسی لیے سرسید خلافت کی موجودگی سے ہی انکار کرتے تھے۔ جواہر لال نہرو لکھتے ہیں:

> SIR SYED HAD OPPSED THIS AND WRITTED AGAINST INDIANS INTERESTING THEMSELVES IN TURKEY AND THE SULTANATE (DISCOVERY OF INDIA, P.349)

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کو اپنے پیروں پر کھڑا کرنا چاہتے تھے۔ وہ تعلیم اور دوسری اصلاحی تحریکوں کے ذریعہ مردہ قوم میں ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔ خلافت تحریک سے



بہت سے علی گڑھ مخالفین لیڈروں نے جس میں مولانا آزاد بھی شامل تھے فائدہ اٹھانا چاہا اور مسلم یونیورسٹی بننے کی مخالفت کی۔

علی برادران اس تحریک میں پورے خلوص اور نیک نیتی سے شامل تھے۔ لہٰذا جیسے ہی انہیں حقیقت کا علم ہوا انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں کے ذریعہ کانگریس اور دوسرے قوم ور لیڈروں کی مخالفت کی۔ مگر مولانا آزاد کو خلافت میں بالکل دلچسپی نہ تھی وہ تو اس تحریک کا کانگریس کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کرتے تھے۔ آگرہ ۱۹۲۱ء کی خلافت کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں فرمایا:

> ''پہلا میدان جو آپ کی کامیابی کے لیے اولین قیام گاہ تھا وہ میدان ہندوستان سے باہر کا نہ تھا، وہ عراق و شام......اور سمرنا کا میدان نہ تھا اور جہاں مسلمانوں کا خون بہہ چکا تھا۔ وہ میدان آپ کے ایمان کا عزم کا عمل کا میدان تھا اور ان تمام لفظوں کی جگہ ایک لفظ بول دوں وہ میدان آپ کے ملک کا تھا اور آپ کے ملک کی فتح و شکست کا تھا............آپ کی کامیابی اس پر موقوف تھی کہ سب سے پہلے آپ اپنے پہلے میدان کو استوار کرتے جب تک اسے فتح نہ کرتے دوسرے میدان میں قدم نہ رکھ سکتے۔ تحریک خلافت کے لیے سب سے پہلے خود ہندوستان کا میدان تھا...... ہندوستان میں بسنے والی قوموں کا میدان تھا۔''[۵]

اسی خطبہ میں واضح طور سے فرمایا کہ:

> ''آپ کی تحریک خلافت ہندوستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے عمل چاہتا ہے۔''[٦]

مولانا خلافت تحریک کے پلیٹ فارم کو ہندوستان کی آزادی کے لیے استعمال کر رہے تھے انہیں قطعاً بھی خلافت عثمانیہ سے دلچسپی نہ تھی۔ بلکہ وہ عثمانی خلیفہ کو غاصب سمجھتے تھے لیکن جب تک خلافت تحریک چلتی رہی مولانا نے ایک لفظ بھی اپنے اصلی نظریے کے بارے میں نہ کہا بلکہ مسلمانوں کو صریح دھوکے میں رکھا کہ گویا مولانا کو خلافت کے احیاء کی بہت زیادہ فکر

ہے جگہ جگہ جلسوں میں شریک ہوتے تھے اور کانفرنسیں بلاتے تھے لیکن اصلی خیالات کو بہت خوبی سے چھپائے رکھا۔ جب کمال اتاترک نے خلافت ختم کردی تو مولانا کی بلی تھیلے سے باہر آ گئی اور کمال اتاترک کو مبارک باد کا پیغام بھیجا۔ ایک بار صحافیوں نے مولانا کو گھیرا اور پوچھا کہ کمال اتاترک کے اس عمل کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں مولانا نے اپنے نظریہ کی وضاحت اپنے ایک مضمون میں کی جو لاہور کے مشہور اخبار ''زمیندار'' میں اپریل ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔ اس مضمون میں مولانا نے کمال اتاترک کے عمل کی حمایت کی اور خاتمۂ خلافت کو ایک مستحسن فعل قرار دیا کہ خلافت عثمانیہ ان کے نزدیک اسلامی خلافت نہ تھی یہ نکتہ مولانا کو خلافت تحریک کی حمایت کرتے ہوئے نہ سوجھا اور پورے جوش سے خلافت کانفرنس میں شریک رہے جیسے ہی خلافت ختم ہوئی فرمایا:

> ''جس منصب خلافت کو انھوں نے (کمال اتاترک) نے موقوف کیا ہے وہ اسلامی خلافت نہ تھی۔ یہ ایک خودساختہ منصب تھا جو خود انہی نے غلطی سے قرار دیا تھا۔ جس دن اس حکومت نے اپنا صدر منتخب کیا اسی دن خلیفہ بھی منتخب ہو گیا کیونکہ خلیفہ اور رئیس حکومت دو الگ منصب نہیں ہیں ایک ہی منصب کے دو مختلف نام ہیں پس اگر انھوں نے اس خودساختہ منصب کو موقوف کردیا اور کہتے ہیں کہ حکومت کی موجودگی میں یہ ضروری ہے تو جہاں تک اسلامی نظام خلافت کا تعلق ہے ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہم نہ اس کے خواہشمند تھے نہ ہم نے اسے صحیح سمجھا تھا۔''[۷]

مولانا کمال اتاترک کو ہی خلیفہ مانتے تھے انکی نظر میں ایک صدر مملکت جیسا کہ کمال اتاتک تھے خلیفہ کا دوسرا نام تھا بلکہ امیر المومنین کا لقب بھی انھوں نے کمال اتاترک کو اپنی جانب سے بخش دیا تھا:

> ''آج بھی حکومت ترکیہ ایک رئیس وصدر کا منصب قرار دے چکی ہے یا نہیں؟ اگر قرار دے چکی ہے تو اسی منصب کا نام اسلام کی بول چال میں خلیفہ اور امیر المومنین ہے پھر یہ کیسی مصیبت ہے کہ ایک



> حقیقت کے اعتراف حال سے تو انکار نہیں لیکن اس کے نام سے انکار ہے۔''[۸]

کسی بھی قوم میں مولانا آزاد سے زیادہ جھوٹا کوئی دوسرا قائد تلاش کر کے دکھایئے۔

O

**حواشی:**

(۱) خطبات آزاد،ص:۲۷

(۲) ایضاً،ص:۲۷

(۳) ایضاً،ص:۳۸

(۴) ایضاً،ص:۳۸

(۵) ایضاً،ص:۴۴

(۶) ایضاً،ص:۵۸

(۷) غلام رسول مہر: تبرکات آزاد،ص:۲۱۱

(۸) ایضاً،ص:۲۱۳

## وعظ یوسفی

# مولانا کا مسلمانوں سے خطاب

## مسلمان انسانیت کی پیشانی پر بدبختی کا داغ

وعظ یوسفی کے عنوان سے مولانا نے ایک مضمون دسمبر ۱۹۱۲ء کے الہلال میں شائع کیا۔اس عنوان کا پس منظر یہ ہے کہ یوسف علیہا السلام کو خواب کی تعبیر بتانی آتی تھی۔ بادشاہ مصر کے ایک خواب کی تعبیر انھوں نے بتائی تھی کہ سات سال بہت زیادہ اناج پیدا ہوگا اور سات سال سوکھا پڑے گا لہٰذا یہی ہوا اور بادشاہ نے ان کے مشورہ پر عمل کر کے ملک کو تباہی سے بچالیا۔ مولانا بھی اس مضمون میں یوسف علیہ السلام کی طرح آئندہ کی باتیں بتارہے ہیں کہ اپنا درجہ ان سے کسی بھی طرح کم نہیں سمجھتے تھے۔ اس مضمون سے مولانا کے مسلمانوں کے تئیں اصلی جذبات بالکل واضح ہو کر آ گئے ہیں جن خطابات اور گندے لفظوں سے مولانا نے مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے وہ ان کی مسلمانوں کے تئیں دلچسپی کا واضح ثبوت ہے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ مسلمان جنگ آزادی میں کوئی حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ ۱۹۱۲ء میں کسی آزادی کا کوئی تصور تک نہ تھا اور آزادی کا پہلا رزولوشن ۱۹۳۰ء میں پاس ہوا۔ اس سے پہلے جب حسرت موہانی نے ۱۹۲۱ء میں کامل آزادی کا رزولوشن کانگریس میں پاس کرانا چاہا تو گاندھی جی اور کانگریس نے اس تجویز کو ٹھکرا دیا اور صرف چند اصلاحات کا مطالبہ کیا لیکن مولانا پھر بھی مسلمانوں کو آزادی کی راہ میں روڑہ تصور کرتے رہے۔

> ''جو ہونے والا ہے اسے کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی یقیناً ایک دن آئے گا جب ہندوستان کا آخری سیاسی انقلاب ہو چکا ہوگا ...... وہ سب کچھ ہو چکا ہوگا جس کا ہونا ضرور ہے۔ فرض کیجیے کہ اس



> وقت ملکی ترقی کی تاریخ لکھی گئی تو آپ کو معلوم ہے کہ اس میں ہندوستان کے سات کروڑ انسانوں کی نسبت کیا لکھا جائے گا۔''[۱]

مولانا ہمیشہ ملک کی ترقی کی بات کرتے تھے ان کی زبان سے کبھی بھی مسلمانوں کی ترقی کا ذکر نہیں نکلا۔

> ''اس میں لکھا جائے گا کہ ایک بدبخت اور زبون طالع قوم جو ہمیشہ ملکی ترقی کے لیے ایک روک، ملک کی فلاح کے لیے ایک بدقسمتی، آزادی میں سنگ گراں، حاکمانہ طمع کا کھلونا، ہندوستانی پیشانی پر ایک گہرا زخم اور گورنمنٹ کے ہاتھ میں ملک کی امنگوں کو پامال کرنے کے لیے ایک پتھر بن کر رہی......''[۲]

مولانا کے نزدیک مسلمان بدبخت، زبان طالع اور حاکمانہ طمع کا کھلونا تھے۔ مولانا کا واحد مقصد ملک کی ترقی تھا ملک کی ترقی کے معنی یہ نہیں ہوتے کہ پیڑ پودوں اور جنگلوں و ندیوں کی ترقی ہو بلکہ اس میں بسنے والے انسانوں کی ترقی ہو۔ جس طرح کی ترقی کی بات کانگریس کرتی تھی اس کا مطلب یہ تھا کہ صرف ایک فرقہ ملک میں حکمراں ہو اور دوسرا فرقہ اس کا محکوم۔ مولانا اس راہ میں کانگریس سے بھی زیادہ بڑھ چڑھ کر باتیں کیا کرتے تھے:

> ''اس میں لکھا جائے گا کہ ایک قابل رحم مگر مسحور انسانوں کا گلہ جسے کسی زبردست کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا تھا...... جس میں کوئی انسانی ارادہ کوئی انسانی دماغ کوئی انسانی حرکت اور کوئی انسانی زندگی کا ثبوت نہ تھا جو نہ اپنے دماغ سے سوچ سکتی تھی نہ اپنی آواز سے بول سکتی تھی...... ایک وجود شل جو صرف زمین کے لیے بار ہو۔ ایک درخت جو حرکت کے لیے ہوا کا منتظر ہو...... اور سب سے آخر میں یہ کہ ایک بدبختی کا داغ جو انسانیت کی پیشانی پر ہو۔''[۳]

مولانا سمجھتے تھے کہ کسی کاہن نے اپنے منتر سے جانور بنا دیا ہے۔ ہندی مسلمان مولانا کے نزدیک انسان ہی نہ تھے بلکہ جانور تھے جو نہ اپنی آواز سے بول سکتے تھے، نہ سوچ سکتے تھے اور نہ عمل کر سکتے تھے۔ اس طرح کی عمدہ اور دانشمندانہ باتیں ہمارا دعویٰ ہے کہ دنیا میں

کسی لیڈر نے بھی نہ کی ہوں گی۔ افریقہ کے گھنے جنگلوں میں رہنے والے کسی قدیم قبیلہ کے قائد نے بھی ایسے الفاظ اپنی قوم کے لیے استعمال نہ کے ہوں گے اوپر سے قرآن کی آیت بھی دلیل میں پیش کردی اب تو کسی قسم کا شک ہی باقی نہ رہا کہ مولانا سچ فرما رہے ہیں۔

ترجمہ: ان کے پاس دل ہیں مگر سوچتے نہیں، آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر سنتے نہیں ان کی مثال چارپایوں کی سی ہے بلکہ اس سے بھی بدتر، وہی ہیں جن کو غفلت کی سرشاری نے انسانیت سے محروم کردیا۔'' (القرآن:۲۸:۸۴)۴؎

مذہبی علماء یہ بتائیں گے کہ ملک کی ترقی کے لیے اور آزادی کے لیے کوشش نہ کرنے والوں کے لیے یہ آیت اتری ہے یا مولانا نے اپنی مرضی سے یہ سمجھا ہے کہ اگر واقعی یہ آیت اسی مقصد سے اتری ہے تو بھی تمام مسلمان گنہگار قرار نہیں دیے جاسکتے کیونکہ مسلمان من حیث القوم اپنے طریقہ سے آزادی کے لیے کوشش کر رہے تھے۔

''پھر اس میں لکھا جائے گا کہ یہ حالت اس قوم کی تھی جو آہ ثم آہ کہ مسلم تھی............اس کا فرض تھا کہ ہندوستان میں وہ سب کچھ کرتی جو اوروں نے کیا اور جس کو اپنے وجود زبان سے اس نے ہمیشہ روکا جو مسلم تھی۔ پس چاہیے تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور ملک کی ترقی کا جھنڈا اس کے ہاتھ میں ہوتا اور ہندوستان کی تمام قومیں اس کے پیچھے ہوتیں کیونکہ اسلام اس کے پاس تھا۔''۵؎

مولانا مسلمانوں کا یہ فرض بتاتے تھے کہ وہ ہندوؤں کی نقل کرتے اور جو کچھ بھی ملک کی آزادی اور ترقی کے لیے وہ کر رہے تھے مسلمان بھی ویسا ہی کرتے کیونکہ اسلام ان کے پاس تھا۔ مولانا کا اسلام ضرور یہ فرض عائد کرسکتا ہے مگر رسول کا اسلام شاید ایسی تعلیم نہیں دیتا۔

''اگر تم کہو کہ تاریخ ہند میں ہمارے لیے بھی شرف وعظمت کا ایک باب ہوگا تو تم خاموش رہو اور مجھ سے کہو کہ میں اسے پڑھوں۔ بے شک ایک باب ہوگا مگر جانتے ہو اس میں کیا ہوگا؟ اس میں لکھا ہوگا کہ ہندوستان ملکی ترقی اور ملکی آزادی کی راہ میں بڑھا ہندوؤں نے



اس کے لے اپنے سروں کو ہتھیلی پر رکھا مگر مسلمان غاروں میں چھپ گئے۔ ملک غیر منصفانہ قوانین کا شاکی تھا ہندوؤں نے اس کے لیے جہاد شروع کیا پر اس قوم مجاہد نے یہی نہیں کیا کہ صرف چپ رہی بلکہ مجنونانہ چیخ اٹھی کہ تمام کام کرنے والے باغی ہیں۔''۶؎

مولانا اگر اتنی ہی ضد کر رہے ہیں کہ ہندو ملک کی آزادی کے لیے جانیں قربان کر رہے تھے تو ہم مان لیتے ہیں کہ ایسا ہی تھا اور مسلمان واقعی غاروں میں چھپ گئے تھے مگر آخر مسلمان ان کا ساتھ کیوں دیتے۔ کانگریس جس طرح کا نظام ملک میں لانا چاہتی تھی اس میں اکثریت کی حکومت اقلیت پر لازمی تھی۔ جمہوریت میں 51% کی 49% پر حکومت ہوتی ہے یہاں تو 20 اور 80 کا فرق تھا۔ دانشمند قائدین نے یہی فیصلہ کیا کہ مسلمان کانگریس سے علیحدہ رہیں کیونکہ اس نظام میں جو کانگریس لانا چاہتی ہے مسلمان محکوم ہو جائیں گے۔

''ہندو اٹھے اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو ملکی جہاد کے لیے وقف کردیا لیکن عین اس وقت جب کہ یہ سب کچھ ہو رہا تھا...... جبکہ وہ ملک اور ملک کی آزادی کی آگ سلگا رہے تھے تو یہ تعلیم کی ٹھنڈی لاش لیے بیٹھے تھے۔ ان کے کانوں میں ایک جادو کا منتر پھونک دیا گیا تھا کہ ''وقت نہیں آیا'' اور یہ اسی میں مسحور تھے۔''۷؎

کانگریس ۱۸۸۵ء میں بنی اس وقت تک ہندوؤں کو تعلیم حاصل کرتے ہوئے پورے ۷۰ سال کا طویل عرصہ گزر چکا تھا اور کئی بڑی بڑی یونیورسٹیاں انھوں نے قائم کرلی تھیں۔ ہندوؤں کے اسی پڑھے لکھے طبقہ نے کانگریس بنائی۔ اس وقت سرسید کا مدرسہ قائم ہوئے صرف دس سال ہوئے تھے۔ مسلمانوں میں ابھی ایک بچہ بھی تعلیم پا کر نہ نکلا تھا کہ ہندوؤں نے سیاسی کارروائیاں شروع کردیں۔ مولانا کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کے ساتھ مل کر سیاست میں آنا چاہیے تھا اور تعلیم! تعلیم تو ان کے نزدیک ایک ٹھنڈی لاش تھی۔ سرسید نے کہا تھا کہ مسلمان صرف تعلیم حاصل کریں، اپنی جماعت بنائیں اور کانگریس میں شریک نہ ہوں مولانا اس پالیسی کے سخت خلاف تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمان تعلیم حاصل نہ کریں

اپنی جماعت نہ بنائیں اور کانگریس میں شامل ہوں۔

’’اس کے بعد آنے والا مورخ لکھے گا کہ بالآخر وہ سب کچھ ہوا جو ہونا تھا پس ملک آزاد ہوا اور انگلستان نے اپنا فرض پورا کر دیا۔ لیکن دنیا یاد رکھے کہ جو کچھ ہوا اس قوم کی سرفروشی سے ہوا جو مسلم نہ تھی پر جو مسلم تھے انھوں نے ہمیشہ آزادی کی جگہ غلامی کی، سربلندی کی جگہ سجدہ مذلت کی کوشش کی ہندوستان کی ملکی نجات کی داستان یقیناً ایک عظمت اور عزت کی یادگار ہے......لیکن اس عزت میں مسلمانوں کا کوئی حصہ نہیں......اگر ملک کے قوانین میں ترمیم ہوئی......آخر یہ کہ ملک کو حکومت خوداختیاری ملی تو صرف ہندوؤں قابل عزت ہندوؤں، مسلمانوں کے لیے تازیانہ عبرت ہندوؤں کی وجہ سے۔‘‘ ۸

خیالات کی یہ بلندی، قلم کی یہ روانی اور عقل و دانش کی یہ انتہا صرف مولانا کے یہاں پائی جاتی ہے۔ واقعات کو یوں صرف مولانا ہی مسخ کر سکتے ہیں۔ زمانے نے یہ بھی دیکھا کہ جن لوگوں کی طرف مولانا اشارہ کر رہے ہیں۔ انھیں حضرات نے ملک میں مسلمانوں کے تحفظات کی خاطر جانیں قربان کیں۔ سجدہ ضرور کیا لیکن مولانا اور ان کے ہمنواؤں نے پہلے دن جو کانگریس کی چوکھٹ پر پیشانی ٹیکی تو تمام زندگی نہ اٹھائی۔ ہزاروں فسادات ہوئے، اردو ختم کی گئی، حیدرآباد میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے، کھلے عام خون کی ہولی کھیلی گئی مگر مولانا نے سجدے سے سر نہ اٹھایا اور افسوس کہ علماء کے ایک طبقہ کو بھی اپنے پیچھے مقتدی بنا کر کھڑا کر لیا۔ قابل عزت ہندو قابل اقتدار بن گئے۔ مولانا آزاد ہمیشہ کانگریس کے پیچھے چلنے والے رہے کبھی قائد کا درجہ ان کو نہ مل سکا۔ ہاں ایک زمانہ میں جب ضرورت تھی ان کو صدر بھی بنائے رکھا گیا اور بعد میں وزیر تعلیم بنایا گیا۔ مرکز کا وزیر تعلیم چار خودمختار یونیورسٹیوں کا وزیر تعلیم اور مولانا خوش رہے۔ سجدہ طویل تھا بہت طویل ۱۹۱۰ء سے لے کر زندگی کے آخری لمحے تک۔

’’ہندوؤں کی وجہ سے کیونکہ انھوں نے پالیٹکس کو شروع کیا مگر مسلمانوں نے اس کو معصیت سمجھ کر کنارہ کشی کی اور جب شروع بھی



کیا تو شیطان نے یہی سمجھایا کہ گورنمنٹ کے آگے سجدہ کریں یا اس کے آگے بھیک مانگنے کے لیے روئیں اور پھر مانگیں بھی تو اشرفی نہیں چاندی سونا نہیں لعل و جواہر نہیں بلکہ تانبے اور زنگ آلود ٹکڑا یا سوکھی روٹی کے چند ریزے۔‘‘ ۹

یہاں مولانا یہ اعتراف کر رہے ہیں کہ کانگریس کی سیاست ہندوؤں نے شروع کی۔ اگر مسلمان اس سے الگ رہے تو کیا برا کیا۔ آزدی کے چالیس سالوں میں مسلمان کانگریس اور دوسری قوم پرور جماعتوں میں شریک ہوئے انھیں کیا ملا؟ پی اے سی کی ہندووق کی گولی اور بے روزگاری۔

’’بیشک مدتوں بعد بند ٹوٹے۔ جس کو کفر کہا تھا اس کو ثواب و طاعت کہنا پڑا...... بے شک شملہ ڈیپوٹیشن کے تماشے کے بعد اس کا آخری پارٹ کھیلا گیا اور اس کا نام لیگ رکھا گیا لیکن اگر تم ایک برف خانہ بنا کر اس کا نام آتشکدہ رکھ دو گے تو کیا برف کے سل آگ کا انگارہ ہو جائے گی...... نادانو! چپ کیوں ہو؟ مجھ کو جواب دو شاید ہی آج تک کسی قوم نے سیاست کی ایسی صریح تذلیل و توہین کی ہوگی جیسی کہ چھ سال تک تم نے کی! اے چاندی اور سونے کے پوجنے والو تم نے کی۔ تمہارا وجود یکسر سیاست کی تحقیر اور تمہارے اعمال اس کی پیشانی پر ایک کلنک کا ٹیکا ہیں۔ تم نے غلامی کا ایک بتکدہ بنایا اور اس کا نام سیاست کی مسجد رکھا۔‘‘ ۱۰

ہندوؤں کے مطالبہ پر ۱۹۰۱ء میں اردو ہٹا کر ہندی رائج کیا جانا اس کے بعد تقسیم بنگال کی تنسیخ کرانا، جس کا مقصد مسلمانوں کو نقصان پہنچانا تھا کہ تقسیم بنگال حکومت نے مسلمانوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے کی تھی۔ وغیرہ وغیرہ وہ عوامل تھے جس کی بناء پر تعلیم یافتہ مسلمانوں نے مسلمانوں کی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا۔ علی گڑھ سے کئی نسلیں تعلیم یافتہ ہو کر نکل چکی تھیں۔ محسن الملک، وقارالملک، سرآغا خاں جیسے آمودہ قائدین موجود تھے لہٰذا فیصلہ ہوا کہ مسلمانوں کو من حیث القوم سیاست میں آنا چاہیے ورنہ یکے بعد دیگرے انگریز

ہندوؤں کے تمام مطالبات مسلمانوں کے خلاف مانتے چلے جائیں گے۔لہٰذا وقار الملک کی صدارت میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسۂ ڈھاکہ میں مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا آزاد ان عظیم الشان رہبران قوم کو چاندی اور سونے کا پجاری کہہ رہے ہیں جنھوں نے تمام زندگی مسلمانوں کی خدمت میں وقف کردی اور ایک ایک پیسہ بھیک مانگ کر مسلمانوں کے لیے یونیورسٹی قائم کی۔ان کو نادان اور نہ جان کیا کیا مولانا سمجھتے تھے۔

''ہندو مسلمان کا سوال بھی ایک بازیگر کا کھیل ہے اور بدبختی سے ناچنے والے ناچ رہے ہیں اور یہ خیال کہ تم نے ابھی تعلیم میں ترقی نہیں کی اس لیے تمہاری سیاست یہی ہے کہ پہلے ہندوؤں سے اپنے غصب کردہ حقوق چھین لو۔غور کرو کہ حریف شاطر کی کس قیامت کی چال تھی......پس تم تھے کہ خدا تم کو آگے کرنا چاہتا تھا لیکن افسوس کہ تم نے پہلے خدا کو پھر اپنے آپ کو بھلا دیا۔''

ترجمہ: اور ان لوگوں کی طرح مت بنو جنھوں نے خدا کو بھلا دیا نتیجہ یہ نکلا کہ خود اپنے ہی کو بھول گئے۔ وہ یقیناً فاسقوں میں سے تھے۔''

(القرآن حکیم، ۵۹:۱۹)[۱۱]

بغیر تعلیم کے کوئی بھی ترقی ممکن نہیں ہے یہ بچہ بھی جانتا ہے۔مولانا بھی بخوبی جانتے ہوں گے لیکن کیونکہ انہیں مسلمانوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی لہٰذا مولانا کا سیاست میں پہلا قدم ہی مسلم مفاد کے خلاف تھا کہ تقسیم بنگال کی مخالفت میں ہندوؤں کا ساتھ دینا مولانا کا پہلا سیاسی عمل تھا۔مولانا کی ہر تحریر میں قرآن کی آیات کی بھرمار ہے۔ایسا بے دریغ استعمال صرف وہی انسان کرسکتا ہے جسے خدا کا کچھ بھی خوف ہو۔

ایسا نہ تھا کہ مولانا کے یہ خیالات بہت شروع کے ہیں بلکہ یہ نظریات ان کے تمام عمر رہے۔لہٰذا ۱۹۴۸ء کی دہلی جامع مسجد کی مشہور تقریر میں اسی مضمون کا حوالہ دیا۔

''ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا......''جو سونے والا ہے اسے کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔''[۱۲]



الہلا و البلاغ میں متعدد مضامین اس طرح کے ملتے ہیں جنہیں دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا محض دیوانہ ہے۔اتنے واہیات اور گھٹیا معیار کے مضامین اردو کے بدترین رسائل میں بھی نہیں پائے جاتے۔لیکن مدح نگاران آزاد کی نظر میں الہلال و البلاغ ''قرآنی آیات کی بازگشت ہیں'' اور وہ ''اپنی تحریروں میں قرآنی آیات کے ذریعہ مزید جلال و عظمت پیدا کر لیتے ہیں'' ہم بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قرآنی آیات ان کی ہر تحریر کا خاص حصہ ہوتی ہیں لیکن یہ ذرا غور کرنے کا مقام ہے کہ وہ آیات کس لیے استعمال کی جارہی ہیں۔جن احادیث یا آیات کو مولانا نے اپنے پراگندہ خیالات کو ثابت کرنے کے لیے استعمال کیا ہے وہ یقینی طور سے رسول اور خدا کی بے پایاں ناراضگی کا سبب ہوسکتی ہیں۔ ملاحظہ کریں مندرجہ ذیل دو مضامین جو مولانا نے شائع کیے۔

## تمہارا احساس فنا ہو گیا

مولانا آزاد مسلمانوں سے ہمیشہ بیزار رہے وہ یہ چاہتے تھے کہ پوری مسلم قوم ان کی بتائی ہوئی راہ پر چلے جب ان کی توقعات پوری نہیں ہوتی تھیں تو مسلمانوں کو گمراہ، جاہل، اندھے اور نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے تھے۔زبانی کہی گئی بات کی اہمیت زیادہ نہیں ہوتی لیکن مولانا آزاد نے البلاغ و الہلال میں متعدد مضامین اس طرح کے لکھے ہیں جن میں پوری مسلم قوم کو مختلف خطابات سے نوازا گیا ہے۔ملاحظہ کریں البلاغ کی مندرجہ ذیل تحریر۔فرمایا:

''دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کی نیند اگر موت کی نیند نہ ہو تو کبھی نہ کبھی ختم ضرور ہوتی ہے اور ایسا نہیں ہوسکتا کہ سونے والا کبھی نہ جاگے۔''[۱۳]

یعنی مسلمانوں کی نیند موت کی طرح کی ہے۔اس مضمون میں اپنی کاوشوں کا ذکر بڑے زور و شور سے کیا ہے۔جو انھوں نے مسلمانوں کو جگانے کے لیے الہلال و البلاغ کے ذریعہ کیں۔حریت و آزادی کے لیے مسلمانوں کو تیار کرنا چاہا۔ہر طرح کی تنبیہ و کوششوں کا نتیجہ کیا نکلا؟

''پس تنبیہ و ہوشیاری کی تمام تدبیریں ہوچکیں پر افسوس کہ تمہاری آنکھیں اب تک بند ہیں تمہاری غفلت کا نشہ کسی طرح نہیں اترتا۔ تمہاری موت کی نیند کسی طرح نہیں ٹوٹتی......آہ تم غافل ہو گئے تم

گمراہی کے قبضہ میں آ گئے تمہارے احساس فنا ہو گئے۔تمہارے دل
کی دانائی میٹ دی گئی۔اگر ایسا نہ ہوتا تو جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ
ہو رہا ہے وہ ایسا تھا کہ اندھے بینا ہو جاتے، لنگڑے چلنے لگتے، گونگوں کی
چیخ سے دنیا ہل جاتی......آہ تمہاری غفلت سے بڑھ کر دنیا میں کوئی
اچنبھے کی بات نہ ہوئی۔آہ تم ایسے نہ تھے پھر تم ان لوگوں کی طرح
کیوں ہو گئے جن کے لیے خدا کا رسول ماتم کرتا تھا۔''۱۴؎

خدا کا رسول کن لوگوں کے ماتم کرتا تھا؟ اس کا ذکر مولانا نے نہیں کیا۔بغیر کسی عقلی دلیل و توضیح کے مولانا مسلمانوں کو غافل بتا رہے ہیں۔ وہ اپنی تمام تر ذہنی گمراہی کی دلیلیں سیرت رسول وصحابہ سے پیش کرتے تھے اور ایک لمحہ کے لیے بھی یہ خیال ان کو نہ آتا تھا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں کیا لکھ رہا ہوں۔ایک جنون تھا کہ مسلمان کسی طرح میرے پیچھے پیچھے چلنے لگیں اور چاہے وہ راستہ مکمل بربادی کا ہو مسلمان کچھ نہ سوچیں۔اس مقصد کے حصول کے لیے وہ نہ جانے کیا کیا کہہ جاتے تھے اور جب فرسٹریشن زیادہ بڑھتا تھا تو بقول غالب یہ کیفیت ہو جاتی:

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

''آہ کوئی نہیں سب گمراہ ہو گئے۔سب نکمے نکلے سب غافل ہو گئے
سب پر موت کی نیند چھا گئی، سب نے ایک ہی طرح کی ہلاکت پی
لی، سب نے خدا کو چھوڑ، سب نے اس کے عشق سے منہ موڑ لیا،
سب نے اس کے رشتے کو بٹہ لگایا، سب نے غیروں کی چوکھٹ کی
گرد چاٹی سب نے ایک ساتھ مل کر گندگیوں اور ناپاکیوں سے پیار
کیا۔آہ سب نے عہد باندھا ہے کہ ہم اک ہی وقت میں اللہ کی پکار
سے بھاگیں گے، آہ سب اس سے بھاگ گئے۔سب نے غول در
غول بن کر بے وفائی کی۔کوئی نہیں جو اس کے لیے روئے کوئی نہیں
جو اس کے عشق میں نالہ کرے۔اس کی محبت کی بستیاں اجڑ گئیں......



سب شیطان کے پیچھے دوڑے، سب نے ابلیس کے ساتھ عاشقی کی
اور سب نے بدکار عورتوں کی طرح اپنی آشنائی کے لیے اسے پکارا پھر
اس پر قیامت یہ کہ کسی کو ندامت نہیں۔آہ میں کیا کروں کہاں جاؤں
اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر اتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کہ
تمہاری روحیں پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے یہ کیا ہو گیا
ہے کہ تم پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو۔''۱۵؎

یہ تحریر ایک ۲۸ سال کا لڑکا (بقول خود) لکھ رہا ہے۔ یہ ہندوستان کی مشہور و معروف شخصیت امام الہند آزاد کی تحریر ہے۔یہ الہلال و البلاغ جیسے عظیم الشان رسائل کی تحریر ہے۔ یہ ہندوستان کے سب سے بڑے مسلم رہنما کی تحریر ہے۔جس کی تعریفوں میں اس زمانے کے بڑے بڑے عالمی شہرت یافتہ علماء رطب اللسان رہتے ہیں۔ یہ گمراہی کی آخری منزل ہے کہ سامنے کی بات ہوتے بھی دانشوران قوم مسلم کو ان الفاظ کے معنی سمجھ میں نہیں آتے بلکہ اس کو آسمانی صحیفہ مانتے ہیں۔ایک بڑے دانشور کا یہ مشہور قول ہے کہ قرآن اگر اردو میں اترتا تو مولانا آزاد کی نثر میں اترتا۔تحریر ابھی آپ نے ملاحظہ کی اس کی مطابقت کس آسمانی صحیفہ سے بتائی جا رہی ہے۔ یہ مسلمانوں کی مجموعی بدنصیبی ہے کہ ایک شخص جو اپنی مخالفت کو اس طرح بیان کرتا تھا کہ گویا خدا کی مخالفت کی جا رہی ہے اسی کی تعریف و توصیف میں علماء تک لگے ہوئے ہیں بڑے بڑے مقتدر علماء آئے دن مدح آزاد میں مضامین لکھتے رہتے ہیں۔

## ماہ ربیع الاول اور مسلمان

مولانا نے ایک مضمون ماہ ربیع الاول کے عنوان سے جنوری ۱۹۱۶ء کے البلاغ میں تحریر فرمایا۔ یہ مضمون مولانا کی ذہنیت کا ایک خاص نمونہ ہے جس سے ہمارے اس دعوے کو کہ مولانا رسول، قرآن اور صحابہ کی زندگیوں کو اپنے مقصد کے حصول کے لیے بے دریغ استعمال کرتے تھے، ثابت کرنے میں مدد ملتی ہے۔ ربیع الاول کا مہینہ مسلمانوں کے لیے خاص خوشی کا مہینہ ہے کہ بارہ ربیع الاول کو رسول اللہ دنیا میں تشریف لائے۔تمام دنیا کے مسلمان اس مہینہ میں خوشیاں مناتے ہیں کہ یہ مہینہ توحید کی شرک پر فتح مندی کی علامت ہے۔مولانا نے بعثت رسول کو بھی جنگ آزادی کے حصول کے لیے قربانیاں دینے کے لیے

ایک پیغام بتایا ہے کہ ہندوستان کے ہندوؤں کے ساتھ ملکر مسلمان جنگ آزادی میں حصہ لیں یہی ماہ ربیع الاول کا پیغام ہے اور یہ اسوہ رسول اللہ سے ثابت ہے۔اور مولانا کی نظر میں چونکہ مسلمان اس پیام پر عمل نہیں کرر ہے لہٰذا ان کو خوشیاں منانے کا کوئی حق نہیں ہے۔رسول اللہ کی بعثت کو بھی مولانا نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے کس طرح استعمال کیا ہے مندرجہ ذیل اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے۔

مضمون کی شروعات میں مولانا بعثت رسول اللہ کے واقعہ کو درج کیا ہے اور آخر میں گھما کر اس کو ہندوستان کی جنگ آزادی سے جوڑ دیا ہے۔

> ''پس ربیع الاول انسانی حریت کی پیدائش کا مہینہ ہے،غلامی کی موت اور ہلاکت کی یادگار ہے۔خلقت الٰہی کی بخشش کا یوم اولین ہے۔اسی ماہ میں کلمہ حق زندہ ہوا''۔١٦

مسلمان انگریزوں کی غلامی میں خوش ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ ملکر آزادی کے لیے جدوجہد نہیں کرر ہے ہیں لہٰذا انہیں اس مہینہ کی خوشیاں منانے کا حق نہیں ہے۔

> ''لیکن آہ تم اس ماہ حریت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو اور اس کے لیے تیاریاں کرتے ہو گویا وہ تمہارے ہی لیے اور تمہاری خوشیوں کے لیے ہی آیا ہے خدارا مجھے بتاؤ کہ تمہیں اس پاک اور مقدس یادگار کی خوشی منانے کا کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ زندگی اور روح کو اپنا ساتھی بنائے؟ کیا ایک مردہ لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیں گی۔اور گرہ زندوں کی طرح زندگی کو یاد کریں؟ ہاں یہ سچ ہے کہ آفتاب کی روشنی کے اندر دنیا کے لیے بڑی ہی خوشی ہے لیکن ایک اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے پر آنکھوں والوں کی طرح خوشیاں منائے۔''١٧

مسلمانوں کو یعنی بقول مولانا لاشوں اور اندھوں کو کوئی حق نہیں ہے کہ وہ زندگی اور روشنی کا ذکر کریں۔اس مہینہ کی خوشیاں مسلمان نہیں منا سکتے کہ وہ آزادی کی جنگ میں حصہ نہیں لے رہے ایسا نہ تھا بلکہ مولانا کو یوں کہنا تھا کہ تم اندھوں کی طرح میرے پیچھے پیچھے کیو



نہیں چلتے۔تب بات میں کچھ وزن پیدا ہوتا۔

> ''پھر تم بتلاؤ کہ تم کون ہو؟ تم غلاموں کا ایک گلہ ہو جس نے اپنے نفس کی غلامی اپنی خواہشوں کی غلامی ماسوی اللہ رشتوں کی غلامی اور غیر الٰہی طاقتوں کی غلامی کی زنجیروں سے اپنی گردن کو چھپا رکھا ہے۔تم پتھروں کا ایک ڈھیر ہو جو نہ خود ہل سکتا ہے اور نہ اس میں جان اور روح ہے۔البتہ چور چور ہو سکتا ہے۔تم غبار راہ کی ایک مٹھی ہو جس کو ہوا اڑا لے جا تو جا سکتی ہے ورنہ وہ خود صرف اس لیے ہے تا کہ ٹھوکروں سے روندی جائے اور جولان قدم سے پامال کی جائے۔''١٨

یہ گوشہ تحقیق طلب ہے کہ مسلمانوں سے مولانا کو آخر اس قدر دشمنی کیوں تھی کہ ان کو ٹھوکروں سے روندے جانے کی امید کرتے تھے لیکن کیا اگر مسلمان روندے جاتے تو خود آزاد بچ جاتے؟ اس کا انتظام بھی مولانا نے کر لیا تھا۔اتنی خدمت ہندو قومیت کی انھوں نے کی تھی کہ جس وقت حیدرآباد میں لاکھوں مسلمان پولیس ایکشن میں شہید کیے گئے مولانا وزارت تعلیم لے کر عیش کرتے رہے۔

> ''پھر اے غفلت کی ہستیو اور اے بے خبر کی سرگشتہ خواب روحو! تم کس منہ سے اس کی پیدائش کی خوشیاں مناتے ہو جو حریت انسانی کی بخشش کامرانی وفیروزمندی کی جزوی وملوکی کے لیے آیا تھا؟ اللہ اللہ غفلت کی نیرنگی اور انقلاب کی بوقلمونی ماسویٰ اللہ کی عبودیت کی زنجیریں پاؤں میں ہیں انسانوں کی مملوکیت و مرعوبیت کے حلقے گردنوں میں...... ان سامانوں اور تیاریوں کے ساتھ تم مستعد ہوئے ہو کہ ربیع الاول کے آنے والے کی یاد کا جشن مناؤ جس کا آنا خدا کی عبودیت کی فتح،حریت صادقہ کا اعلان حق،عدالت حقہ کی ملکوتیت...... پس اے غفلت شعاران ملت! تمہاری غفلت پر صد فغاں وحسرت اور تمہاری سرشاریوں پر صد ہزار نالۂ بکا اگر تم اس ماہ کی اصلی عظمت وحقیقت سے بے خبر رہو۔''١٩

مسلمانوں کے بارے میں تو مولانا یہ خیالات تھے اور ہندوؤں کو مولانا آزاد مجاہد قوم سمجھتے تھے تاریخ کا یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ علماء کا یہ خیال ہو گیا کہ ملک و وطن کو بت بنا کر اس کی پرستش کرنے والے ہندوؤں کی طرح مسلمانوں کو بھی اسی طرح عمل کرنے کا درس دے رہے تھے اور مسلمان جب عمومی طور سے اس نظریہ سے الگ رہے تو ان کو برا بھلا کہنے لگے۔ مولانا آزاد ہندوؤں سے مرعوب تھے اور مسلمانوں کو بھی اسی راہ پر دیکھنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں کے بارے میں فرمایا:

> ''آج تک انھوں نے ملک کی تمام خدمتیں صرف ہندوؤں کے لیے ہی چھوڑ دی تھیں اور خود اپنے لیے ہندوؤں کو باغی کہنے کا شریفانہ مشغلہ منتخب کر لیا تھا ملک کی فلاح و بہبود کی فکر ہو تو صرف ہندوؤں ہی کو جابرانہ قوانین کے خلاف احتجاج کریں تو صرف ہندو جنوبی افریقہ کے ہندوستانیوں کے لیے روئیں تو صرف ہندو اگر ایسا ہی ہے تو خدارا اپنے دلوں میں سوچو کہ بد بخت مسلمان آخر کس مرض کی دوا ہیں۔''[۲۰]



## حواشی:

(۱) الہلال، ۱۸ر دسمبر ۱۹۱۲ء، ص:۵
(۲) ایضاً
(۳) ایضاً
(۴) ایضاً
(۵) ایضاً
(۶) ایضاً
(۷) ایضاً
(۸) ایضاً
(۹) ایضاً
(۱۰) ایضاً
(۱۱) القرآن الحکیم (۱۹:۵۹)
(۱۲) عرش ملسیانی، ابوالکلام آزاد، ص:۱۷۰
(۱۳) البلاغ، مارچ ۱۹۱۶ء، ص:۳
(۱۴) ایضاً
(۱۵) ایضاً
(۱۶) البلال، ۱۶ر جنوری ۱۹۱۶ء، ص:۸
(۱۷) ایضاً
(۱۸) ایضاً
(۱۹) ایضاً
(۲۰) الہلال، اکتوبر ۱۹۱۳ء، ص:۳۴۰

# کانگریس: ایک صادق العمل جماعت

مولانا کی کانگریس میں شمولیت ان کی سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ایسا نہ تھا کہ کانگریسی لیڈران نے مولانا آزاد سے کانگریس کا ساتھ دینے کی درخواست کی ہو بلکہ مولانا خود کانگریس کے در پر مع اپنے علم قرآن وحدیث تشریف لے گئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ اس پر بھی ایک زمانے تک کانگریس میں ان پر اعتماد نہ کیا گیا۔اس وقت تک چونکہ مسلمانوں میں قیادت کا فقدان نہ تھا اور تمام کے تمام مسلمان سرسید کے بتائے ہوئے راستے پر چل رہے تھے۔ایک زمانے کے آزمائے ہوئے قائدین قوم میں موجود تھے،جن کا مرتبہ بہت بلند تھا۔مولانا اس وقت بائیس سال کے لڑکے (بقول خود) تھے۔لیکن خود اعتمادی سے بھرپور اور ترقی کرنے کے شدید خواہشمند۔کوئی ایسا طریقہ نہ تھا کہ وہ جلد نکل کر آگے آسکیں۔لہٰذا طریقہ یہ نکالا کہ مسلمانوں کو ایک نیا سبق پڑھائیں جس سے کانگریس کی پوری طاقت ان کے ساتھ ہوجائے اور جتنے بھی مسلمان ان کے ساتھ آسکیں وہ زیادہ ہی زیادہ ہیں۔اسی اسکیم کے تحت عالموں کے ایک طبقہ کو مولانا اپنی راہ پر لگانے میں کامیاب ہوگئے۔علماء کا سرسید سے پرانا بیر تھا۔سرسید کی زندگی میں تو وہ کامیاب نہ ہوسکے بلکہ الٹا سرسید سے اتفاق کرنا پڑا لیکن اب چونکہ کانگریس کی پوری طاقت ان کے ساتھ شامل ہوگئی تھی لہٰذا اگر مسلمان ساتھ نہ بھی دیتے تو بھی کوئی گھاٹا نہ تھا۔کامیابی بہرصورت تھی چاہے مسلمان ساتھ دیں یا نہ دیں اب کانگریس کو اپنا بہت پرانا دعویٰ ثابت کرنے کا وقت آگیا تھا کہ کانگریس ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کی جماعت ہے۔

> ''یادش بخیر مسلمانوں کا ایک سیاسی دور چند سال پیشتر تک تھا جو کہ گزر چکا ہے کہتے ہیں کہ اس گزشتہ عہد میں ایک خوں خوار عفریت کسی آبادی کے عین وسط میں رہتا تھا جس کا نام مسلمانوں کی مسلمہ



> قومی پالیسی تھا۔اس کی طاقت عجیب اور اس کے خون خوارانہ حملے بے امان تھے۔خواہ انسان کہیں ہو اور کسی فکر میں ہو اس کے ہاتھ سے محفوظ نہ تھا۔تمام ملک اس کے دست تظلم سے عاجز آگیا تھا اور اس شیطان لعین کے حملوں سے پناہ مانگتا تھا۔''[1]

یعنی سرسید کی مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی کے نظریہ کو مولانا شیطان لعین اور درندہ سمجھتے تھے مسلمان تعلیم حاصل کریں اور سیاسی شور وغوغا میں شریک نہ ہوں۔یہ نظریہ مولانا کو سخت ناپسند تھا۔یعنی مسلمان تعلیم حاصل نہ کریں اور سیاسی شور وغوغا میں اپنی صلاحیتیں غیروں کے لیے ضائع کریں۔یہ تھا مولانا کا نظریہ:

> ''چنانچہ بالآخر خدا نے دعاؤں کو سنا اور اپنے بعض بندوں کو بھیج دیا جنھوں نے روایات یہود کے بلغم باغور کی طرح اس عفریت سیاہ کو ایک ہی وار میں ٹکڑے ٹکڑے کردیا (قرآن) **فانظر کیف کان عاقبۃ الظالمین**۔''[2]

دوسرے الفاظ میں مولانا یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ میں خدا کی طرف سے اس پالیسی کو ختم کرنے کے لیے مامور کیا گیا ہوں ساتھ ہی ساتھ قرآن کی آیت بھی اپنے دعوے کی دلیل میں پیش کردی۔

> ''پس وہ عہد گزر چکا اب اس کا تذکرہ فضول ہے مسلمانوں کی مسلمہ قومی پالیسی اگر کوئی تھی تو اب اسکا عفریت مرچکا ہے......وہ زمانہ گیا جب انڈین نیشنل کانگریس کی شرکت کے تصور سے مسلمان کانپ اٹھتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں علی گڑھ کی برادری حقہ پانی بند نہ کردے اور قومی اصطلاحات کی فرہنگ میں سب سے بڑی گالی یہ تھی کہ اسے کانگریسی کہہ دیا جائے۔''[3]

مولانا کو کانگریس کی حیثیت کا صحیح اعتراف تھا کہ کانگریس ہونا گالی میں شمار کیا جاتا تھا۔پھر بھی مولانا نے عام مسلمانوں کے مفاد کو قربان کر کے سرسید کی قومی پالیسی کی مخالفت بہت گندے اور گھٹیا الفاظ میں کی کہ یہ عفریت تھا جو کہ مر چکا۔

''اب مسلمان کانگریس میں شریک ہوں یا نہ ہوں مگر ملک کی ایک ہی
سچی اور صادق العمل جماعت نے استقامت اور راست بازی سے
ان کی ضد اور ہٹ پر فتح تو ضرور پالی ہے اور مسلمہ قومی پالیسی کے
سوگوار اب شرم وحیا سے اپنی ذلالت چہل سالہ کا اعلانیہ اقرار نہ کریں
لیکن ان کے دل اور ضمیر..........''۴

کانگریس کی صادق العملی آزاد ہندوستان کے مسلمان زیادہ بہتر طریقہ سے جانتے ہیں یہاں کانگریس سے مراد صرف کانگریس نام کی پارٹی نہیں ہے اور یہ نہ سمجھا جائے کہ اپوزیشن کی حمایت ہمارا مقصود ہے۔ بلکہ کانگریس کے نام سے ایک فلسفہ وابستہ ہے جو جماعت بھی اس فلسفہ کو اپنائے وہ کانگریس ہی ہے چاہے اس کا نام بدل گیا ہو۔

ان گنت فسادات جو حکومت کی سرپرستی میں ہوئے مولانا کے فتوے پر گواہ ہیں کہ حقیقت میں مولانا صحیح سمجھتے تھے کہ ملک میں اگر کوئی سچی اور صادق العمل جماعت ہے اور تھی تو وہ مولانا کی کانگریس ہے۔

''اگرچہ بعض استقامت فرمایان راہ ضلالت اب بھی موجود ہیں جو
کانگریس کی شرکت کو مسلمانوں کے لیے مضر بتلانے سے نہیں
شرماتے......لیکن جو حق تھا وہ ظاہر ہوگیا اور جو باطل تھا اسے اپنی جگہ
خالی کرنی پڑی۔ ان الباطل کان زھوقاً۔''۵

اب تو کانگریس کو حق پر ثابت کرنے کے لیے قرآن کی آیت بھی پیش کر دی گئی پھر بھی مسلمان اس کو مضر اور باطل ماننے پر مصر تھے جب کہ ایک عالم قرآن کی آیت سے دلیل لا رہا تھا۔ اگر مسلمانوں کے پاس دماغ نہ تھا تو مولانا سے لے لیتے مگر افسوس کہ اس بات کو بھی لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔

''افسوس کہ نہ زمانے کے پاس دماغ ہے اور نہ کسی کے پاس دماغ
دیکھنا پسند کرتے ہیں ان نادانوں کو کون سمجھائے کہ لکھنے پڑھنے کے
لیے قلم دوات کے علاوہ اور بھی چند چیزوں کی ضرورت ہوا کرتی ہے
اور عقل و دانائی ایک شے ہے جس کا ثبوت مانگنے کا ہمیں ہر مدعی



انسانیت سے حق حاصل ہے۔''۶

علی گڑھ برادری اور قائدین علی گڑھ تحریک کی مسلمانوں پر لیڈری مولانا کو ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ اس کی جگہ وہ کانگریس کی قیادت مسلمانوں میں قائم کرنا چاہتے تھے۔ مسلمانوں سے مخاطب ہیں:

''صرف اپنی قوم کے ان لوگوں کو دیکھو جن کے پاس جائداد کا کوئی
حصہ یا چاندی سونے کے کچھ سکے جمع ہوگئے ہیں اور اس لیے لیڈری
اور پیشوائی کے بھی مدعی ہیں ان میں سے بہت سے فراعنہ اور نماردہ تم
کو ایسے ملیں گے جن کا نام اگر ان خطابوں سے الگ کر کے زبان سے
نکالا جائے جو ان کے شیطانی خبث وغرور نے گڑھ لیے ہیں یا حکومت
کی خوشامد وغلامی کا اصطباغ لے کر گڑھ لیے ہیں تو ان کے چہرے
مارے غیظ وغضب کے درندوں کی طرح خونخوار ہو جاتے ہیں۔''۷

اس اقتباس کی زبان اگر دیکھی جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ گویا کسی بہت ہی غیر تہذیب یافتہ انسان کے ہاتھ میں کسی طرح سے قلم آ گیا ہے۔ اسلوب کی تعریف میں ہمارے ادیب اور نقاد تعریفوں کے پل باندھتے رہتے ہیں۔ ایک ہنگامہ ہے دنیائے اردو میں الہلال کے اسلوب کا اور اس کے طرز تحریر کا۔ بعض تو اس کو قرآنی لہجے سے تعبیر کرتے ہیں۔ کانگریس کی محبت اور علی گڑھ تحریک سے نفرت یہ تھا مولانا کا مشن حیات کانگریس کی حمایت کے بل بوتے پر چیلنج کرتے ہیں۔

''......مگر میری آواز کا ہر سامع آج انھیں ان کی ناکامی کا پیام
پہنچا دے وہ دنیا جسے بحر احمر میں فرعون اور اس کے ساتھیوں کو غرق
ہوتے دیکھا تھا وقت آ گیا ہے کہ ہندوستان کے اندر بحر حریت
وصداقت میں ان مغرور لیڈروں کے غرق ہونے کا بھی تماشہ دیکھ
لے۔''۸ (ہم نے فرعونیوں کو انسانوں کی پیشوائی اور لیڈری تو دی
تھی مگر وہ ایسے لیڈر تھے جو ہدایت اور رہنمائی کی جگہ قوم کو دوزخ کی
طرف بلاتے تھے۔)۹

یعنی مسلم قائدین تو مسلمانوں کو دوزخ کی طرف بلاتے تھے اور کانگریس مسلمانوں کو جنت کی راہ دکھا رہی تھی۔ یہ گمراہی کی نہ جانے کون سی منزل ہے علماء تحقیق کریں۔

حواشی:

(۱) الہلال دسمبر ۱۹۱۳ء، ص: ۴۲۰

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً

(۶) الہلال، دسمبر ۱۹۱۳ء، ص: ۴۱۵

(۷) الہلال جولائی ۱۹۱۳ء، ص: ۵۶

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً

# خطبۂ رام گڑھ

## مولانا کے سیاسی خیالات کا آئینہ

۱۹۴۰ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ رام گڑھ میں منعقد ہوا۔ جلسہ کی صدارت مولانا آزاد نے فرمائی۔ اس جلسہ کا خطبۂ صدارت مولانا آزاد کے سیاسی تصورات کا آئینہ ہے۔ یہ خطبہ مولانا کی سیاسی تقاریر میں ایک خاص اہمیت کا حامل ہے کہ اس تقریر میں انھوں نے اپنے خیالات کی تشریح کی ہے۔ جو آج کے مسلمانوں کے لیے خاص طور سے قابلِ توجہ ہیں۔ ہندوستانمیں مسلمانوں کا وہ حال ہے کہ بس کسی نہ کسی طرح زندہ ہیں اور سانس لینے و سجدہ کرنے کی اجازت ہے باقی باعزت اور خوشحال زندگی کا کوئی شائبہ تک ان کی حالت سے مطابقت نہیں رکھتا لہٰذا ضرورت ہے کہ مولانا آزاد کی شخصیت اور خیالات کا ازسرِنو تجزیہ کیا جائے۔ جدید ہندوستان میں مسلمانوں کی پہلی عظیم شخصیت سرسید احمد خاں نے بھی اپنے سیاسی خیالات اور تصورات کو مسلمانوں میں عام کیا اور کانگریس کے برخلاف مسلمانوں کے لیے ایک نیا نظریہ وضع کرنے میں اپنی زندگی کے آخری پندرہ سال صرف کیے۔ اس وقت تک سرسید ایک طویل زندگی گزار چکے تھے۔ نئے زمانے کا پورا علم اور تجربہ کی بصیرت ان کی مددگار تھی۔ سرسید کے سیاسی خیالات کو سمجھنے کے لیے ان کی تین تقاریر بہت اہم ہیں۔ ایک لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر ۱۸۸۲ء میں دوسری ۱۸۸۸ء میں لکھنؤ میں اور تیسری ۱۸۸۹ء میں میرٹھ میں۔ لوکل سلف گورنمنٹ بل پر تقریر کرتے ہوئے سرسید نے کانگریس بننے سے تین سال پہلے ہی ملک میں مختلف قوموں کی موجودگی کا اظہار کیا تھا۔ مولانا آزاد کا خطبۂ رام گڑھ، سرسید کی بنیاد میں سرسید و مسلم مخالف عنصر کو شامل کرلیا تھا۔ یہ عنصر ان کی تمام زندگی کے کاموں میں صاف جھلکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے جو کبھی یہ نہیں بھولتا



کہ مجھے بہر حال مسلم مفاد کی مخالفت کرنا ہے۔ سادے جمہوری نظام میں اکثریت اور اقلیت کا کلیدی مقام ہے اکثریت حکمراں اور اقلیت اس کی دست نگر ہوتی ہے۔ مولانا نے سب سے پہلے اسی حقیقت پر حملہ کیا۔

> ''مجھے معلوم نہیں کہ آپ لوگوں میں سے کتنے، ایسے آدمی ہیں جن کی نظر سے میری وہ تحریریں گزر چکی ہیں جو آج سے اٹھائیس برس پہلے میں الہلال کے صفحوں پر لکھتا رہا ہوں...... اگر چند اشخاص ایسے موجود ہیں تو میں ان سے درخواست کروں گا کہ اپنا حافظہ تازہ کرلیں میں نے اس زمانے میں بھی اس عقیدے کا اظہار کیا تھا اور اسی طرح آج بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے سیاسی مسائل میں کوئی بات بھی اس درجہ غلط نہیں سمجھی گئی جس درجہ یہ بات کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی حیثیت ایک سیاسی اقلیت کی حیثیت ہے اس لیے انھیں ایک جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق و مفاد کی طرف سے اندیشہ ناک رہنا چاہیے۔''[1]

کمتر درجہ کی عقل کا انسان بھی اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ ہندوستان میں مسلمان اقلیت ہیں۔ پندرہ اور پچاسی فیصد کا تناسب ہندو مسلم آبادی میں ہے جمہوریت کا خاصہ اکثریت کی حکومت ہوتا ہے۔ ہندستان میں مسلمان ایک عرصہ سے حکمراں چلے آتے تھے۔ کئی صدیوں بعد جمہوری طریقۂ حکومت میں اکثریت کو اپنی بالادستی قائم کرنے کا موقع مل رہا تھا اور وہ بلا کسی قانونی رعایت کے ان طریقوں کے رائج کرنے کی خواہش مند تھی۔ ۱۸۸۲ء سے ہی جمہوری اداروں کی شروعات میونسپل بورڈ اور ڈسٹرکٹ بورڈ بنا کر انگریزی حکومت کر چکی تھی پھر بھی مولانا نے مسلمانوں کو اقلیت ماننے سے انکار کر دیا۔ اس کے برخلاف سرسید نے سادے جمہوری اداروں کی شروعات پر ایک مراسلہ میں لکھا تھا کہ:

> ''یہ کوشش زیادہ تر بندروں کی نقلوں کی سی ہے اور حقیقی پیروی انگلینڈ امریکہ کی نہیں ہے اور ابھی یہ دیکھنا باقی ہے کہ اس کا نتیجہ اس ملک کی قسمت پر کیا ہوگا۔ کل دنیا کے ممالک میں ہندوستان جہاں مختلف

الجنس اقوام ہیں ایسا ملک ہے جو سب سے کم جمہوری طریقہ کے
لے مناسب ہے اور میں اس تجربہ کو جو انڈین نیشنل کانگریس کرنا
چاہتی ہے ایک ایسا تجربہ سمجھتا ہوں جو شک اور مصائب سے بھرا ہوا
ہے کل اقوام ہند کے لیے اور خصوصاً مسلمانوں کے لیے کیونکہ اگرچہ
مسلمان میناریٹی ہیں لیکن سب سے متحد اور بڑی میناریٹی ہیں اور کم از کم
روایتاً اس بات کے عادی ہیں کہ جب میجارٹی ظلم کرے تو تلوار ہاتھ
میں لیں اور جو طریقہ ۱۸۵۷ء کی مصیبتوں سے زیادہ مضر ہوگا۔'' ۲؎

سرسید کے انھیں خیالات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ اگر وقت ہوتا تو میں بتاتا کہ ساٹھ سال پہلے کن ہاتھوں نے ان خیالات کی بنیاد ڈالی۔ ۱۹۴۰ء سے پہلے ساٹھ سال کا عرصہ سرسید کی تحریک کے زمانے پر ختم ہوتا۔ یعنی ۱۸۸۰ء کے آس پاس اور اس وقت سرسید نے کانگریس بننے سے تین سال پہلے ہی لارڈ رپن کی کونسل میں لوکل سیلف گورنمنٹ بل پر بولتے ہوئے سادے جمہوری اداروں کی شروعات پر تنقید کی تھی۔

''اگر وقت ہوتا تو میں آپ کو تفصیل سے بتلاتا کہ معاملہ کی یہ غلط
اور بناوٹی شکل گزشتہ ساٹھ برس کے اندر کیونکر ڈھالی گئی اور کن
ہاتھوں سے ڈھلی؟ ............ دراصل یہ بھی اسی پھوٹ ڈالنے والی
پالیسی کی پیداوار ہیں جس کا نقشہ انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک کے
شروع ہونے کے بعد ہندوستان کے سرکاری دماغوں میں بننا شروع
ہوگیا تھا اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس نئی سیاسی بیداری
کے خلاف استعمال کرنے کے لیے تیار کیا جائے۔'' ۳؎

سرسید نے کانگریس کی مخالفت جو سرکاری انگریز آفیسرز اور وائس رائے کی رضامندی سے بنی تھی محض حقائق کی بنیاد پر کی اور مشکلات کا اظہار کیا جو کانگریس کے مطالبات پورے ہونے پر مسلمانوں پر پڑنے والی تھیں۔ پھوٹ ڈالنے والی پالیسی کانگریس کی تھی کہ کانگریس مسلمانوں کو نقصان پہنچانے والی پالیسی اختیار کررہی تھی۔ سرسید نے صرف اتنا کہا کہ یہ مطالبات جو کانگریس نے پیش کیے ہیں اور کانگریس کے مقاصد ہمارے لیے نقصان دہ ہیں



تو وہ پھوٹ ڈالنے کے گنہگار قرار دیے گئے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ انگریزوں نے کانگریس ہندوستانیوں میں پھوٹ ڈالنے کے لیے بنائی۔ سرسید کی تحریک محض ایسی تھی کہ ایک کمزور آدمی طاقتور اور توانا انسان کے حملے سے بچنے کے لیے پینترے بدلتا ہے۔ مولانا نے آگے خیال ظاہر کیا کہ ہندوستان میں ہند اور مسلمان قوموں کا تصور جو اس زمانے میں پیش کیا گیا اور مسلمانوں کا اقلیت میں ہونا دراصل یہ غلط اور فریب کی باتیں ہیں۔ مسلمانوں کی حیثیت کو نظریۂ متحدہ قومیت میں کوئی خطرہ نہیں ہے۔

''نقشہ میں دو باتیں خاص طور پر ابھاری گئی تھیں۔ ایک یہ کہ
ہندوستان میں دو مختلف قومیں آباد ہیں۔ ایک قوم ہندو ہے اور ایک
مسلمان قوم ہے۔ اس لیے متحدہ قومیت کے نام پر یہاں کوئی مطالبہ
نہیں کیا جاسکتا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے
مقابلے میں بہت کم ہے اس لیے یہاں جمہوری اداروں کے قیام کا
لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہندو اکثریت کی حکومت قائم ہوجائے گی
اور مسلمانوں کی ہستی خطرے میں پڑ جائے گی۔''

کانگریس سے سرسید کی کوئی دشمنی نہ تھی۔ جب کانگریس کے مطالبات ان کے سامنے آئے تو انھوں نے اس پر تفصیلی بحث کی جن کا ذکر پہلے آچکا ہے اور یہ ثابت کیا کہ یہ مطالبات مسلمانوں کے لیے مضر ہیں۔ کانگریس اگر واقعی باہمی دوستی اور متحدہ قومیت کی علمبردار تھی تو اسے سرسید کے اشکال دور کرکے اپنے مطالبات میں ترمیم کرنی چاہیے تھی۔ اس کے برخلاف ایسا نہ کرکے مخالفتوں کو بڑھایا گیا اور سرسید کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ ایسے مقاصد اور مطالبات جن کے پورا ہونے سے مسلمانوں کے بچھڑ جانے کا اندیشہ تھا کوئی ہمدرد ملت کیسے قبول کرسکتا تھا؟ مخالفت کا بیج کانگریس نے پہلے ہی اجلاس میں بودیا تھا اور اعتراض کرنے کے باوجود انھیں اعتماد میں لینا ضروری نہیں سمجھا گیا۔

## مسلمان اقلیت نہیں ہیں

مولانا آزد کا تصور اقلیت بہت عجیب وغریب اور غیر عقلی تھا۔ ان کے خیال میں

اقلیت کا اطلاق مسلمانوں پر نہیں ہوسکتا کہ تعدادی اعتبار سے اگر کوئی گروہ کم ہے تو وہ محض اس بنیاد پر اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا بلکہ صلاحیت کے اعتبار سے بھی اسے تعدادی اعتبار سے بڑے گروہ سے کم حیثیت کا ہونا چاہیے۔ یہ بہت حیرت انگیز خیال ہے اور دنیا کی کوئی ڈکشنری یا کوئی ماہر لسانیات اس غیر حقیقی خیال کی تائید نہیں کرتا۔ اگر مولانا تعداد کے ساتھ صلاحیت کے تصور کو بھی ضروری خیال کرتے تھے تو کیا صلاحیت کے اعتبار سے مسلمان ہندوؤں سے پیچھے نہ تھے اور ہیں؟ مسلمانوں میں تعلیم کا حال، ان کا غیر مذہبی رسموں کو مذہب سمجھنا، انحطاط پذیر معاشی اور معاشرتی نظام، کیا ان کو ہندوؤں سے صلاحیتوں میں کم ثابت نہیں کرتا؟ کیا ہم یہ تصور کریں کہ مولانا ان حقائق سے واقف نہ تھے؟ یا یہ کہا جائے کہ جان بوجھ کر وہ قوم میں غلط خیالات پیدا کرنا چاہتے تھے جس سے ہندو مسلمانوں دونوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔ بلکہ الٹا ان غلط تصورات کے شائع ہونے سے ہندو مسلم کے سوال میں اور الجھاؤ پیدا ہوا۔ اقلیت کے معنی تو وہی رہیں گے جو ہیں مولانا کو اپنے مطلب نکالنے کے لیے کوئی دوسرا لفظ تلاش کرنا چاہیے تھا۔

''سیاسی بول چال میں جب کبھی اقلیت کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے مقصود یہ نہیں ہوتا کہ ریاضی کے عام حسابی قاعدے کے مطابق انسانی افراد کی ہر ایسی تعداد جو ایک دوسری تعداد سے کم ہو لازمی طور پر اقلیت ہوتی ہے اور اسے اپنی حفاظت کی طرف سے مضطرب ہونا چاہیے بلکہ اس سے مقصود ایک ایسی کمزور جماعت ہوتی ہے جو تعداد اور صلاحیتوں دونوں کے اعتبار سے اپنے کو اس قابل نہیں پاتی کہ ایک بڑے اور طاقتور گروہ کے ساتھ رہ کر اپنی حفاظت کے لیے خود اپنے اوپر اعتماد کرسکے...... اس تعدد (number) کے ساتھ نوعیت (Kind) کا سوال بھی کام کرتا ہے۔''[۴۵]

یعنی مولانا آزاد یہ فرض کرتے ہیں کہ مسلمان تعداد کے علاوہ صلاحیتوں کے اعتبار سے بھی ہندوؤں سے کم نہیں ہیں اور اسی وجہ سے انہیں کسی تحفظ کی ضرورت نہیں ہے۔ انہیں گمراہ اور غلط خیالات کی وجہ سے مولانا کو مسلمانوں کے حقوق کا خیال تمام زندگی نہ آیا کیونکہ



وہ مسلمانوں کو اقلیت تک ماننے کے لیے تیار نہیں تھے لہٰذا کسی بھی طرح سے مسلمانوں کے حقوق کا سوال ہی نہیں پیدا ہوسکتا تھا کیا حیرت انگیز مفروضہ ہے اور کیا کیا اس کے نتائج ہمارے سامنے آج موجود ہیں کہ مسلمانوں کے حقوق اور ان کے تحفظ کی مانگ کرنے والا فرقہ پرست کہہ کر بدنام کر دیا جاتا ہے اور جو حقوق غصب کر رہا ہے اور جان و مال کو لوٹ رہا ہے وہ پھر بھی ان الزامات سے بری ہے۔ کیونکہ ہمارے قائدین نے یہ تسلیم کر لیا کہ اقلیت کا سوال ایک بازیگر کا کھیل ہے اور ناچنے والے ناچ رہے ہیں۔ ہندوستانی مسلمان اقلیت نہیں ہیں۔ سرسید نے میرٹھ کے مشہور لیکچر میں کہا تھا کہ:

''پس ہم کو جو طریقہ اختیار کرنا چاہیے وہ یہ کہ ہم اس پولیٹیکل شور و غوغا سے اپنے تئیں علیحدہ رکھیں اور اپنے حال پر غور کریں اور دیکھیں کہ ہم علم میں کم ہیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم میں کم ہیں دولت میں کم ہیں ............ اس وقت ہمارا حال یہ ہے کہ ہندو اگر چاہیں تو ایک گھنٹہ میں ہم کو تباہ کر دیں۔ اندرونی تجارت بالکل ہندوؤں کے ہاتھ میں ہے اور بیرونی تجارت پر انگریزوں نے قبضہ کر لیا ہے۔''

سرسید کی ان حقیقت پسندانہ خیالات کی مخالفت کرتے ہوئے مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کا اتنا بڑا گروہ اقلیت قرار نہیں دیا جاسکتا اور یہ کہنا کہ مسلمان کمزور ہیں اور علم میں کم ہیں، صریح دھوکا دینا ہے۔

''اب ذرا غور کیجیے کہ اس لحاظ سے ہندوستان میں مسلمانوں کی حقیقی حیثیت کیا ہے؟ آپ کو دیر تک غور کرنے کی ضرورت نہ ہوگی۔ آپ صرف اک ہی نگاہ میں معلوم کر لیں گے کہ آپ کے سامنے ایک عظیم گروہ اپنی اتنی بڑی اور پھیلی ہوئی تعداد کے ساتھ سر اٹھائے کھڑا ہے کہ اس کی نسبت اقلیت کی کمزوریوں کا گمان کرنا صریح دھوکا ہے...... سوال تعداد کی نسبت کا نہیں ہے خود تعداد اور اس کی نوعیت کا ہے۔ کیا انسانوں کی اتنی عظیم تعداد کے لیے اس طرح کے اندیشوں کی جائز وجہ ہوسکتی ہے کہ وہ ایک آزاد اور جمہوری ہندوستان میں اپنے حقوق

کی خودنگہداشت نہیں کر سکے گی۔''۵ے

ایسا لگتا ہے کہ مولانا نے حقیقتاً اس مسئلہ پر زیادہ غور نہیں کیا تھا جیسا کہ وہ مشورہ دے رہے ہیں کہ ایک ہی نگاہ میں یہ پتہ چل جائے گا کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں اور آٹھ کروڑ کی تعداد کبھی اقلیت نہیں ہوسکتی چاہے اس کے مقابلے پر تیس کروڑ انسانوں کی آبادی ہو اور نوعیت (kind) میں چاہے تنی ہی ترقی یافتہ ہو۔ مولانا یہ تصور کر کے کہ مسلمان اقلیت نہیں ہیں خود ہی یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ایسے اندیشوں کی کہ مسلمان محکوم ہو جائیں گے اور ان کے حقوق کا کیا ہوگا کوئی جائز وجہ ہوسکتی ہے؟ مولانا ان ایدیشوں تک کو صحیح نہیں مانتے تھے کہ شک بھی مت کرو حالانکہ کسی بھی ہمدردِ ملت کے لیے سب سے اہم اور پہلا سوال یہی ہوسکتا تھا کہ وہ یہ غور کرے کہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کا کیا ہوگا۔ لیکن مولانا کے نزدیک یہ جائز سوال نہ تھا۔ لہٰذا آزاد ہندوستان میں بھی بحیثیت وزیر تعلیم کبھی بھی ان کے ذہن میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا خیال تک نہ آیا اور ملک میں کوئی مسلم ادارہ انھوں نے قائم نہیں کیا۔ کم سے کم وہ یہ کر سکتے تھے کہ تعلیمی ترقی دینے کی کوشش کرتے اگر فسادات نہیں روک سکتے تھے لیکن یہ سوال تو جب ذہن میں آتا جب وہ مسلمانوں کو اقلیت اور ان کے الگ مسائل کا اقرار کرتے۔ اپنے تصورات اور عقائد کے اعتبار سے انھوں نے جو کچھ کیا صحیح کیا۔ اس کے علاوہ وہ اپنے خیالات کی پرواز بے روک ٹوک جاری رہنے دینے کے عادی تھے۔ تصورات کی خوبصورت دنیا بنانے میں ان کا ثانی نہ تھا۔ اور تلخ حقائق کے سامنے آنے کے باوجود اپنی راہ بدلنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ اس کی ایک بہت عمدہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ ان کا یہ گمان تھا کہ ہندوستان ایک فیڈرل ری پبلک ہوگا۔ اور مرکز کے پاس چند محکموں کے علاوہ سارے محکمے آزاد ریاستوں کے پاس ہوں گے اور ہندوستان کی گیاہ ریاستوں میں سے چار ریاستوں میں کیونکہ ان کی اکثریت ہے لہٰذا مسلمانوں کو کوئی پریشانی نہ ہوگی۔ گمان کی بلندی ملاحظہ ہو:

''ہندوستان کا آئندہ دستور اپنی تفصیلات میں خواہ کسی نوعیت کا ہو لیکن وہ ایسا دستور ہوگا جس کے کل حلقے اپنے اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہوں گے اور فیڈرل مرکز کے حصہ میں صرف



وہی معاملات رہیں گے جس کا تعلق ملک کے عام اور مجموعی مسائل سے ہوگا مثلاً بیرونی دفاع کسٹم وغیرہ۔ ایسی حالت میں کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی دماغ...... ان اندیشوں کے قبول کرنے کے لیے تیار ہوجائے جنھیں اکثریت اور اقلیت کے پرفریب سوال نے پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟ میں ایک لمحہ کے لیے بھی یہ باور نہیں کرسکتا کہ ہندوستان کے مستقبل کے نقشہ میں ان اندیشوں کے لیے کوئی جگہ نکل سکتی ہے۔''۶ے

یہ بہت عجیب منطق ہے کہ بے خوف وخطر اور بنا سوچے سمجھے مسلمان حالات کے دریا میں کود پڑیں اور کانگریس نیشنل ازم کو اپنالیں۔ تاریخ کا یہ المیہ ہے کہ اس نظریہ کو اپنانے والی سب سے پہلے علماء کی جماعت تھی جس کے خلاف سرسید نے مسلمانوں کو متنبہ کیا تھا۔ سرسید نے ۱۸۸۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے جلسۂ عام میں کانگریس کے مطالبات کی مخالفت کی تھی۔ ہزاروں مسلمان اس جلسہ میں شریک ہوئے اس تقریر میں انھوں نے کانگریس کے مطالبات پر اور خاص طور سے جمہوری اداروں کی شروعات پر روشنی ڈالی تھی مولانا اس تقریر کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''تقریباً تیس برس ہوئے جب میں نے بحیثیت ایک ہندوستانی مسلمان اس مسئلہ پر پہلی مرتبہ غور کرنے کی کوشش کی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں کی اکثریت سیاسی جدوجہد کے میدان سے یک قلم کنارہ کش تھی اور عام طور پر وہی ذہنیت چھائی ہوئی تھی جو ۱۸۸۸ء میں کانگریس سے علیحدگی اور مخالفت کی صورت اختیار کر لے گئی تھی۔ وقت کی یہ آب وہوا میرے غوروفکر کی راہ نہ روک سکی۔''۷ے

یعنی مولانا ۱۹۴۰ء میں یہ کہہ رہے ہیں کہ آج سے تیس سال پہلے میں نے یہ غور کرنے کی کوشش کی تھی اس وقت موصوف کی عمر محض تئیس سال ہوتی ہے۔ سرسید کے انتقال کو صرف بارہ سال ہوئے تھے اور پورے ہندوستان میں سرسید کے خیالات جاری تھے جو کہ ۱۸۸۸ء میں انھوں نے کانگریس کے خلاف اپنی مشہور تقریر میرٹھ میں ظاہر کیے تھے۔

مسلمان مولانا کی نظر میں سیاست سے یک قلم کنارہ کش تھے۔ دراصل یہ کہنا چاہیے کہ کانگریس کی سیاست سے کنارہ کش تھے ورنہ مسلمانوں کی اپنی جماعتیں مسلم لیگ وغیرہ تھیں جس وقت سرسید نے کانگریس کے خلاف ۱۸۸۷ء میں تحریک شروع کی وہ ایک پوری عمر قومی خدمت میں گزار کر اپنی عمر کے اکہترویں سال میں داخل ہوئے تھے۔ ایک عمر کا تجربہ اور دانشوری اور عدیم المثال ذہانت ان کے اس فیصلہ میں شریک کار تھی کہ کانگریس مسلمانوں کی موجودہ اور آئندہ صورت حال میں ان کے لیے انتہائی درجہ مضر ہے۔ محسن الملک، وقار الملک اور سر آغا خاں وغیرہ جنھوں نے کہ ایک عمر مسلمانوں کی خدمت میں بسر کی سرسید کے سچے جانشین دنیا دیکھے ہوئے برتے ہوئے معزز بزرگ سرسید کے پیغام کو ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچا رہے تھے اس وقت مولانا آزاد نے یہ منصوبہ باندھا کہ کس طرح اس تحریک کو ختم کر کے اپنے لیے قیادت اور ناموری حاصل کی جائے لہٰذا کانگریس کی مدد سے الہلال کا اجرا کیا۔ الہلال کے صفحات گواہ ہیں کہ اسکے صفحات نے کبھی مسلمانوں کے جداگانہ مسائل کی موجودگی کا اقرار نہیں کیا بلکہ ایسے سوالات کو قدامت پرستی اور فرقہ پرستی سے تشبیہ دی یہ وہی الفاظ ہیں جو بنگالی کانگریسیوں نے سرسید اور ان کے رفقاء کے خلاف استعمال کیے۔ مولانا کی زبان پر بھی یہ ہمیشہ جاری رہے۔ الہلال نے صرف یہی نہیں کیا کہ مسلمانوں کے مسائل کی موجودگی سے انکار کیا بلکہ ان کے لیے کی جانے والی کوششوں حتیٰ کہ مسلم یونیورسٹی کے قیام کی کوشش کو بھی قدامت پرستانہ اور اسلام دشمن اقدام بتایا۔ اسی خطبہ میں آگے فرماتے ہیں۔

## اپنی آنکھیں بند کرلو

''میں نے غور کیا کہ ہندوستان اپنے حالات کے ساتھ ہمارے سامنے موجود ہے اور اپنے مستقبل کی طرف بڑھ رہا ہے ہم بھی اسی کشتی میں سوار ہیں اور اس کی رفتار سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اپنے طرز عمل کا ایک صاف اور قطعی فیصلہ کرلیں۔ یہ فیصلہ ہم کیوں کر کر سکتے ہیں صرف اس طرح کہ معاملے کی سطح پر نہ رہیں اس کی بنیادوں تک اتریں اور دیکھیں کہ ہم اپنے



آپ کو کس حالت میں پاتے ہیں میں نے ایسا کیا اور دیکھا کہ سارے معاملے کا فیصلہ صرف ایک سوال کے جواب پر موقوف ہے کہ ہم ہندوستانی مسلمان ہندوستان کے آزاد مستقبل کو شک اور بداعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں یا خوداعتمادی اور ہمت کی نظر سے۔ اگر پہلی صورت ہے تو بلاشبہ ہماری راہ دوسری ہو جاتی ہے...... لیکن اگر ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے لیے شک اور خوف کی کوئی وجہ نہیں ہے ہمیں خوداعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھنا چاہیے تو پھر ہماری راہ بالکل صاف ہو جاتی ہے...... شک تذبذب بے علمی اور انتظار کی درماندگیوں کی یہاں پر چھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ یقین عمل اور سرگرمی کا سورج یہاں کبھی نہیں ڈوب سکتا۔ وقت کا کوئی الجھاؤ حالات کا کوئی اتار چڑھاؤ معاملوں کی کوئی چبھن ہمارے قدموں کا رخ نہیں بدل سکتی۔''

شک اور تذبذب اور یقین یا بے یقینی بذات خود کوئی ایکشن نہیں ہے بلکہ یہ ری ایکشن ہے۔ حالات کا اور واقعات کا اور تجربے کے ذریعہ حاصل کی گئی ذہانت کا۔ ایک آزمائے ہوئے شخص پر بار بار یقین نہیں کیا جا سکتا۔ یقین اور بھروسہ جو کسی شخص پر ہوتا ہے وہ ایک عرصہ دراز تک اس کے اعمال پر منحصر ہوتا ہے۔ ایک انسان جو کسی دوسرے انسان کی کسی طرح کی مدد کرنے کے لیے تیار نہیں ہے اور ہر بار بوقت آزمائش ناکام ہوتا ہے اس پر کوئی کیسے بھروسہ کر سکتا ہے۔ مولانا کا یہ فرمانا کہ ہم خوداعتمادی اور ہمت کی نظر سے مستقبل کو دیکھتے ہیں یا شک اور بداعتمادی کی نظر سے بہت بحث طلب مسئلہ ہے ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہیں گے کہ خوداعتمادی اپنی قابلیت اور حالات کی سازگاری دونوں پر منحصر ہوتی ہے۔ کوئی ہائی اسکول کا سرٹیفکٹ لے کر خوداعتمادی سے یونیورسٹی لیکچررشپ کا انٹرویو دینے کے لیے تیاری نہیں کر سکتا۔ پچیس فیصد مسلمان ۱/۴ سے زیادہ سیٹیں نہیں جتا سکتے۔ سوال خوداعتمادی کا نہیں تھا بلکہ ان قوانین اور ضوابط کا تھا جن سے ملک کی حکومت چلائی جائے گی۔ قانون اگر یہ ہے کہ مقابلہ کا امتحان بنا کسی رزرویشن کے جاری ہوگا تو مسلمان کتنی ہی

خوداعتمادی اور ہمت سے اس میں بیٹھیں پروبلٹی یہ کہتی ہے کہ ان کا چانس تقریباً زیرو ہے۔ اس لیے کہ مقابلہ میں آنے والی قوموں کی قوت کا اندازہ ہر شخص بخوبی کرسکتا ہے۔

ایسا لگتا ہے کہ مولانا ملکی قوانین پر تفصیلی بحث نہیں چاہتے تھے ان کی بس یہ خواہش تھی کہ مسلمان اعتماد کریں اور آنکھیں بند کر کے تاریک مستقبل میں قدم رکھ دیں۔

> ''میں نے ۱۹۱۲ء میں الہلال جاری کیا اور اپنا یہ فیصلہ مسلمانوں کے سامنے رکھا آپ کو یاددلانے کی ضرورت نہیں کہ میری صدائیں بے اثر نہیں رہیں۔۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا زمانہ مسلمانان ہند کی نئی سیاسی کروٹ کا زمانہ تھا...... میں اپنے ہم مذہبوں کو یاددلاؤں گا کہ اس تمام مدت میں...... میری آنکھوں نے دیکھنے اور میرے دماغ نے سوچنے میں کبھی کوتاہی نہیں کی...... میں اس تمام عرصہ میں ان سے کہتا رہا ہوں اور آج بھی ان سے کہتا ہوں کہ ہندوستان کے نوکروڑ مسلمان کے لیے صرف وہی ایک راہ عمل ہوسکتی ہے جس کی میں نے ۱۹۱۲ء میں انھیں دعوت دی تھی۔'' ۸

۱۹۱۲ء سے ۱۹۱۶ء تک کا عرصہ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ میں ایک ایسے دور کی حیثیت سے یاد کیا جائے گا جس میں ۱۸۵۷ء کے بعد پہلی ہندی مسلمانوں کی سیاست کے دھارے کو غلط راہ پر ڈالنے کی کوشش کی گئی۔اس زمانے میں جبکہ مولانا کی عمر محض چوبیس سال کے لگ بھگ ہوتی ہے اور ان کی تعلیمی حیثیت کا علم بھی سبھی کو ہے کہ نہ انھوں نے کوئی ماڈرن یونیورسٹی دیکھی اور نہ خود سرسید کی طرح آثار الصنادید کی طرح کا کوئی علمی کارنامہ انجام دیا۔جس کی وجہ سے عالم سائنس میں سرسید کا نام پہچانا جانے لگا تھا اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کا ممبر نامزد کیا گیا جو بلاشبہ اس زمانے میں کسی انسان کی علمی حیثیت کا سب سے بڑا اعتراف تھا۔مولانا آزاد نے صرف یہی نہیں کیا بلکہ قرآن وحدیث کا اس قدر بیجا استعمال کیا کہ اپنے ہر ذاتی خیال کے لیے بھی ہمیشہ قرآن کی آیت پیش کی۔ہمارا خیال ہے کہ باقاعدہ کوئی دینی ادارہ دیوبند یا ندوہ اس کی تحقیق کرے تو وہ بہت مناسب ہوگا کہ آیا جن قرآنی آیات کا ذکر مولانا نے جابجا کیا ہے وہ اس سلسلہ میں قابل استعمال ہیں کہ نہیں؟ ہمارا دعویٰ



ہے کہ ایک حیرت انگیز ریسرچ لوگوں کے سامنے آئے گی کہ علماء اور عام مسلمان سب انگشت بدنداں رہ جائیں گے۔

۱۹۱۲ء کی راہ عمل کیا تھی سوائے اس کے کہ اپنا ہاتھ نابینا انسان کی طرح دوسری قوم کے ہاتھ میں دے دو اور اس پر اعتماد رکھو۔خوداعتمادی اور ہمت سے آنکھیں رکھتے ہوئے انھیں بند کرلو اور اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دو اور کشاں کشاں اس کے پیچھے پیچھے چلو اور امید رکھو کہ وہ تمھیں منزل پر پہنچائے گا۔یہ عمل دونوں کے لیے ایک بوجھ ہے اور فطرت انسانی کے خلاف ہے۔کبھی آنکھ اگر دھوکے سے کھل بھی جائے تو دیکھو مت اور سوال مت کرو کہ یہ راستہ منزل پر نہیں جاتا۔قرآن کی آیتوں کا ہتھیار مولانا اپنے ایک ہاتھ میں رکھ کر دوسرے ہاتھ سے مسلمانوں کے ایک مجمع کو اپنی راہ پر لگانے میں کامیاب ہوگئے۔

> ''میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۹۱۲ء میں میری صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج مجھ سے اختلاف رکھتے ہیں...... میں ان کے اخلاص اور سنجیدگی سے اپیل کروں گا...... میں تسلیم کرتا ہوں کہ بدقسمتی سے وقت کی فضا گرد آلود ہورہی ہے مگر انھیں حقیقت کی روشنی میں آنا چاہیے...... وہ آج بھی ہر پہلو سے غور کرلیں وہ اسکے سوا کوئی راہ عمل نہیں پائیں گے۔'' ۹

یہ مشورہ بہت مناسب ہے کہ ہر پہلو پر غور کرلیں اس کے بعد راستہ متعین کریں گے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے۔دعوت فکر کے ساتھ ساتھ اس کا نتیجہ بھی بتادیا۔

## اسلام سے رشتہ

> میں مسلمان ہوں اور فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ مسلمان ہوں۔ اسلام کی تاریخ،اسلام کے علوم وفنون،اسلام کی تہذیب میری دولت کا سرمایہ ہے......بحیثیت مسلمان میں مذہبی اور کلچرل دائرے میں اپنی ایک خاص ہستی رکھتا ہوں اور میں برداشت نہیں کرسکتا کہ اس میں کوئی مداخلت کرے۔لیکن ان تمام احساسات کے ساتھ میں ایک اور احساس بھی رکھتا ہوں جسے میری زندگی کی حقیقتوں نے پیدا

کیا ہے۔اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی وہ اس راہ میں میری
رہنمائی کرتی ہے میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی
ہوں میں ہندوستان کی ایک اور ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک عنصر
ہوں اس متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی
عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے...... میں اپنے اس دعوے سے کبھی
دستبردار نہیں ہوسکتا۔''[۱۰]

مولانا صاف اعتراف کرتے ہیں کہ مذہب اور کلچر صرف ان دو دائروں میں ایک خاص ہستی رکھتے ہیں اور وہ اس میں کسی کی مداخلت برداشت کرنے کے قائل نہیں ہیں مگر جہاں سیاسی دائرہ شروع ہوجاتا ہے وہ اپنا رشتہ اسلام اور مسلمانوں سے توڑ کر ناقابل تقسیم متحدہ قومیت سے جوڑتے ہیں اور اس میں مسلمانوں یا اسلام کی مداخلت برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ اسلام میرا مذہب ہے اسلامی تاریخ اور علوم وفنون میرا سرمایہ ہے تو ہم اتنا بتادیں کہ اسلام کو نقصان پہنچانے والوں نے ہمیشہ ایسا ہی دعویٰ کیا ہے۔امیر معاویہ کے پاس معدودے چند تمام اسلامی دنیا کے علماء وقت کے فتاویٰ تھے جب انھوں نے یزید کو خلیفہ مقرر کیا تھا۔عثمانیہ ترک کی فوجوں کے خون سے مسجد حرم کو لالہ زار بنانے والے بھی اسلام کے دعویدار تھے اور عقیدے کے اعتبار سے مسلمان تھے صرف یہ کہہ دینا کافی نہیں کہ میرا عقیدہ اسلام ہے اور اس کی وجہ سے راہ حق پر ہونے کا سرٹیفکٹ مل جائے گا۔جن لوگوں کے خلاف مولانا نے محاذ بنایا وہ بھی عقیدے کے اعتبار سے کافر ومشرک یا یہودی نہ تھے بلکہ کلمہ گو تھے اور اسلام ان کا بھی ایسا ہی مذہب تھا جیسا کہ مولانا آزاد کا۔

''گیارہ صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری زندگی کے تمام
گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھردیا ہے۔ہماری زبانیں
ہماری شاعری ہمارا ادب ہماری معاشرت ہمارا لباس ہمارے رسم و
رواج ہماری روزانہ زندگی کی بے شمار حقیقتوں کا کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں
ہے جس پر اس مشترک زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ہماری بولیاں



الگ الگ تھیں ہم ایک زبان بولنے لگے۔ہمارے رسم ورواج ایک
دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انھوں نے مل کر ایک نیا سانچہ پیدا کردیا۔
ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جاسکتا ہے مگر
اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔یہ تمام مشترکہ سرمایہ ہماری
متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے......ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں
جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی زندگی واپس لائیں تو انھیں
معلوم ہونا چاہیے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا
ہونے والا نہیں۔اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو
چاہتے ہیں کہ اپنی اس گزری ہوئی تہذیب ومعاشرت کو پھر زندہ
کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو
میں ان سے بھی کہوں گا کہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار
ہوجائیں تو بہتر ہے کیوں کہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت
کی زمین میں ایسے خیالات اگ نہیں سکتے...... ہماری اس ایک
ہزار سال کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا
ہے۔ایسے سانچے قدرت کے شخصی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود
بنا کرتے ہیں......ہم پسند کریں یا نہ کریں مگر اب ہم ایک ہندوستانی
قوم اور ناقابل تقسیم ہندوستانی قوم بن چکے ہیں۔''[۱۱]

اس متحدہ قومیت کے پرخچے کس نے اڑائے اسی کانگریس نے جو مولانا کو مسلم مفاد سے زیادہ عزیز تھی خود مولانا کی زندگی میں ہزاروں فسادات ہوئے۔مشترکہ زبان اردو کا جنازہ مولانا کی وزارت تعلیم کے دور میں ہی نکالا گیا۔حیدرآباد پولیس ایکشن میں لاکھوں مسلمان شہید ہوئے،نوکریوں کا دروازہ مسلمانوں پر بند کیا گیا۔

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان بننے کی وجہ سے ایسا ہوگیا ورنہ مشترکہ زبان اردو تھی اور رہتی یہ تاریخی حقایق کے خلاف ہے۔اردو کو ہٹانے کی تحریک ۱۸۶۷ء سے ہی شروع ہوگئی تھی جبکہ ملک کو باقاعدہ غلام ہوئے صرف دس سال کا عرصہ گزرا تھا غلام ہندوستان تک

میں اردو کو ہٹانے کی تحریک بہت زور وشور سے چلی اور کئی صوبوں میں کامیاب بھی ہوئی۔ اس کے علاوہ ۱۹۲۹ء کی نہرو رپورٹ تک مسلمانوں کے حقوق کے بارے میں بالکل خاموش ہے اور بہت سے تاریخی حقائق ہیں جو پاکستان بنا تو دور کی بات ہے تصور آزادی سے بھی بہت عرصہ پہلے ہی اس طرف اشارہ کر رہے تھے کہ آئندہ کیا ہونا ہے۔ اگر برائے بحث یہ مان لیا جائے کہ پاکستان بننے کی وجہ سے ایسا ہوا۔ اگر وہ نہ بنتا تو ایسا نہ ہوتا تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ شورش پسند طبقہ الگ ہو گیا اور یہاں سے چلا گیا اب تو اور آرام سے مشترکہ سرمایہ کو بڑھاوا دیا جا سکتا تھا۔ اگر وہی اس راہ کے سنگ گراں تھے تو خدا نے خود بخود اس کو ہمارے راستے سے ہٹا دیا تو بھی ہم کیوں ایسی مشترکہ قومیت کی تعمیر میں ناکام رہے؟ بلکہ سکھ قوم کا قضیہ اور شروع ہو گیا۔

○

**حواشی:**

(۱) عرش ملسیانی، ابوالکلام آزاد، ص: ۱۴۹

(۲) مراسلہ ایڈیٹر پانیر، مکتوبات سرسید، ص: ۴۴۸

(۳) عرش ملسیانی، ابوالکلام آزاد، ص: ۱۴۹

(۴) ایضاً، ص: ۱۵۰

(۵) ایضاً، ص: ۱۵۱

(۶) ایضاً، ص: ۱۵۲

(۷) ایضاً، ص: ۱۵۳

(۸) ایضاً، ص: ۱۵۴

(۹) ایضاً، ص: ۱۵۴

(۱۰) ایضاً، ص: ۱۵۵

(۱۱) ایضاً، ص: ۱۵۶

# جامع مسجد کی تقریر

مولانا آزاد نے اکتوبر ۱۹۴۷ء میں جامع مسجد دہلی میں بروز جمعہ نمازیوں سے خطاب کیا تھا۔ یہ تقریر بہت شہرت یافتہ ہے اور مولانا کی سب سے مشہور تقریر مانی جاتی ہے۔ ہم مندرجہ ذیل سطور میں اس تقریر کا ایک تجزیہ پیش کرنا چاہتے ہیں۔

۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے لاہور رزولوشن (جو قرارداد پاکستان کے نام سے مشہور ہے) میں یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ ملک کے تین حصے کیے جائیں مشرق اور مغرب میں مسلم اکثریتی علاقوں کو الگ الگ انتظامی حصوں میں تقسیم کیا جائے اور بیچ کے ہندو اکثریت کے علاقہ کو تیسرا حصہ تسلیم کیا جائے۔ ان تینوں حصوں میں ہندو مسلم اقلیت کو معاشی، تعلیمی اور ثقافتی و مذہبی ترقیات کے تمام مواقع فراہم کیے جائیں اور دستوری تحفظات کے ذریعہ اقلیتوں کی ترقی کی گارنٹی دی جائے۔ سات طویل سالوں کی تلخ سیاست اور کانگریس اور مسلم لیگ کے ٹکراؤ کے بعد بالآخر ملک کی تقسیم کے اصول کو برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ کے ٹکراؤ کے بعد بالآخر ملک کی تقسیم کے اصول کو برطانیہ، کانگریس اور مسلم لیگ تینوں جماعتوں نے تسلیم کرلیا۔ اس فیصلہ میں اس بات کا کوئی ذکر نہ تھا کہ ہندو اقلیت پاکستان سے بھارت آجائے اور بھارت سے مسلم اقلت پاکستان چلی جائے۔ لیکن اقتصادی مواقع کی تلاش اور پنجاب میں مسلم سکھ مفاد کے ٹکراؤ کے باعث بڑے پیمانے پر ہندو مسلم اور سکھ آبادی کا تبادلہ ظہور پذیر ہوا۔ نتیجتاً فسادات کی بھیانک گرم آندھی نے پورے پنجاب اور شمالی ہندوستان کے اکثر حصوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ ان فسادات کے سبب وقتی طور پر تبادلہ آبادی رک گیا اور لوگ اپنے اپنے گھروں میں چھپ گئے۔ ایسے حالات میں جب ہندو اور مسلمان تعلقات بہت زیادہ خراب تھے اور ملک کی فضا تعصب اور فرقہ پرستی سے گندی ہو رہی تھی، مولانا آزاد نے جامع مسجد میں مسلمانوں سے خطاب کیا۔ بہت سی تقریروں کے ساتھ ساتھ مولانا کی یہ بھی ایک عام تقریر سمجھی جاسکتی تھی لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ جن خیالات کا اظہار مولانا نے اس تقریر



میں کیا وہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے قوم پرور نقطۂ نظر کی بھرپور عکاسی ہے۔ اور اسی وجہ سے اس تقریر کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ دیکھا جائے کہ مولانا آزاد جن کو آزاد ہندوستان کے مسلمانوں کا مسیحا بتایا جاتا ہے، نے تاریخ کے انتہائی اہم موڑ پر کس طرح مسلمانوں کی رہبری کا حق ادا کیا، فرمایا:

> ''آپ جانتے ہیں کہ وہ کون سی زنجیر ہے جو مجھے یہاں لے آئی ہے......آج تمہارے چہروں کا اضطراب اور دلوں کی ویرانی دیکھتا ہوں تو مجھے بے اختیار پچھلے چند سالوں کی بھولی بسری کہانیاں یاد آجاتی ہیں تمہیں یاد ہے میں نے تمہیں پکارا اور تم نے میری زبان کاٹ لی، میں نے قلم اٹھایا اور تم نے میرے ہاتھ قلم کردیے۔ میں نے کروٹ لینا چاہی تو تم نے میری کمر توڑ دی حتیٰ کہ پچھلے چند سال کی تلخ نوا سیاست جو تمہیں آج داغ جدائی دے گئی ہے اسکے عہد شباب میں بھی میں نے تمہیں ہر خطرے کی شاہراہ پر جھنجھوڑا لیکن تم نے میری صدا سے نہ صرف اعراض کیا بلکہ غفلت وانکار کی ساری سنتیں تازہ کردیں۔ نتیجہ معلوم کہ آج انھیں خطروں نے تمھیں گھیر لیا ہے جن کا اندیشہ تمہیں صراف مستقیم سے دور لے گیا تھا۔''[۱]

## تقسیم کی ذمہ داری

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ مولانا نے اپنی کتاب ''ہماری آزادی'' میں کیبنٹ مشن پلان کی ناکامی کا ذمہ دار سراسر جواہر لال نہرو کو قرار دیا ہے۔ اس پلان کے تحت ملک کو متحد رکھنے کی سبیل نکل آئی تھی۔ مسلم لیگ نے مطالبۂ تقسیم کو رد کرکے اس پلان کو منظور کرلیا تھا۔ کانگریس نے بھی اس پلان کو منظور کرلیا تھا۔ تمام دنیا سے مبارکباد کے پیغامات آرہے تھے کہ ہندوستان کے لیڈران نے ایک اہم مسئلہ کو آپسی گفت وشنید سے حل کرلیا ہے۔ لیکن جواہر لال نہرو نے جس طرح چند ہی دنوں کے اندر اس پلان کو ناکام بنادیا اس کو مولانا اور دوسرے مورخین نے بدنصیبی اور دغا سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سارے واقعات پیش آنے کے بعد ہی مولانا نے جامع مسجد میں مسلمانوں سے خطاب کیا۔ قابل توجہ بات یہ ہے کہ ان تمام حالات کو جاننے کے باوجود مولانا نے مسلمانوں کو

ہی صراط مستقیم سے بھٹکا ہوا بتایا۔ انصاف کا تقاضہ تھا کہ جو حق تھا وہی کہا جاتا۔ اس کے برخلاف مولانا نے مسلمانوں کو ہی تقسیم وطن کا ذمہ دار قرار دے کر ان میں احساس جرم پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی۔ اس اقتباس سے ایسا لگتا ہے کہ ایک شخص غرور کے نشہ میں چور حقیر سامعین کو خطاب کر رہا ہے۔ ایسا بھی محسوس ہوتا ہے کہ مولانا بس اب ہاتھ اٹھا کر دعا ہی کرنے والے ہیں کہ اے خدا تو انھیں غارت کر دے کہ انھوں نے میری نہیں سنی۔

''ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں بیتا جب میں نے تم سے کہا تھا کہ دو قوموں کا نظریۂ حیات معنوی کے لیے مرض الموت کا درجہ رکھتا ہے۔ اس کو چھوڑ دو یہ ستون جن پر تم نے بھروسہ کیا ہوا ہے نہایت تیزی سے ٹوٹ رہے ہیں لیکن تم نے سنی ان سنی برابر کر دی...... تم دیکھ رہے ہو کہ جن سہاروں پر تمہارا بھروسہ تھا وہ تمہیں لاوارث سمجھ کر تقدیر کے حوالے کر گئے ہیں۔''

قرارداد پاکستان کے بموجب دہلی کبھی بھی پاکستان میں شامل نہیں ہو سکتی تھی لہٰذا یہ کہنا کہ دہلی یا شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کو پاکستان سے کچھ ملنے والا تھا تو یہ سمجھنے والے کی غلطی ہے لیکن اقلیتوں کے لیے دستوری تحفظات کا مطالبہ خود اس قرارداد میں موجود ہے۔ لہٰذا بے سہارا چھوڑنے کی بات سرے سے ہی غلط ہے اور پھر ۱۸۸۵ء سے ہی مسلمانوں کے حقوق کی علمبردار کانگریس ملک میں تھی اور خود مولانا آزاد موجود تھے جن کے نزدیک اقلیت و اکثریت کا سوال سرے سے ہی بازیگر کا کھیل تھا۔ کیا مسئلہ مسلمانوں کو پیش آ سکتا تھا جبکہ ہندو مسلم سکھ وغیرہ ایک ہی قوم تھے؟ کیا کانگریس نے ایک قوم کے نظریہ کو پاکستان بننے کے بعد ترک کر دیا تھا؟ آخر مولانا اپنی موجودگی میں مسلمانوں کو لاوارث کیسے کہہ سکتے تھے؟

## انگریزوں کی غلامی

''انگریز کی بساط تمہاری خواہش کے برخلاف الٹ دی گئی اور راہنمائی کے وہ بت بھی تمہیں دغا دے گئے۔ حالانکہ تم نے سمجھا تھا کہ یہ بساط ہمیشہ کے لیے بچھائی گئی ہے اور ان ہی بتوں کی پوجا میں تمہاری زندگی ہے۔ میں تمہارے زخموں کو کریدنا نہیں چاہتا اور تمہارے اضطراب میں مزید اضافہ میری خواہش نہیں۔''



یعنی مسلمان انگریزوں کی حکومت چاہتے تھے انگریز ہندوستان سے مسلمانوں کی خواہش کے برخلاف واپس جا رہا تھا۔ یہ بہت خطرناک الزام ہے۔

مولانا نے اس تقریر میں بار بار مسلمانوں کو انگریزوں کا وفادار بتایا ہے۔ گھما پھرا کر کئی مرتبہ یہ بات کہی ہے کہ مسلمان انگریزوں کی حکومت چاہتے تھے۔ یعنی مسلمان کا ملک کی آزادی حاصل کرنے میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ ایسا سنگین الزام آزاد ہندوستان میں مسلمانوں پر لگانا مولانا کا ہی کام تھا۔ مسلمانوں کی آزادی حاصل کرنے کے لیے شاندار قربانیاں ہیں۔ یہ بات کٹر ہندو فرقہ پرست بھی مانتے ہیں۔

الہلال میں شائع ایک مضمون کا حوالہ دیتے ہوئے مولانا نے پھر مسلمانوں کو آزادی کا دشمن قرار دیا۔

''ایک وقت تھا میں نے ہندوستان کی آزادی کے حصول کا احساس دلاتے ہوئے تمہیں پکارا تھا اور کہا تھا: جو ہونے والا ہے اس کو کوئی قوم اپنی نحوست سے نہیں روک سکتی۔ ہندوستان کی تقدیر میں سیاسی انقلاب لکھا جا چکا ہے۔ اگر تم نے تعطل کی موجودہ زندگی کو اپنا شعار بنائے رکھا تو مستقبل کا مورخ لکھے گا کہ تمہارے گروہ نے جو سات کروڑ انسانوں کا ایک غول تھا ملک کی آزادی کے بارے میں وہ رویہ اختیار کیا جو صفحۂ ہستی سے محو ہو جانے والی قوموں کا ہوا کرتا ہے۔''

امام الہند مولانا آزاد آخر بلا وجہ امام الہند نہیں ہو گئے اس کی کچھ بہت ہی خاص وجہ ہے۔ مسلمانوں کو منحوس کا لقب مولانا ہی دے سکتے تھے۔ اور وہ بھی خود مسلمانوں کے سامنے حسرت موہانی، محمد علی جوہر، شوکت علی، مولانا محمود الحسن، مولانا حسین احمد مدنی وغیرہ کی بے مثال قربانیاں بھی مولانا بھول گئے۔ حسرت موہانی نے ۱۹۲۱ء کے کانگریس سیشن میں جب مکمل آزادی کا رزولوشن پیش کرنا چاہا تو گاندھی جی نے کہا کہ ''مولانا ہمیں ایسے پانیوں میں لے جانا چاہتے ہیں جن کی گہرائی کا اندازہ نہیں۔'' محمد علی جوہر نے انگلینڈ میں گول میز کانفرنس میں اعلان کیا کہ میں غلام ہندوستان واپس جانا پسند نہیں کروں گا۔ خدا نے ان کی لاج رکھ لی۔ ان کا وہیں انتقال ہوا اور بیت المقدس میں دفن ہوئے۔ یہ خلافت کانفرنس ہی تھی جس نے سب سے پہلے انگریز حکمرانوں کی

آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ملک کی آزادی کی آگ بھڑکائی ورنہ ہندوستانی انگریزوں سے مقابلہ آرائی سے بالکل نا آشنا تھے اور ہمت نہ ہوتی تھی کہ مقابلہ کریں۔اس وقت تک کانگریس وفاداری کے رزولوشن پاس کرتی رہی تھی۔ایسا نہ تھا کہ مولانا اس تاریخ سے ناواقف رہے ہوں گے بلکہ جان بوجھ کر مسلمانوں کے دلوں سے باعزت اور برابری کی زندگی کا تصور نکال دینا چاہتے تھے۔ان کا خیال تھا کہ ملک ہندوؤں کی خوش نصیبی سے آزاد ہوا ہے اور مسلمانوں کے لیے ملک کی خوشیوں میں کوئی حصہ نہیں ہے۔بجائے اس کے کہ مسلمانوں کے حقوق کی آواز بلند کرتے، یہ فرمایا کہ مسلمانوں کا حصہ ہی نہیں ہے کہ مسلمان انگریزوں کی غلامی چاہتے تھے۔

## ہندوؤں کا حق

''یہ ٹھیک ہے کہ وقت نے تمہاری خواہشوں کے مطابق انگڑائی نہیں لی بلکہ اس نے ایک قوم کے پیدائشی حق کے احترام میں کروٹ بدلی ہے اور یہی وہ انقلاب ہے جس کی ایک کروٹ نے تمہیں بہت حد تک خوف زدہ کر دیا ہے۔''

مسلمان اگر خوفزدہ تھے تو انھیں سہارے اور دلاسہ کی ضرورت تھی نہ کہ الزام تراشیوں اور لعنت ملالت کی لیکن مولانا نے ایک بار پھر کہا کہ مسلمان غیر ملکی غلام چاہتے تھے اور وہ حاکموں کی طمع کا کھلونا بنے ہوئے تھے۔

''ہاں تمہاری بے قراری اس لیے ہے کہ تم نے اپنے تئیں اچھی شے کے لیے تیار نہیں کیا تھا اور بری شے کو ہی نجات مادی سمجھ رکھا تھا۔میری مراد غیر ملکی غلامی سے ہے جس کے ہاتھ میں تم نے مدتوں حاکمانہ طمع کا کھلونا بن کر زندگی بسر کی ہے۔''

قوم کے کچھ افراد کی نسبت یہ الزام لگانا کہ وہ غلامی چاہتے تھے کہ ان کو اسی میں فائدہ تھا ایک الگ بات ہے لیکن پوری قوم کو غلامی پسند قرار دینا مولانا کا ہی کام تھا۔

''مجھے سات برس کی روداد دہرانے سے کوئی فائدہ نہیں اور نہ اس سے کوئی اچھا نتیجہ نکل سکتا ہے البتہ ہندوستانی مسلمانوں پر مصیبتوں کا جو ریلا آیا ہے وہ یقیناً مسلم لیگ کی غلطیوں کا بدیہی نتیجہ ہے یہ سب کچھ مسلم لیگ کے لیے تو



موجب حیرت ہو سکتا ہے لیکن میرے لیے اس میں کوئی نئی بات نہیں میں پہلے ہی دن سے ان نتائج پر نظر رکھتا تھا۔''

ہندوستان کے مسلمانوں پر مصیبتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ کن کن وجوہات کی بنا پر ہے۔یہ ایک الگ موضوع ہے لیکن اگر مولانا کی نظر پہلے ہی سے ان حالات پر تھی تو غالباً آج کے حالات پر بھی ان کی نظر رہی ہوگی۔اگر اس وقت مسلم لیگ ذمہ دار تھی تو آج کون ذمہ دار ہے؟ کیا یہ کہا جائے کہ مولانا آزاد ذمہ دار ہیں؟ اقتصادی ترقی کے دروازے مسلمانوں پر بند ہیں، ان کی تعلیم کا کوئی خاص انتظام نہیں ان کو نوکریاں نہیں دی جائیں اور آئے دن کے فسادات نے ان کی کمر توڑ کر رکھ دی ہے۔سرکاری ایجنسیاں جیسے پولس اور پی اے سی غیرہ کھل کر اینٹی مسلم فسادات میں حصہ لیتی ہیں یہ سب کس کی حکومت میں ہو رہا ہے؟ اسی کانگریس کی حکومت میں ہو رہا ہے جس کی انصاف پسندی کے مولانا معتقد تھے بلکہ مولانا نے کانگریس کا اعتماد مسلمانوں میں قرآن وحدیث کے ذریعہ پیدا کیا۔خود مولانا کے سامنے ہی ہزاروں مسلم کش فسادات ہوئے اردو ختم کی گئی اور مولانا نے اپنا سر ہندی کے آگے جھکا دیا۔نمازیوں کو گولی سے بھون دیا گیا اور کیا کیا نہ ہوا مولانا کی کانگریس کی حکمرانی میں؟

''اب ہندوستان کی سیاست کا رخ بدل چکا ہے مسلم لیگ کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں ہے۔اب ہمارے دماغوں پر منحصر ہے کہ ہم کسی اچھے انداز فکر میں سوچ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔''

ملک کی تقسیم کی ذمہ داری مسلمانوں پر صرف اسی لیے جان بوجھ کر ڈالی جاتی ہے کہ وہ کہیں پھر سے اپنے مطالبات کے لیے مسلم لیگ یا اپنی دوسری جماعتیں نہ بنالیں۔مولانا کا یہ فرمانا کہ اب مسلم لیگ کے لیے ہندوستان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔حقیقت میں منہ موڑنا ہے۔اس وقت بھی جس وقت مولانا تقریر فرما رہے تھے مسلم لیگ کے ممبر کاسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں موجود تھے۔مولانا محمد اسماعیل خاں صاحب کی اسمبلی کے اندر تقاریر موجود ہی انھوں نے پہلے ہی دن سے اسمبلی کے اندر مسلمانوں کے حقوق کے خلاف جنگ چھیڑ دی تھی۔خاص طور سے جداگانہ انتخابات کے مسئلہ پر سردار پٹیل سے ان کی جھڑپیں ہوئیں۔یہ سب ریکارڈ میں

موجود ہیں کوئی کہی سنی بات نہیں ہے پھر اسی مسلم لیگ سے جنوبی ہندوستان کی کئی ریاستوں میں کانگریس نے اتحاد کیا اور ایک عرصہ تک کیرالہ میں ساتھ ساتھ حکومت کی جان مسلمانوں کو پسماندہ قرار دیا گیا اور انکے لیے 11% رزرویشن تمام سروسز اور تعلیمی اداروں میں آج بھی جاری ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ مسلم لیگ کے لیے ہندوستان میں جگہ نہیں غلط ہے۔ مسلم لیگ ایک دن کے لیے بھی ہندوستان سے ختم نہیں ہوئی ہاں البتہ شمالی ہندوستان سے یہ پارٹی ضرور ختم کر دی گئی، اس وجہ سے کہ مولانا آزاد اور جمعیۃ العلماء کا اس علاقہ میں پاکستان بننے کے بعد کوئی مدمقابل نہ رہا۔ لیکن یہ صورت حال کچھ سالوں تک رہی اور ۱۹۶۹ء میں میرٹھ میں پھر سے مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا اور نوجوانوں کے طبقہ نے اس کی آواز پر لبیک کہا آخر نتیجہ یہ نکلا کہ چودھری چرن سنگھ تک نے بحیثیت وزیراعظم مسلم لیگ سے الیکشن الائنس کیا اور مسلم لیگ کے نمائندے کے لیے اسی دہلی جامع مسجد کے سامنے مسلمانوں کو خطاب کیا اور ووٹوں کی اپیل کی کہ چاندنی چوک پارلیمانی حلقہ سے مسلم لیگ کے امیدوار کو ووٹ دیں۔ یہ ہے تاریخ کا فیصلہ جس نے مولانا کے دعوے کو غلط ثابت کر دکھایا۔

### ہجرت غلط ہے

''یہ فرار کی زندگی جو تم نے ہجرت کے مقدس نام پر اختیار کی ہے اس پر غور کرو تمہیں محسوس ہوگا کہ یہ غلط ہے۔ اپنے دلوں کو مضبوط بناؤ اور اپنے دماغوں کو سوچنے کی عادت ڈالو اور پھر دیکھو کہ تمہارے فیصلے کتنے عاجلانہ ہیں آخر کہاں جا رہے ہو؟ یہ دیکھو مسجد کے مینار تم سے جھک کر سوال کرتے ہیں کہ تم نے اپنی تاریخ کے صفحات کو کہاں گم کر دیا ہے؟ ابھی کل کی بات ہے کہ یہیں جمنا کے کنارے تمہارے قافلوں نے وضو کیا تھا اور آج تم کو یہاں رہتے ہوئے خوف محسوس ہوتا ہے۔''

مولانا کا یہ مشورہ بہت قیمتی اور بہت سودمند تھا یقینی طور سے حالات سے گھبرا کر مسلمانوں کو ترک وطن نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مولانا کی اس اپیل کا دہلی کے مسلمانوں پر اثر بھی ہوا۔ حالانکہ فسادات کے نہ ختم ہونے والے سلسلہ نے کسی بھی طرح کے سفر کرنا ممکن بنا دیا تھا پھر بھی مولانا کی تقریر کا اثر دہلی کے مسلمانوں پر ہوا اور بہت سے لوگوں



نے ہجرت کا ارادہ ترک کر دیا۔

''عزیزو! اپنے اندر ایک بنیادی تبدیلی پیدا کرو جس طرح آج سے کچھ عرصہ پہلے تمہارا جوش وخروش بیجا تھا اسی طرح آج تمہارا یہ خوف و ہراس بھی بیجا ہے۔ مسلمان اور بزدلی یا مسلمان اور اشتعال ایک جگہ جمع نہیں رہ سکتے......
سچے مسلمانوں کو نہ کوئی طمع ہلا سکتی ہے اور نہ کوئی خوف ڈرا سکتا ہے۔''

تقریر کے اس حصہ میں ضرور ایسا لگتا ہے کہ کوئی مسلمانوں کا ہمدرد ان سے مخاطب ہے اور بہت سمجھداری کی باتیں مولانا نے مسلمانوں کو بتائیں۔ آخر پاکستان سے باقی مسلمانوں کو کیا مطلب ہو سکتا تھا لوگ خاخواہی امیدیں باندھ کر اس ملک میں جا رہے تھے جو ان کے لیے بنا ہی نہ تھا۔ یہ مطالبہ ہی نہ تھا کہ مسلمانوں کے لیے پاکستان بنوایا جا رہا ہے بلکہ ایک سیاسی جماعت نے مسلم اکثریتی علاقوں کو الگ ملک بنانے کی تجویز رکھی تھی جو اتفاق رائے سے مان لی گئی۔ اس تجویز میں اقلیتوں کے لیے قانونی گارنٹی کی بات بھی کہی گئی تھی۔ سو قانونی گارنٹی ملنی ہی تھی اس لیے خوف اور ہراس واقعی بیجا تھا اور مولانا نے صحیح وقت پر مناسب تلقین مسلمانوں کو کی۔

کچھ دیر اچھی اچھی باتیں کرنے کے بعد مولانا نے پھر سے مسلمانوں پر انگریز پرستی کا الزام لگایا:

''میں تمہیں نہیں کہتا کہ تم حاکمانہ اقتدار کے مدرسے سے وفاداری کا سرٹیفکٹ حاصل کرو اور کاسہ لیسی کی وہی زندگی اختیار کرو جو غیر ملکی حاکموں کے عہد میں تمہارا شعار رہا ہے۔''

یعنی مسلمان انگریزوں کے دور میں کاسہ لیسی کر رہے تھے۔ مسلم قوم نے کبھی بھی کاسہ لیسی نہ کی بلکہ ہمیشہ بے انصافی اور ظلم کے سامنے سینہ سپر رہی آزادی کے بعد بھی اور پہلے بھی جہاں آزادی کے بعد قوم پرور قائدین نے ضرور کاسہ لیسی کو اپنا شعار بنا لیا۔ ہزاروں واقعات بھارتی مسلمانوں پر ظلم اور ناانصافی کے ہوئے لیکن مولانا آخر وقت تک وزیر بنے رہے اور ایک بار بھی احتجاجاً وزارت چھوڑنے کی دھمکی تک نہ دی۔

○

# مسئلہ تاسیس و تجدید

ملت اسلامیہ کو پستی اور ادبار سے نکالنے کے لیے مختلف مصلحین نے اپنے اپنے طریقے سے کوششیں کیں اور حل پیش کیے اس مسئلہ کا حل مولانا کے پاس کیا تھا ہم یہاں اس کی تشریح کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے خیال میں تین مختلف مذاہب اصلاح موجود ہیں۔ پہلے مذہب یا طریقہ کو وہ اصلاح فرنجی سے موسوم کرتے ہیں۔ یہ فرقہ ان کی نظر میں وہ ہے جس نے یورپ کی ترقی اور چمک دمک کو دیکھ کر بجائے اس کے کہ وہ اس کا مقابلہ کرتا اہل یورپ اور عیسائیوں کی تقلید واطاعت میں مسلمانوں کے احیاء کا خواب دیکھا۔ جمعیۃ العلماء ہند کے لاہور اجتماع میں جو نومبر ۱۹۲۱ء میں منعقد ہوا خطبۂ صدارت دیتے ہوئے فرمایا:

> ''جب یورپ کے ہوش ربا تمدن کا جلوہ اسلامی ممالک کے سامنے بے نقاب ہوا تو دو مختلف اثرات جماعتوں پر مرتب ہوئے غالب جماعت نے تو اپنی غفلت اور جمود کی وجہ سے اس انقلاب و تغیر کی طرف نظر ہی نہ اٹھائی۔ لیکن ایک جماعت ارباب بینش و جزم کی تھی جس نے فوراً تغیر احوال کو محسوس کیا۔ اپنی پستی و کمزوری اور جلوے کی نظر فریبی و ہوشربائی کی وجہ سے یہ اول نظر مرعوب و مسحور ہوگئی اور مقابلہ و مقاومت کی جگہ تقلید و اطاعت کے جذبات اس میں پیدا ہوگئے۔ ہندوستان میں سرسید احمد خاں مرحوم اور ان کے متبعین اور مقلدین ٹرکی میں سلطان محمود خاں اور اس کے عہد کے وزراوغیرہم اسی گروہ میں محسوب ہیں۔''[1]

یورپ کی تقلید کا الزام جس انداز سے مولانا آزاد نے سرسید پر لگایا ہے وہ یقینی طور سے درست نہیں ہے۔ سرسید یورپ کی تقلید میں بلکہ یورپی علوم وفنون سائنس و ٹکنالوجی کو



مسلمانوں میں رائج کر کے ان کو دنیا کی سربلند قوموں کی برابری عطا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا نظریہ تھا کہ دنیا کی کوئی قوم بغیر علوم وفنون پر مہارت حاصل کیے ہوئے عزت یافتہ نہیں ہوسکتی اور اطاعت کا جہاں تک تعلق ہے اطاعت ہتھیاروں اور علم کی طاقت سے کرائی جاتی ہے اور جاہل وغیر تربیت یافتہ قومیں ہمیشہ محکوم رہی ہیں آج بھی ہیں اور آئندہ بھی رہیں گی۔ مقابلہ و مقاومت خالی دماغ اور فرسودہ ہتھیاروں سے نہیں ہوسکتا۔ مسلمان ایک زمانے سے اپنی برتری کھو چکے تھے اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے ہاتھوں سے صدیوں پرانی حکومتیں انگریزوں اور دیگر یوروپی اقوام کے ہاتھوں میں کیوں جاتیں؟ لہٰذا سرسید نے مسلمانوں کے لیے علم و ہنر حاصل کرنے کو ضروری قرار دیا۔ اور آج زمانہ ان کی فہم و فراست کا قایل ہے اور ہندوستانی مسلمان کا سر سرسید کے بار احسان سے جھکا ہوا ہے۔

مولانا آزاد کی نظر میں دوسرا گروہ اصلاح سیاسی کے طریقہ پر کاربند ہے۔ اس کا عقیدہ یہ ہے کہ جب تک سیاسی اصلاح اور پولیٹیکل طاقت مسلمانوں کے ہاتھ میں نہ آئے گی ان کی فلاح کی کوئی امید نہیں کی جاسکتی۔ تیسرا گروہ اصلاح دینی واسلامی پر یقین رکھتا ہے کہ اس طریقہ سے مسلمان عزت یافتہ ہوجائیں گے درحقیقت یہی گروہ ہے جسے مولانا صراط مستقیم پر مانتے ہیں۔ پہلے دو نظریات تعلیمی ترقی اور سیاسی اصلاح مولانا کی نظر میں غلط ہیں۔

> ''فی الحقیقت مسئلہ اصلاح میں یہی گروہ اصحاب رشد و ہدایت اور سالکین جادۂ اقتصاد و حق رہا ہے۔''[2]

مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ انھوں نے الہلال اسی مقصد سے جاری کیا اور اسی مقصد کے حصول کے لیے جمعیۃ العلماء ہند وجود میں آئی۔ دعوے میں اور عمل میں تضاد کافی واضح ہے کیونکہ جمعیۃ العلماء ایک نیم سیاسی جماعت رہی ہے اور اس کے مقاصد میں مسلم لیگ کے نظریات کی مخالفت کا عنصر ہمیشہ بنیادی نظریہ رہا ہے اور اس جماعت نے ہمیشہ وطن کو قوم کی اساس قرار دیا۔ دین و مذہب کی تبلیغ کبھی بھی اس جماعت کا مقصد نہیں رہا بلکہ یہ جماعت کانگریس کے مقاصد کو پورا کرنے کے لیے گاندھی کے ذریعہ وجود میں آئی تا کہ مسلمان جو مذہب کے نام پر ہر کام کرنے کو تیار ہوجاتا ہے اس کو کچھ دینی عالم بسبب اپنے علم کے کانگریس کے نظریہ نیشنل ازم کی طرف مائل کرسکیں۔ یہ ایک بہت بڑا سیاسی مقصد ہے جس پر

یہ جماعت آج تک کاربند ہے۔ جمعیۃ العلماء کے تیسرے سیشن کی صدارت کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا:

''آج آپ کی یہ مقدس ومبارک جمعیۃ العلماء جس مقصد کی جستجو میں منعقد ہوئی ہے میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ یہ وہی یوسف مقصود ہے جس کے فراق میں ۱۹۱۱ء سے متصل واسفاعلیٰ یوسف کی فغاں سنجی کررہا ہوں...... ۱۹۱۱ء سے آج تک یہ مقصد میرے دل کی تمناؤں اور آرزوؤں کا مطلوب اور میری روح کی عشق وشیفتگی کا محبوب رہا ہے۔''[۳]

اسی خطبہ میں اس نظریہ کا بھی اظہار کیا کہ مسلمانوں کو تجدید کی ضرورت ہے تاسیس کی نہیں۔تجدید کے معنی یہ ہیں کہ پہلے سے موجودہ چیزوں کو صحیح حالت میں کرلیا جائے اور تاسیس کے یہ معنی ہیں کہ نئے علوم اور نئے طریقے سیکھے جائیں۔مولانا نے اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا:

''اس کی ضرورت ہے کہ ازسرنو نئی باتیں نئے طریقے نئے ڈھنگ نئے نظام اور نئی نئی چالیں اختیار کی جائیں یا صورت حال یہ ہے کہ پہلے سے ایک کارخانۂ ملت موجود ہے جس کو اپنی بقا وترقی کے لیے کسی نئی بات کی احتیاج نہیں مگر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں اور بہت سی باتیں بڑھادی گئی ہیں پس ضرورت اس امر کی ہے کہ خرابیاں دور کردی جائیں۔کھوئی ہوئی چیزیں واپس لے لی جائیں اور اس کو ویسا ہی بنادیا جائے جیسا کہ وہ اصل میں تھا......''

نئے نظام اور نئے طریقے تو آج کی دنیا کی خصوصیت ہیں ہرروز نئے نئے انکشافات ہورہے ہیں سائنس وٹکنالوجی نے ناقابل یقین ترقی کرلی ہے۔ان علوم اور نظریات کو جانے بغیر آج کوئی بھی قوم دنیا میں عزت سے نہیں رہ سکتی۔پہلے سے جو کارخانہ ملت موجود تھا اس کی حالت کا بھی سب کو اندازہ ہے نہ صرف ۱۹۲۰ء کے آس پاس بلکہ آج کے دور میں بھی جب کہ زمانہ اتنی ترقی کرچکا ہے وہی پرانا شخصی حکومتوں کا نظام فرسودہ طریقۂ تعلیم اور ہر



نئی اور ترقی یافتہ چیز کو پہلے ٹھکرانے اور بعد میں اپنانے کی ادا۔آخر اسی تعلیم کو جس کو سرسید مسلمانوں میں رائج کرنا چاہتے تھے جس پر مکہ و مدینہ تک سے سرسید کے واجب القتل ہونے اور کفر کے فتوے لائے گئے آج اسی مکہ و مدینہ میں نہایت عالی شان اور موڈرن یونیورسٹیاں قائم کی جارہی ہیں۔بڑی بڑی تنخواہیں دے کر دنیا بھر سے عالموں کو لایا جاتا ہے کہ للہ ہماری نسلوں کو پڑھاؤ کہ یہ جاہل رہی جاتی ہیں اور ان علماء کا نام ونشان تک نہیں جو اب نئی تعلیم کی مخالفت کرسکیں۔ان کے فتوے اور ان کے افکار حرف غلط کی طرح مٹ گئے۔سرسید کے سوسال کے بعد اب ان کی سمجھ میں نئی تعلیم اور سائنس کی اہمیت آئی حالانکہ قرآن جگہ جگہ یہ حکم دیتا ہے کہ غور کرو تفکر کرو اور کائنات کو تسخیر کرو مگر نہ قرآن کا حکم مانتے ہیں اور نہ عقل کا۔وقت گزرجانے کے بعد جو انسان صحیح بات کو مانے عقلمند نہیں کہلا سکتا۔ایک طبقہ ہمیشہ سے ہی ایسا موجود رہا ہے جو اپنے ذاتی اغراض ومقاصد کو پورا کرنے کے لیے انسانوں کی ترقی اور خوشحالی کی راہ میں کانٹے بچھاتا ہے اور اس عمل کے لیے وہ قرآن اور اسلام کا حوالہ دیتا ہے اور اسوہ رسول اللہ سے دلیلیں لاتا ہے۔

''منجملہ ان عظیم ترین اختلافات کے جو مجھ میں اور کارفرمایان ملت میں ہیں ایک اصولی اختلاف ہے کہ وہ آج جب کبھی کسی کام کے لیے اٹھتے ہیں تو چاہتے ہیں کہ راہ تاسیس اختیار کریں اور میں اللہ کی بخشی ہوئی بصیرت کی بنا پر مسلمانوں کے لیے ان کے اعمال ملی میں سے کسی شاخ کے لیے بھی تاسیس کی ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ صرف تجدید کی اور اس بارے میں اس درجہ متعصب اور متقشف ہوں کہ ایک لمحے کے لیے بھی اپنی رائے میں متزلزل نہیں ہوسکتا۔''[۴]

تاسیس کے خلاف اس وقت کے علماء بھی تھے اور آج بھی ہیں۔نہ جانے کیوں نئے علوم اور نظریات سے یہ لوگ اتنا ڈرتے ہیں اسلام کو اتنا بودا کیوں سمجھ رکھا ہے کہ وہ سائنسی نظریات کے آگے ٹک نہیں سکتا۔حالانکہ اسلام تو ہمیشہ ہی ہر زمانہ میں کسی بھی نئے فلسفہ کے مقابلہ میں سربلند رہا ہے۔نئی سائنس وتعلیم اسلام کی حمایت کے لیے بھی استعمال کی جاسکتی ہے۔یہ سب حقائق تو علماء بھی جانتے ہیں لیکن پھر بھی دینی مدارس میں سائنس،انگلش و

ہندی رائج کرنے پر رضامند نہیں ہیں اس کی وجہ حمیت اسلامی نہیں ہے بلکہ ان مضامین کے اضافے کے ساتھ ساتھ مدرسوں کے ایڈمنسٹریشن میں بھی دوسرے لوگوں کو دخل دینے کا موقع ملے گا۔ اورصدیوں سے چلی آرہی موروثی نظامت کے ختم ہونے کا ڈر پیدا ہو جائے گا لہٰذا اسلام کی حفاظت کا نعرہ بلند کر دیا جاتا ہے۔ کچھ لوگوں کی نظر میں صرف عبادات کر لینے اور دعائیں مانگنے سے ہی مسلمانوں کو دنیا میں عزت مل سکتی ہے۔ بیشک اگر خدا چاہے تو کیا نہیں ہوسکتا۔ لیکن یہ بات فطرت اللہ کے خلاف ہے جس عمل میں جو تاثیر ہے اس کا وہی اثر ہوگا دوسرا نہیں۔ نماز فرض ہے مگر یہ نہیں ہوسکتا کہ پڑھیں نماز اور پیدا ہو جائے گیہوں کی کوئی نئی ورایٹی۔ نماز کا اثر اپنی جگہ ہے اور ریسرچ کا نتیجہ اپنی جگہ مولانا آزاد نے غیروں کی تقلید کی مخالفت میں فرمایا:

''دین کامل ہو چکا اور اتمام نعمت کا اعلان کر دیا گیا......اور مجھے یقین ہے کہ ہم میں ایک فرد واحد بھی ایسا نہ ہوگا جو یہ کہے کہ اصلاح ملت اسلامیہ کے لیے قرآن وشریعت کی تعلیمات ونظامات کافی نہیں ہیں اور ہمیں غیروں کی تقلید اور دریوزہ گری کی ضرورت ہے۔ پس یہ امر تو متفق ومسلم ہے کہ راہ صلاح میں ضرورت صرف تجدید کی ہے تاسیس کی نہیں ہے۔''۵

غیروں کی تقلید کا نظریہ بھی خوب ہے ایک مشہور حدیث میں حکم دیا گیا ہے کہ علم اگر چین میں حاصل ہو تو اس کو حاصل کرو گویا یہ بھی غیروں کی تقلید کا حکم ہے۔ نئی دریافتوں سے فائدہ اٹھانے میں سب برابر شریک ہیں اور اس وقت غیروں کی تقلید کا سوال نہیں پیدا ہوتا مگر جب کوئی کہتا ہے کہ ان کے علوم وفنون محنت کر کے سیکھو تو تقلید کا سوال پیدا ہو جاتا ہے اکثر علماء کی نظر میں مسلمانوں کا مقصد آگے بڑھنا نہیں ہے بلکہ پیچھے ہٹنا ہے تاکہ مسلمان صحابہؓ جیسے ہو جائیں اور یہ بات ہمیشہ سائنس اور نئی تعلیم کے خلاف استعمال کی جاتی ہے گویا خدانخواستہ صحابہ کرام دنیا سے ایسے ہی ناواقف تھے جیسے کہ ہم ہیں۔ مولانا الہلال میں لکھتے ہیں:

''ہم کو اپنے کاموں میں چاہیے کہ گزشتہ اصولوں کو زندہ کریں ہم کو نئے مقصدوں کی ضرورت نہیں ہے ہم کو نئی صداؤں کی احتیاج نہیں



ہم کو آگے نہیں بڑھنا ہے بلکہ پیچھے ہٹنا ہے...... نئے ولولوں اور نئے تماشوں کا بھی ہم نے تجربہ کر لیا اب ہم اکتا گئے ہیں اور زیادہ تجربہ کی ہم میں سکت نہیں ہمیں چھوڑ دو تا کہ اپنی قدیم وحشت کی ایک ادنیٰ ادا پر تمہاری نئی دلفریبیوں کو قربان کر دیں۔''۶

لفظ قدیم وحشت خاص طور سے قابل توجہ ہے۔ مسلمانوں کو کبھی وحشت نہیں رہی بلکہ وہ بہت سمجھدار، سنجیدہ اور کارخانۂ حیات کو سمجھنے والے اور اپنے زمانے میں بڑی بڑی سائنسی دریافتیں کرنے والے تھے اور ہم آج قدیم وحشت کا ذکر کر کے ان کی دانشمندی اور اقبال مندی کی توہین کرنا چاہتے ہیں۔ گویا وہ محض جذباتی تھے اور تلوار چلانا جانتے تھے علوم اور صنعت وحرفت سے کچھ ان کو تعلق نہ تھا۔ آج ضرور اسلام کے نام لیوا مسلمانوں کو بہکانے میں کامیاب ہو گئے ہیں اور سائنس اور دیگر علوم کو اسلام کے مخالف سمجھا جاتا ہے۔ مگر خدارا اپنے بزرگوں کو تو بدنام نہ کرو۔ وہ ایسے نہ تھے ہاں مگر ہم نے اسلام کو بدنام کر دیا ہے ایسا محسوس ہوتا ہے گویا اسلام ہر طرح کی ترقی اور خوشحالی کے خلاف ہے ضرورت ہے کہ سنجیدگی اور خلوص کے ساتھ معاملات پر غور کیا جائے اور مسلمانوں کی ترقی کی راہیں تلاش کی جائیں کہ اسی میں اسلام کی ترقی ہے۔ سرسید نے فرمایا کہ:

''اگر تمام مسلمان مفلس ذلیل اور نان شبینہ کو محتاج ہو جائیں گے تو اسلام کی کیا عزت باقی رہ جائے گی؟ نیک عالم اور درویش جو اس قسم کی باتیں کہتے ہیں وہ خدا کی طرف ایسے متوجہ ہیں کہ ان کو دنیا کی باتوں پر اور عواقب امور پر کچھ خیال نہیں وہ یہ نہیں سمجھتے کہ اگر مسلمانوں کو دنیاوی علوم اور دنیاوی دولت وحشمت کی عزت حاصل ہوگی تو اس سے خود اسلام کی کیسی رونق اور شوکت ہو جائے گی۔''۷

سرسید مسلمانوں کے لیے راہ تاسیس کو پسند کرتے تھے ان کا خیال تھا کہ اسلام کی حمایت بغیر مروجہ علوم پر فتح پائے کامیابی کے ساتھ نہیں ہوسکتی لہٰذا انھوں نے تمام زندگی مسلمانوں میں سائنس اور نئے علوم کے رواج دینے میں صرف کر دی۔ راہ تاسیس سے علما خوفزدہ دکھائی دیتے ہیں ان کے خیال میں نئے علوم اور سائنس کی تعلیم طلباء کے عقائد میں

خرابی پیدا کر دیتی ہے اور وہ گمراہ ہوجاتے ہیں لہٰذا بڑے بڑے مدارس جیسے ندوۃ العلماء لکھنؤ تک میں انگریزی زبان سائنس اور ریاضیات کے بنیادی مضامین تک شامل نصاب نہیں ہیں۔مولانا ابوالحسن علی ندوی علی گڑھ کے طلباء کی گمراہی کے سلسلہ میں رقم طراز ہیں:

> ''مغربی ماحول کی وجہ سے جو کالج پر چھایا ہوا تھا ایک ایسی اسلامی نسل پیدا ہوئی جو نام کے لحاظ سے مسلمان اور ذہن و دماغ کے لحاظ سے خالص مغربی تھی معاشرت وتمدن میں انگریز طورطریقوں کی پابند اور حامی،عقائد میں بعض اوقات کمزور اور متزلزل۔''[۸]

اور ندوۃ العلماء سے فارغین ولیوں اور نائبین رسول کی صف میں شامل ہوجاتے ہیں!!!

○

## حواشی:

(۱) خطبات آزاد،ص:۱۰۹

(۲) ایضاً

(۳) ایضاً،ص:۱۱۴

(۴) ایضاً

(۵) ایضاً،ص:۱۲۷

(۶) الہلال،جولائی ۱۹۱۳ء،ص:۸۵

(۷) مجموعہ لیکچرز،ص:۷۷

(۸) ہندوستان میں مغرب و مشرق کی کشمکش،ص:۹۵

# جمعیۃ العلماءِ ہند کا نظریہ قومیت

نظریۂ نیشنل ازم جو زیادہ تر ممالک میں آج دنیا میں رائج ہے اس کی بنیاد مغرب میں پڑی۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے یہ نظریہ خاص خلافت عثمانیہ کو پاش پاش کر کے چھوٹے ممالک میں بانٹ دینے کے لیے استعمال کیا۔ اسی نظریہ کے مقبول ہونے سے عربوں نے ترکوں سے بغاوت کی اور نتیجتاً مکہ معظّمہ میں وہ شرم انگیز واقعہ پیش آیا جس میں شریف مکہ کے حامیوں نے ترک فوجوں کو خاص حرم شریف میں شہید کیا اور حرمت حرم کی حفاظت اور احکام شرع کی پابندی کرتے ہوئے ترکوں نے ہتھیار نہیں اٹھائے اور چپ چاپ حرمت حرم پر قربان ہوگئے۔ عربوں اور ترکوں میں اسلام کے رشتہ کو ختم کر کے عرب قومیت اور ترک قومیت کو ہوا دینے کا اہم کام ایک ایسے شخص نے کیا جو تاریخ میں لارینس آف اریبیا کے نام سے مشہور ہے۔ یہ شخص حقیقتاً عرب یہودی تھا لیکن مسلمانوں کو دھوکا دینے اور ان میں نسلی امتیازات پیدا کرنے کے لیے بظاہر مسلمان بن گیا تھا اور اس وقت اس کا شمار دینی علماء کرام کی صف اول میں کیا جاتا تھا۔ اسی حیثیت کا فائدہ اٹھا کر اس نے یہ خیال عام کیا کہ رسول اللہؐ عرب تھے اور عرب قوم کا وقار ان کو زیادہ عزیز تھا۔ عرب دوسرے مسلمانوں سے افضل ہیں اور نسلی فرق کے سبب الگ قوم ہیں یہی نظریات ترکی میں بعد کو کمال اتاترک کے عروج کا سبب بنے۔ ہندوستان میں یہ نظریہ انگریز حاکم اپنے ساتھ لائے اور سرہیوم ولارڈ ڈفرن نے ان نظریات کی بنیاد پر ۱۸۸۵ء میں نیشنل کانگریس قائم کی۔ کانگریس پورے ملک کے تمام باشندوں کی نمائندگی کی دعویدار تھی۔ اس اہم مسئلہ پر کہ آیا کانگریس کا نظریۂ نیشنل ازم درست ہے ہندوستان کے علماء میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ ایک گروہ ایسا تھا جو نیشنل ازم کو قرآن وحدیث سے ثابت کر رہا تھا اور دوسرا گروہ اتنی ہی شدت سے اس نظریہ کو اسلام کے منافی قرار دے رہا تھا۔ پہلے گروہ میں جمعیۃ العلماء ہند پیش پیش تھی جس کے



قائدین میں مولانا حسین احمد مدنی، مولانا آزاد، مولانا محمود الحسن وغیرہ اہم تھے اور دوسرے گروہ میں مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا اشرف علی تھانوی، مولانا مودودی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ دونوں گروپ اپنے اپنے نظریات کی دلیل قرآن وحدیث اور اسوۂ رسول اللہ سے لاتے تھے۔

اس سلسلہ میں ایک دلچسپ بحث مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال کے درمیان چلی۔ مولانا حسین احمد مدنی نے اپنے ایک مضمون میں اس نظریہ کا اظہار کیا تھا کہ قومیں اوطان سے بنتی ہیں اور قوم کی بنیاد وطن ہے۔ علامہ اقبال کے دل پر اس بیان کا بہت اثر ہوا اور انھوں نے ایک مضمون مولانا کے نظریہ کی مخالفت میں سپرد قلم کیا۔ جو روزنامہ 'احسان' لاہور بابت ۹ر مارچ ۱۹۳۸ء کو شائع ہو کر مقبول عام ہوا۔ اسی مضمون کو عبدالغفار شکیل نے اپنی کتاب 'علامہ اقبال کے نثری افکار' میں شامل کیا جو انجمن ترقی اردو ہند کی طرف سے شائع ہوئی ہے۔ اس مضمون کے علاوہ ارمغان حجاز میں 'حسین احمد' کے عنوان سے ایک نظم بھی علامہ اقبال نے لکھی۔ اس کے تین اشعار مندرجہ ذیل ہیں:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ — ز دیوبند حسین احمد چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است — چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است
بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

علامہ اقبال اس نظریہ کے شروع سے ہی مخالف تھے۔ یوروپ میں اپنی تعلیم کے دوران ان کو اس نظریہ کو قریب سے سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ ان کے خیال میں یہ نظریہ ملت اسلامیہ کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کے لیے وضع کیا گیا تھا۔ لکھتے ہیں:

''میں نظریۂ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہوگئی تھی کہ یوروپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت

کی جائے چنانچہ ان کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں بھی کامیاب ہوگئی اوراس کی انتہا یہ ہے کہ اب ہندوستان میں مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں۔''

ہندوستان کے علماء نے مغرب کی بہت سی چیزوں کو ٹھکرایا مثلاً ان کی سائنس، طرز معاشرت، فلسفہ اوران کی زبانیں، اسی کے ساتھ مغرب کی دوسری چیزوں کو بڑھ کر گلے سے بھی لگایا مثلاً مغرب کی مصنوعات ان کی ایجادات جیسے کاریں، ٹیلیفون، مائکروفون، نظریۂ وطنیت اور سیکولرازم وغیرہ وغیرہ۔ علامہ نے یورپ ہی میں یہ بات سمجھ لی تھی کہ عیسائیت دین کو پرائیوٹ وانفرادی معاملہ سمجھتی ہے اس لیے اسٹیٹ سے مذہب کا کوئی تعلق نہیں ہوسکتا:

''مسیحیت نے یہ تعلیم دی ہے کہ دین انفرادی اور پرائیوٹ ہے جس سے یورپ میں یہ بحث پیدا ہوئی کہ دین چونکہ پرائیوٹ تھا عقائد کا نام ہے اس واسطے انسانوں کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے اور یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ سبق دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ نسلی ہے نہ انفرادی نہ پرائیوٹ بلکہ خالصتاً انسانی ہے۔''

علامہ کو مولانا حسین احمد کے بیان میں فتنہ نظر آیا اوران کے خیال میں مولانا خود بھی اس فتنے سے بےخبر نہیں ہوسکتے تھے۔

''جو فتنہ مولانا حسین احمد کے ارشاد میں پوشیدہ ہے وہ زیادہ دقت نظر کا محتاج ہے۔ مولانا حسین احمد نے جو نظریہ قوم کے سامنے پیش کیا ہے امت محمدیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بےخبر نہیں ہوسکتے۔ انھوں نے لفظ قوم استعمال کیا یا ملت؟ ہر اس لفظ سے جو ان کے تصور میں امت محمدیہ ہے اور اس کی اساس وطن قرار دینا ایک نہایت دل شکن اورافسوسناک امر ہے۔''

مولانا حسین احمد نے اپنے بیان میں ملت اور قوم کو الگ الگ معنی میں استعمال کیا



تھا۔ علامہ کا خیال تھا کہ دونوں صورتوں میں یہ نظریہ مسلمانوں کے لیے خطرناک ہے اور ملک کی اکثریت کے حق میں جاتا ہے اور مسلمان نقصان میں رہیں گے۔

''مسلمان بحیثیت قوم اور ہوسکتے ہیں اور بحیثیت ملت اور دوسرا یہ کہ ازروئے قوم اور ہوسکتے ہیں اس لیے مذہب کو چھوڑ کر انہیں باقی اقوام ہند کی قومیت یا ہندوستانیت میں جذب ہوجانا چاہیے۔ یہ صرف قوم اور ملت کے الفاظ کا فرق ہے ورنہ نظریہ وہی ہے جس کا اوپر ذکر ہوا اور جس کے اختیار کے لیے اس ملک کی اکثریت اوراس کے رہنما آئے دن یہاں کے مسلمانوں کو تلقین کرتے رہتے ہیں۔''

علامہ کی نظر میں ملک ونسب اسلامی اخوت کا اسیر تھا۔ ان کے خیال میں اگر رسول اللہ کو وطنیت سے اتنی ہی محبت ہوتی تو وہ کبھی بھی ابوجہل وغیرہ سے مخالفت نہ مول لیتے اور بہ حیثیت عرب قومیت کے ان کو اپنے سینے سے لگائے رکھتے۔ رسول اللہ کے پیغام سے پہلے یقینی طور پر سے ایسا ہی تھا لیکن اسلام کے بعد قومیت اور نسلیت کی کوئی حیثیت نہیں رہ گئی۔

''اگر وطنیت کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا تو رسول اللہ کے بعض اقارب اور ہم نسلوں و ہم قوموں کو آپ سے پرخاش کیوں ہوگئی؟ کیوں نہ رسول اللہ نے اسلام کو محض ہمہ گیر معمولی ملت سمجھ کر بہ لحاظ قوم یا قومیت ابوجہل وابولہب کو اپنا بنائے رکھا اوران کی دلجوئی کرتے رہے بلکہ کیوں نہ عرب کے سیاسی امور میں ان کے ساتھ قومیت وطنی قائم رکھی............ محمد کی قوم آپ کی بعثت سے پہلے قوم تھی لیکن جب محمد کی امت بننے لگی تو اب قوم کی حیثیت ثانوی ہوگئی اور جو لوگ رسول کی متابعت میں آگئے وہ خواہ ان کی قوم میں سے تھے یا دیگر اقوام سے وہ سب امت مسلمہ یا ملت محمدیہ بن گئے۔ پہلے وہ ملک ونسب میں گرفتار تھے اب ملک ونسب ان کا گرفتار ہوگیا۔ ............حضور رسالت مآب کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل اور کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم

رہو مگر اسی نسلی اور وطنی اشتراک کی بنا پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان موجود ہے ایک وحدۃ عربیہ قائم کی جا سکتی ہے اگر حضور نعوذ باللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخر الزماں کی راہ نہ ہوتی۔''

نظریہ وطنیت کے مقبول عام ہونے سے اب سارے عرب ورلڈ میں امت عربیہ واحدہ کا نعرہ ہر جگہ لکھا ہوا مل جائے گا اخباروں میں، کتابوں میں، راستوں پر، ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر چاروں طرف سے یہی آواز آتی ہے کہ امت عرب ایک ہے۔ اپنے وطن سے محبت ہونا ایک فطری بات ہے انسان جہاں پیدا ہوتا ہے پلتا ہے بڑھتا ہے اس جگہ سے اس کو ایک قلبی لگاؤ ہوتا ہے لیکن سیاسی بول چال میں یہ محبت ایک نظریہ ہے صرف جذبہ نہیں۔

''عہد حاضر کے ہندوستان کے علماء کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں پیش کرنے پر مجبور کر دیا جو قرآن یا نبی امی کا منشا ہرگز نہ ہو سکتی تھیں............ کیا خدا کی بارگاہ میں امت مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی گنجائش باقی تھی کہ آپ کی ہیئت اجتماعی کا کوئی حصہ کسی عربی، ایرانی، افغانی، انگریزی، مصری، ہندی قومیت میں جذب ہو سکتا ہے۔؟''

علامہ اخوت انسانی اور تمام انسانوں سے برابر کی محبت کو ضروری سمجھتے تھے لیکن سیاست میں ان نظریات کا استعمال نظریہ قومیت کو مضبوط کرنے کے لیے کیا جائے وہ اس فعل کو سراسر غیر اسلامی سمجھتے تھے اخوت انسانی اور عالمی برادری جیسے بڑے اور بھاری الفاظ سے علامہ مرعوب نہیں ہوتے تھے لیکن مولانا حسین احمد مدنی اسلام کی تاویل اسی پہلو سے کرتے تھے اور آخر کار نظریۂ وطنیت کو اسلام سے ثابت کرنے کی کوشش میں اپنے کو کامیاب سمجھتے تھے۔

''مولانا حسین احمد مدنی کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدیر احسان سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے ملت اسلامیہ شرف انسانی اور اخوت بشری پر موسس ہے بہت سے مسلمانوں کے لیے تعجب خیز



ہوگا لیکن میرے لیے چنداں تعجب خیز نہیں۔ اس لیے کہ مصیبت کی طرح گمراہی تنہا نہیں آتی جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت کا وہ جذبہ غالب آ جائے جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہو جانا ایک لازمی امر ہے۔''

مولانا آزاد اس نظریۂ وطنیت کے خاص علمبرداروں میں سے تھے۔ اسی نظریۂ وطنیت کو بنیاد بنا کر جمعیۃ العلماء ہند کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا محمود الحسن کا مشہور بیان ہے کہ ہم سوئے ہوئے تھے مولانا آزاد نے ہمیں جگا دیا۔ اسی نظریہ کا ایک شاخسانہ یہ تھا کہ مولانا آزاد کو امام الہند کا خطاب دیا گیا۔ مولانا کی ہر تحریر و تقریر میں اس نظریہ کی وکالت ملتی ہے اور وہ اپنی تمام تر دلیلیں قرآن و حدیث سے لاتے ہیں۔

''میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کر لیں۔ یہ اعتقاد قرآن کی نص قطعی پر مبنی تھا۔'' (خطبات آزاد، ص:۴۷)

اسی نظریہ وطنیت کے سبب ہندو اور مسلمانوں میں اس قدر یگانگت بڑھ گئی تھی کہ شردھانند کو بھی مسجدوں کے ممبروں پر باعزت طریقے سے بٹھایا گیا اور ان سے تقریریں اور وعظ دلوائے گئے کیونکہ یہ تو اب قرآن کا حکم تھا کہ مسلمان ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے ہو جائیں کہ کوئی فرق ہی نہ رہ جائے کم سے کم سیاست میں مگر پھر مذہب بھی اس کی زد میں آ گیا کہ ہر دلیل قرآن سے دی جا رہی تھی:

''مجھے یقین ہے کہ میں ہندوستان کے ان مسلمانوں میں ہوں جن کو خدا نے کتاب اللہ کی طرف بلایا ہے۔ میں اپنے لیے کوئی خدمت سمجھتا ہوں تو وہ صرف یہی ہے کہ کتاب اللہ کی طرف لوگوں کو بلاؤں۔ مسلمان اپنے ہندو بھائیوں سے تمام کاموں میں الگ تھلگ

تھے۔علی گڑھ کی پالیسی مسلمہ قومی پالیسی سمجھی جاتی تھی کہ وہ ہندوؤں سے علیحدہ رہیں۔میں نے دعوت دی کہ اگر مسلمان ہندوستان کی زندگی میں بحیثیت مسلمان ہونے کے اپنے عظیم الشان فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہونا چاہیے کہ اتفاق کا قدم آگے بڑھائیں اور بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک ہوجائیں۔ مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ان کے مذہبی عمل میں سے تھا۔''

(خطبات آزاد،ص:۵۴)

یہ الزام بالکل غلط ہے کہ علی گڑھ کی پالیسی ہندوؤں سے علیحدہ رہنے کی تھی سرسید سے زیادہ کوئی اس بات کا متمنی نہیں تھا کہ ہندو عیسائی اور مسلمان سب بھائی بھائی کی طرح ہیں اور انھوں نے اکثر ہندو مسلمان کو دلہن کی دو آنکھوں سے تشبیہ دی لیکن سرسید سیاست میں ہندوؤں کی جماعتوں میں مسلمانوں کا شریک ہونا ملک کے امن کے اور مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے۔

مولانا آزاد نے اسوۂ حسنہ حضرت محمدؐ سے دلیل لا کر اس نظریۂ وطنیت کو درست ثابت کرتے ہوئے کہا:

''حضور پیغمبر اسلام کے اس اسوۂ حسنہ کو سامنے رکھ کر جو انہوں نے اہل مدینہ اور بت پرست لوگوں سے مصالحت کرتے ہوئے دکھایا وہ نمونہ جو خود جناب سرور کائنات نے پیش کیا ہے اور عملاً وحکماً جو تعلیم قرآن نے دی ہے ہندوستان کے مسلمانوں کا یہ فرض شرعی ہے کہ وہ ہندوستان کے ہندوں سے کامل سچائی کے ساتھ عہد ومحبت کا پیمان باندھ لیں اور ان کے ساتھ مل کر ایک نیشن ہوجائیں............

ہندوستان کے ساتھ کروڑ مسلمان ہندوستان کے بائیس کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایک نیشن بن جائیں۔'' (خطبات آزاد،ص:۵۱)

یہاں مولانا نے رسول اللہ کی مدینہ کے یہودیوں سے صلح کو دلیل بنایا ہے۔صلح آشتی محبت اور یگانگت یہ سب بہت خوبصورت الفاظ ہیں اور ہر شریف انسان صلح چاہے گا لیکن کسی



صلح کو بنیاد بنا کر ہمیشہ کے لیے مغربی نظریۂ وطنیت کو ثابت کرنا بالکل الگ بات ہے۔بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں مثلاً کیا رسول اللہ نے اپنی قیادت بھی ختم کردی تھی اور کسی یہودی کے ہاتھ میں دے دی تھی؟ کیا صلح کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنا الگ وجود اور سیاسی تشخص ہی ختم کر دیا جائے؟ یہ تو ہمارے علماء کے خیالات تھے کہ وہ اتنا زیادہ وفاداری میں آگے بڑھ گئے تھے کہ دین و مذہب کو بھی غلط رنگ میں پیش کرنے سے بھی باز نہیں آتے تھے۔لیکن جواہر لال نہرو کا نیشنل ازم کے بارے میں کیا خیال تھا وہ خاص توجہ کے لائق چیز ہے۔نہرو جی کا خیال تھا کہ ہندوستان میں نیشنل ازم کا چہرہ ہندوانہ تھا حالانکہ بہت سے مسلمانوں نے بھی جنگ آزادی میں حصہ لیا لیکن ہندوستانی نیشنل ازم پر ہندو حاوی تھے۔

THAT NATIONALISM HAD A STRONG APPEAL TO THE MUSLIM MIND IN INDIA AND LARGE NUMBER OF MUSLIMS HAD PLAYED A LEADING PART IN THE STRUGGLE FOR FREEDOM. YET INDIAN NATIONALISM WAS DOMINATED BY HINDUS AND HAD A HINUISED LOOK.(DISCOVERY OF INDIA.P.354)

خود گاندھی جی بھی قوم پرستی اور جذبۂ وطنیت کو دوسرے درجہ پر رکھتے تھے انکے نزدیک ان کا دھرم پہلے تھا اور بعد کو وطن وہ پہلے ہندو تھے اور بعد میں قوم پرست بلکہ ملک میں دلچسپی وہ اپنے دھرم کی وجہ سے ہی لیتے تھے۔

''ایک لحاظ سے میرا یہ کہنا صحیح ہے کہ میرا مذہب مجھے ملک سے زیادہ عزیز ہے کیونکہ میں پہلے ایک ہندو ہوں اور بعد میں قوم پرست۔اس وجہ سے میں کسی بھی قوم پرست سے کم تر نہیں ہوں۔اس سے میرا مطلب صرف یہ ہے کہ ملک کے بارے میں میری دلچسپی میرے مذہب کی دلچسپی سے الگ نہیں ہے۔'' (ینگ انڈیا،ص:۱۲۳،۱۹۲۲ء،بحوالہ انتخابات از گاندھی جی مسلم یونیورسٹی،پریس ۱۹۶۹ء،ص:۳۰)

مولانا آزاد کی ایک اور اہم خصوصیت کا ذکر یہاں بہت ضروری ہے کہ مولانا پان اسلام ازم پر بھی یقین رکھتے تھے۔خلافت کو بچانے کے لیے تمام دنیا کے مسلمان مولانا کی

نظر میں ایک قوم تھے لیکن جب یہی دلیل ہندوستان کے مسلمانوں کے سلسلے میں دی جاتی تو مولانا کو سخت غصہ آجاتا تھا۔اس میں بھی دراصل ایک مطلب پوشیدہ تھا ورنہ مولانا کا اصلی نظریہ وہی نیشنل ازن تھا جو مغرب میں پلا بڑھا۔پان اسلام ازم کے نظریہ کو مشتہر کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمان خلافت کے جلسوں میں زیادہ سے زیادہ شریک ہوں اور خلافت کو ہندوستان کی جنگ آزادی کے لیے استعمال کیا جائے۔مولانا کے جتنے بھی خطبے خلافت کے پلیٹ فارم سے ہیں ان سب میں مولانا نے یہی تاثر دیا کہ ''آپ کی تحریک خلافت آزادی کی تحریک ہے۔یہ ایک مقصد ہے جو فتح چاہتا ہے عمل چاہتا ہے۔'' (خطبات آزاد، ص:۵۸) خلافت کو بچانے میں مولانا کو بالکل دلچسپی نہ تھی بلکہ جب اتاترک نے خلافت ختم کردی اور خود صدر بن گئے تو مولانا نے ان کو مبارکباد کا پیغام بھیجا اور مسلمانوں پر زور ڈالا کہ وہ اتاترک کو ہی خلیفہ مان لیں۔(حوالہ تبرکات آزد، غلام رسول مہر، ص:۲۱۱) مولانا کا اس سلسلہ میں ایک مضمون بھی روزنامہ زمیندار لاہور میں اپریل ۱۹۲۴ء میں شائع ہوا۔

خلافت کے پلیٹ فارم سے مولانا اسلامی قومیت پر زور دیتے تھے اور اس سے زیادہ مباح کوئی چیز نہ تھی لیکن کانگریس اور جمعیۃ العلماء کے پلیٹ فارم سے اس سے زیادہ قابل نفرت کوئی چیز نہ تھی۔الفاظ کا جوش پان اسلام از کی حمایت میں ملاحظہ ہو۔انڈین نیشنل ازم کی حمایت بھی قرآنی دلیلوں سے ملاحظہ کی اب پان اسلام ازم بھی اسی قرآن سے ثابت کیا جارہا ہے:

> ''ملت اسلامیہ ایک جسم واحد ہے اور مسلمان خواہ کہیں ہوں اس کے اعضا و جوارح ہیں اگر ہاتھ کی انگلی میں کانٹا چبھے تو جب تک باقی اعضا کٹ کر الگ نہ ہوگئے ہوں ممکن نہیں کہ اس صدمے سے بے خبر رہیں اور یہ جو کچھ کہہ رہا ہوں محض اظہار مطلب کا زور بیان بھی نہیں ہے۔بلکہ عین ترجمہ ہے اس حدیث مشہور کا کہ جناب رسول کریم نے فرمایا (ترجمہ:مسلمانوں کی مثال باہمی مروت و مرحمت اور محبت و ہمدردی میں ایسی ہے جیسے ایک جسم واحد کی اگر اس کے ایک عضو میں شکایت پیدا ہوتی ہے تو سارا جسم اس تکلیف میں شریک ہوجاتا ہے)............اور فی الحقیقت یہ خصائص مسلم میں سے ایک



> اولین اور اشرف ترین خصوصیت ہے جس کی طرف قرآن نے اپنے جامع اور مانع الفاظ میں اشارہ کیا ہے۔(ترجمہ: کافروں کے لیے نہایت سخت مگر آپس میں نہایت رحیم اور ہمدرد) ان میں جس قدر سختی ہے باطل اور کفر کے لیے اور ان کی جس قدر محبت و الفت ہے حق و صدق و اسلام اور توحید کے لیے۔'' (خطبات آزاد، ص:۱۹)

نیشنل ازم اور پان اسلام ازم دونوں کو ایک ہی قرآن سے ثابت کررہے تھے۔کیا یہ مان لیا جائے کہ مولانا قرآن کا صحیح علم نہیں رکھتے تھے؟ اگر نہیں تو پھر جان بوجھ کر ایسا کررہے تھے؟ لارینس آف اریبیا اور لارینسن آف انڈیا میں فرق صرف عقیدے کا تھا ایک یہودی تھا اور دوسرا مسلمان۔(کیا واقعی؟)

# مسلم لیگ کا قیام اور تقسیم ہند

۱۸۹۸ء میں مارچ کی ستائیسویں تاریخ کو ہندوستانی مسلمانوں کے سب سے عظیم رہنما نے دنیا سے کوچ کیا۔سرسید کے انتقال کے ساتھ ساتھ ہی علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کا بھی خاتمہ ہوگیا۔حالانکہ یہ ایسوسی ایشن سرسید کی زندگی میں بھی زیادہ ترقی نہ کرسکی تھی جس کی کئی وجوہات تھیں۔اول یہ کہ ۱۸۹۳ء میں ہی اس کے قیام کے وقت سرسید کافی ضعیف ہو چکے تھے ان کی عمر اس وقت ۷۶ سال تھی۔کسی بھی اتنی زیادہ عمر کے ضعیف انسان سے بہت زیادہ بھاگ دوڑ اور کام کرنے کی توقع نہیں کی جاسکتی یہ ہی بہت تھا کہ سرسید نے مسلمانوں کو ایک راستہ دکھا دیا تھا جس پر چل کر وہ اپنا سیاسی وقار بحال کرسکتے تھے اور دوسرے فرقوں کی دست درازیوں سے محفوظ رہ سکتے تھے۔دوسری وجہ سرسید کی ذاتی پریشانیاں تھیں کہ ان کو کالج فنڈ میں غبن ہو جانے اور دیگر ذہنی الجھنوں نے بہت حد تک مایوس اور اداس کر دیا تھا۔ایک ضعیف انسان کے لیے اس طرح کے شدید صدمات برداشت کر جانا معجزہ سے کم نہیں ہوسکتا۔بہرحال ڈیفنس ایسوسی ایشن بہت زیادہ کامیاب نہ ہوسکی اور آخر کار سرسید کے انتقال کے ساتھ ساتھ اس کا خاتمہ بھی ہوگیا۔

۱۸۸۵ء میں قیام کانگریس کے فوراً بعد سے ہی مسلمانوں میں یہ احساس پیدا ہونا شروع ہوگیا تھا کہ مسلمانوں کو بھی کچھ کرنا چاہیے۔سرسید نے پہلے ہی کانگریس کے اس دعوے کو مسترد کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں بسنے والی قوموں کی نمائندگی کرتی ہے اس کے برخلاف سرسید نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کانگریس کے اس دعوے کے دھوکے میں آ کر اگر مسلمانوں نے اس کا ساتھ دیا تو ان کی حالت کانگریس کے زیر حکمرانی یہودیوں سے بھی بدتر ہو جائے گی۔سرسید کے اس فیصلہ کو پوری قوم نے سرآنکھوں پر رکھا تھا اور سوائے چند لوگوں کے پوری کی پوری مسلم قوم کانگریس کی سیاست سے الگ رہی یہاں یہ بات یاد رکھنے کے



قابل ہے کہ سرسید کا یہ نظریہ کہ ہندوستان میں بہت سی قومیں بستی ہیں کانگریس کے قیام سے بہت پہلے کا ہے اور کانگریس نے جب یہ دعویٰ کیا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے تو سرسید کو لامحالہ اس کی مخالفت کرنی ہی تھی۔

سرسید کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ پھر شدت سے ابھر کر آیا کہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں کیا طریقۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔گزٹ کا اجرا محسن الملک کی ادارت میں تقریباً ایک سال بند رہنے کے بعد پھر ہوگیا تھا۔گزٹ کے اس دور کے اکثر شمارے ان بحثوں سے بھرے پڑے ہیں کہ:

''مسلمانوں کو اپنے پولیٹیکل حقوق کی حفاظت کے لیے کیا طریقہ اختیار کرنا چاہیے؟''

جانشین سرسید، محسن الملک کالج کے سکریٹری بنائے جا چکے تھے اور گزٹ کے ایڈیٹر بھی انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

> ''یہ سوال کوئی نیا نہیں ہے؟ سرسید مرحوم کی زندگی میں اس وقت جب کہ ایک بڑی ہلچل ڈالنے والی تحریک سے مسلمان علیحدہ کر لیے گئے تھے اس سوال پر بہت غور کیا گیا ہے اور اس پر بڑی بحثیں ہو چکی ہیں۔سرسید مرحوم کی اگرچہ یہ رائے تھی کہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ضرورت اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی ہے اور پولیٹیکل بحثوں میں پڑنے سے اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا زیادہ مفید ہے مگر وہ اس سے غافل نہ تھے کہ مسلمان بحیثیت ایک قوم ہونے کے خاص حاجتیں رکھتے ہیں اور ان کی حاجتیں اکثر امور میں اس ملک کی دیگر قوموں سے مختلف اور بعض حالات میں متناقض ہیں اور بوجہ کمی تعلیم اور ناواقفیت انگریزی لٹریچر اور انگریزی اصول سیاست کے مسلمان اپنے حقوق اور مقاصد کی حفاظت کی کم اہلیت رکھتے ہیں اور اس لیے ان کے پولیٹیکل حقوق اور قومی مقاصد کی حفاظت کے لیے کوئی خاص طریقہ اختیار کرنا ضروری ہے......اور بالآخر ۳۰ر دسمبر ۱۸۹۳ء کو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے بعد یہ تجویز ہوا کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے ایک کمیٹی قائم کی جائے جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل ڈیفنس ایسوسی ایشن آف اپر انڈیا

ہو۔'' (گزٹ ۱۵/اگست ۱۹۰۱ء، ص: ۴۴۰)

یہ تھا سرسید کا سیاسی نظریہ اور اس کو بیان کر رہے ہیں ان کے سب سے قریبی مشیر کار دست راس جناب نواب محسن الملک۔ آزادی کے بعد آج تک سرسید کے ان خیالات سے ہندوستانی مسلمانوں کو بے خبر رکھا گیا۔ نہ جانے دانشوروں کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔ بعض بعض نے تو سرسید کی بالکل دوسری تصویر پیش کی ہے۔ سرسید کی اصلی تصویر یہ تھی کہ خود ان کے گھر پر ان کی صدارت میں مسلمانوں کی ایک میٹنگ ہوتی ہے جس میں علی گڑھ تحریک سے وابستہ تمام ہی حضرات شریک ہوتے ہیں اور وہی سوال پیش کیا جاتا ہے جس کا اوپر ذکر ہوا۔ اس جلسہ میں اس سوال کے حل کے لیے چار طریقے پیش کیے گئے تھے۔

''بالآخر چوتھا طریقہ مفید سمجھا گیا اور وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے سرگروہوں اور دانش منداور بارعب شخصیتوں کو انگلستان کی پبلک اور گورنمنٹ ہند کے روبرو اپنے مطالب کے ظاہر کرنے کی غرض سے ایک ایسوسی ایشن بالاتفاق قائم کرنی چاہیے اور اس کو عام ایجیٹیشن سے بالکل علیحدہ رہنا چاہیے اور اپنا استحقاق اپنی کارروائیوں کی عمدگی اور قابلیت پر قائم کرنا چاہیے۔'' (ایضاً)

گزٹ میں یہ بحث چل نکلی کہ آخر اب مسلمانوں کو کیا راہ عمل اختیار کرنی چاہیے؟ اس بحث سے ایک بات تو بالکل واضح ہوگئی کہ سرسید، محسن الملک اور وقار الملک وغیرہ کانگریس کی سیاست مسلمانوں کے لیے مفید نہیں سمجھتے تھے اور اس کے برخلاف اپنی فعال جماعت بنانا چاہتے تھے اور سرسید نے ایسا کیا بھی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن اور ڈیفنس ایسوسی ایشن سرسید کی اسی خواہش کا مظہر ہیں جس میں پہلی مخلوط جماعت تھی سرسید کے انتقال کے بعد یہ احساس اور زیادہ شدت پکڑ گیا کہ اب مسلمان کیا کریں۔ یہ بالکل ایسا ہی سوال ہے جیسے گھر کے کسی ذمہ دار بزرگ خاندان کا انتقال ہوجائے تو یہ سوال ایک دم کھڑا ہوجاتا ہے کہ اب کیا ہو؟ سرسید کی حیثیت مسلمانوں کے لیے خاندان کے معزز اور بااختیار بزرگ کی سی ہوگئی تھی ساری مخالفتیں دم توڑ چکی تھیں اور کفر کے فتوے لگانے والے تک سرسید کے حامی ہو چکے تھے اور کسی طرف سے اب کوئی مخالفت باقی نہ رہی تھی۔ بہرحال انتقال سرسید کے بعد یہ سوال مسلمانوں کے سامنے اٹھ کھڑا ہوا کہ اب کیا کریں اخبار پانیر اور گزٹ میں طویل



بحثیں اس مسئلہ پر چلیں۔ محسن الملک لکھتے ہیں:

''ہماری جماعت میں مرحوم سرسید کی طرح اب کوئی نہیں رہا جس پر گورنمنٹ اور ہماری حکومت بھروسہ کرے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ گورنمنٹ تک رسائی کا اعلیٰ ذریعہ جاتا رہا...... ایسی حالت میں جبکہ ہمارا جوابدہ لیڈر نہیں ہے ضرورت ہمیں مجبور کرتی ہے کہ اپنا درد پبلک مباحثہ میں متانت اور اجتماعی طور سے بیان کریں۔ بشرطیکہ ہماری خواہش ہو کہ ہم اپنی قومیت قائم رکھیں ...... یہ مناسب نہیں ہے کہ ابھی سے پیش گوئی کی جائے کہ مسلمان اب آئندہ کیا کریں گے۔''

''خاموش رہنے کی پالیسی پہلے بھی خطرناک سمجھی گئی تھی اور اسی مباحثہ میں جو اس وقت ہوا تھا (ڈیفنس ایسوسی ایشن بناتے وقت) صاف صاف بیان کر دیا گیا تھا کہ کچھ نہ کرنا بلکہ اپنی کوششوں کو صرف تعلیم کی طرف مصروف رکھنا ایک ایسی تجویز ہے کہ اس کا عمل درآمد ناممکن ہے۔'' (گزٹ ۱۵/اگست، ۱۹۰۱ء، ص: ۴۴۰)

بہت سے لوگ اس زمانے میں بھی یہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کو سیاسی معاملات میں دلچسپی نہیں لینی چاہیے اور وہ بھی سرسید کے بعض جگہ ظاہر کیے گئے خیالات کا حوالہ دیتے تھے حالانکہ خود انھوں نے دو دو جماعتیں بنائیں اور ان کو چلایا۔ جب ملک میں چاروں طرف سیاست کا بازار گرم ہو، اخبارات سیاسی مضامین سے بھرے ہوں، ملکی نظام چلانے کے لیے روز نئے قوانین بن رہے ہوں تو تعلیم یافتہ طبقہ کو کس طرح سیاست میں دلچسپی لینے سے باز رکھا جاسکتا تھا؟ لہٰذا مسلمانوں کو صحیح راہ سے بھٹکنے نہ دینے کے لیے ضروری تھا کہ کوئی جماعت بنائی جائے اور ان کو بنا رہنمائی کے نہ چھوڑا جائے۔ محسن الملک اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''جس حالت میں کہ مسلمانوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں اور ان کے مقاصد پر حملے کیے جاتے ہیں اور اخبار نویس برابر پولیٹیکل آرٹکل لکھ رہے ہیں تو کیوں کر ممکن ہے کہ مسلمان خاموش رہیں اور ان کی خاموشی سے نقصان نہ پہنچے۔'' (ایضاً)

محسن الملک کا خیال تھا کہ ایسی حالت میں جب مسلمانوں کے حقوق محفوظ نہیں ہیں مسلمانوں کے لیے سب سے بہتر تجویز یہ ہے کہ وہ محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کو دوبارہ زندہ کریں اور مسلمانوں کے ایسا نہ کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ کانگریس میں شریک ہو جائیں اور یہ عمل خودکشی کے مترادف ہوگا:

> ''ہمارے معزز دوست نواب فتح نواز جنگ بھی غالباً مسلمانوں کا کانگریس میں شریک ہونا پسند نہیں کرتے اور نہ پسند کریں گے اس لیے کہ مسلمانوں کا ایسا کرنا خودکشی سے کم نہ ہوگا اور اس کو کوئی بھی پسند نہ کرے گا کہ مسلمان اپنے پولیٹیکل حقوق سے چشم پوشی کریں اور ان کی حفاظت کا کچھ انتظام نہ کریں کہ اس سے بڑھ کر دوسری بات مسلمانوں کے لیے مضر نہ ہوگی۔ ابھی ہم دیکھتے ہیں کہ سکوت سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچا اور پہنچ رہا ہے ان کے حقوق تلف ہوئے اور تلف ہو رہے ہیں۔ خیر خواہی کے پردے میں ان کے قومی اغراض پر حملے کیے گئے ہیں اور کئے جا رہے ہیں ان کے حقوق اور اغراض سے چشم پوشی کی گئی ہے اور کی جا رہی ہے اور اگر یہی حالت چند روز اور قائم رہی تو مسلمانوں کی حالت اس درجہ پر پہنچ جائے گی کہ جس کا علاج بھی مشکل ہوگا۔ مگر اس کا علاج یہ نہیں ہے کہ ایک عام ایجیٹیشن میں شریک ہوں اور آخر کو ہولناک مصیبتوں میں گرفتار ہو جاویں ہمارے پولیٹیکل مقاصد کی حفاظت کے لیے بظاہر کوئی تجویز اس سے بہتر نہیں ہو سکتی جو ۱۸۹۳ء میں کی گئی تھی یعنی محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کرنا۔
>
> جن مسلمانوں کو اپنی قوم کی پولیٹیکل حفاظت کا خیال ہے ان کے لیے مناسب ہے کہ وہ اپنے آپ کو عام ایجیٹیشن سے علیحدہ رکھیں اور اس ایسوسی ایشن کو مستحکم بنیاد پر قائم کریں اور اب تک یہ تجویز جو عمل میں نہیں لائی گئی ہے اس پر بھی کارروائی شروع کریں جہاں تک ہم سمجھتے ہیں یہی تجویز مسلمانوں کے لیے مفید ہے اور اس تجویز پر عمل کرنے سے وہ بغیر اس کے کہ کسی خطرے میں پڑیں اپنے حقوق کی حفاظت کر سکتے ہیں...... چونکہ اب سرسید زندہ نہیں ہیں



> اور نہ کوئی مثل ان کے قوم کا لیڈر اور گورنمنٹ کا معتمد علیہ ہے...... اس لیے ایسوسی ایشن کو جس میں ایسے معزز اور سربرآوردہ مسلمان شریک ہوں جو گورنمنٹ میں بھی عزت رکھتے ہوں اور پبلک میں بھی جن کی وقعت ہو مشترکہ وہ کام کرنا چاہیے جو سرسید منفرداً کرتے تھے۔'' (ایضاً)

یعنی سرسید کی ذات مسلمانوں کے لیے سیاسی انجمن کی برابر حیثیت رکھتی تھی کہ جو کام وہ اکیلے کرتے تھے ایک جماعت بنا کر اسے کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ شروع سے ہی خاص مسلمانوں کی جماعت کی ضرورت محسوس کی گئی کہ سرسید کی مشترکہ جماعت بنانے کی کوشش جو پیٹریاٹک ایسوی ایشن بنا کر کی گئی تھی اس کی ناکامی نے اس سوال کو ختم کر دیا تھا آیا کہ مشترکہ سیاسی جماعت چاہے وہ مسلمانوں نے ہی بنائی ہو کامیاب ہو سکتی ہے؟ جب سرسید جیسے عظیم المرتبت اور صلح کل انسان کو مشترکہ جماعت میں ناکامی ہو سکتی ہے تو پھر کسی اور کی کامیابی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

## وقار الملک کی رائے

محسن الملک کی مندرجہ بالا تحریر کے سلسلہ میں اخباروں میں بہت سے مضامین اور خطوط شائع ہوئے اور محسن الملک کی اس تجویز کو کہ مسلمانوں کو پھر سے ڈیفنس ایسوسی ایشن قائم کرنی چاہیے عام طور سے پسند کیا گیا۔ اس ایسوسی ایشن کی ناکامی کی وجوہات پر بھی فرداً فرداً سب ہی قابل ذکر مسلمانوں نے روشنی ڈالی اور سب اسی بات پر متفق تھے کہ سرسید کی ضعیف العمری، کالج فنڈ میں غبن اور ذہنی پریشانیوں کے سبب سرسید اس ایسوسی ایشن کو زیادہ آگے نہ بڑھا سکے۔ دوسری وجہ یہ بتائی گئی کہ سیاسی انجمنوں کے نتائج ایک یا چند سالوں میں سامنے نہیں آتے لیکن سرسید کا یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے سیاسی راہ عمل متعین کرنے کا کام بھی انھوں نے ہی کیا۔ ڈیفنس ایسوسی ایشن مسلمانوں کے لیے سیاسی راہ نما بن گئی اور سرسید کے انتقال کے بعد مسلمانوں کے سیاسی مسائل اور ان کے مطالبات نہ مانے جانے کا جب مسئلہ آیا تو دانشوران قوم کی رائے ڈیفنس ایسوسی ایشن کے دوبارہ قایم اور جاری کرنے پر قائم ہوگئی۔ وقار الملک ڈیفنس ایسوسی ایشن کی ناکامی کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''کامیابی اور ناکامیابی کسی تجویز کی اس پر منحصر ہے کہ وہ تجویز اچھی طرح جاری کی جائے اور اس کے جاری کرنے کے لیے جو ضروری انتظام ہے وہ عمل میں لایا جائے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کہ اس تجویز پر زیادہ کارروائی نہیں ہو سکی۔ اس کا سبب یہ نہ تھا کہ وہ تجویز غیر مفید سمجھی گئی تھی بلکہ اس کا اصل سبب یہ تھا کہ مرحوم سرسید کو کالج کے متعلق ایسے افکار پیش آئے اور روحانی مصائب کا ان پر اتنا ہجوم ہوا کہ وہ اس بڑے کام کی تکمیل و تعمیل سے قاصر رہے...... اور بوجہ ظاہر ہونے غبن کے جو شیام بہاری لال نے کیا تھا اس تجویز کے اصلی مجوز کتنے پریشان اور اس غبن کی تلافی میں کس درجہ مصروف تھے۔ علاوہ بریں یہ عظیم الشان کام ایسا نہ تھا کہ ایک یا دو سال میں اس کے عملی نتائج ظاہر ہوتے اور جس پر کامیابی یا ناکامیابی کا فیصلہ کیا جاتا۔ یہ ایک بہت بڑا قومی اور نہایت اہم کام تھا اور قوم کے ذی رتبہ اور بارسوخ اور تعلیم یافتہ مسلمانوں کی توجہ کا محتاج تھا اور قوم کی حالت نواب صاحب کو معلوم ہے...... تمام باتوں کا دارومدار صرف سرسید ہی ذات پر تھا اور وہ اپنی زندگی کے آخری سالوں میں افکار اور مصائب کے ہجوم سے پریشان رہتے تھے اور انہیں کا دل و دماغ تھا کہ اس پر بھی وہ کالج کا کام کیے جاتے تھے بہر حال جہاں تک ہمیں معلوم ہے اس مفید تجویز کے چلانے پر زیادہ کوشش نہیں ہوئی۔''
(گزٹ ۲۲ رگست ۱۹۰۱ء، ص: ۴۵۷)

محسن الملک نے ڈیفنس ایسوسی ایشن کی میٹنگ کی روداد دوبارہ سے ۱۵ راگست ۱۹۰۱ء کے شمارے میں شایع کی تا کہ مسلمانوں کو ایک بار پھر سے اس مفید تجویز کو پڑھنے کا موقع ملے اور اس کی روشنی میں مسلمان اپنی سیاسی راہ عمل متعین کر سکیں۔ اس وقت بھی بہت سے مسلمانوں میں یہ غلط فہمی پائی جاتی تھی کہ سرسید صرف تعلیم کو ہی مسلمانوں کے لیے ضروری سمجھتے تھے لیکن انھوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ ملک میں عام سیاسی ماحول بنتا جا رہا ہے لہٰذا تعلیم یافتہ طبقہ کو ملکی معاملات میں رائے دینے سے کسی طرح نہیں روکا جا سکتا اس لیے اس طبقہ کو



بغیر کسی راہنمائی کے چھوڑنا کانگریس اور دوسری مضرت رساں سیاست میں شمولیت کی کھلی آزادی دینا تھا کہ جہاں چاہیں چلے جائیں یہ عظیم الشان کارنامہ بھی سرسید نے ہی انجام دیا کہ مسلمانوں کے تعلیم یافتہ طبقہ کو سیاست کا مفید سبق پڑھایا کہ معتدل سیاسی سرگرمی بہت زیادہ فائدہ مند عمل ہے اور ناگزیر بھی۔ وقار الملک لکھتے ہیں:

''۱۵ راگست کے پرچۂ گزٹ میں آپ نے ایک رائے اور ۱۸۹۳ء کی روداد محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن کے متعلق مشتہر فرمائی ہے جس کا ذیل فقرہ آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ جس حالت میں مسلمانوں کے حقوق تلف ہو رہے ہیں اور ان کے مقاصد پر حملے کیے جاتے ہیں اور اخبار نویس برابر آرٹیکل لکھ رہے ہیں تو کیوں کر ممکن ہے کہ مسلمان خاموش رہیں اور ان کی خاموشی سے نقصان نہ پہنچے اور کچھ نہ کرنا اور اپنی کوششوں کو صرف تعلیم کی جانب مصروف رکھنا ایک ایسی تجویز ہے کہ اس کا عمل درآمد ناممکن ہے۔'' (گزٹ ۲۲ راگست ۱۹۰۱ء، ص: ۴۵۸)

علی گڑھ کی یہ روایت تھی۔ آج کوئی بھی اس روایت کا ذکر نہیں کرتا۔ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق تلف کیے جانے کا ذکر کرنا ایسا ہے جیسے رات کو رات کہہ دینا اور دن کو دن۔ مسلمانوں کے سارے حقوق بحق اکثریت ضبط کر لیے گئے اور تمام دانشوران قوم خاموش تماشائی بنے رہے۔ خاموش تماشائی ہی نہیں بلکہ اس طبقہ نے مسلمانوں کو غلط راہ پر ڈالنے کا کام بڑی جانفشانی سے ادا کیا اور ادا کر رہا ہے۔ قوم کو غیر مطلع رکھنے اور ان تک غلط تاریخ پہنچانے کا کام بہت بڑے پیمانے پر کیا گیا اور کیا جا رہا ہے۔ علی گڑھ خاص نشانہ ہے اس پروپیگنڈے کا کہ سرسید سیاست کو بری چیز سمجھتے تھے لیکن جب حکمراں جماعت یا کسی مشترکہ جماعت کے لیڈران علی گڑھ آتے ہیں تو یہی طبقہ اور دانشور جو سیاست کو مکروہ بتاتے نہیں تھکتے ان کی پیشوائی کرنے میں ایک دوسرے سے بازی لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ حکمرانوں کی سیاست آج بھی علی گڑھ میں مستحسن فعل ہے لیکن قوم کی سیاست قابل مذمت:

''یہاں میں اس قدر اور بھی لکھ دینا مناسب سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کا

ہندوؤں کی نیشنل کانگریس میں شریک ہونا میں خودکشی میں داخل سمجھتا ہوں......مگر جو تحریک مسلمانوں میں اپنے حقوق کی حفاظت کی غرض سے گزشتہ سال سے از سرنو شروع ہوئی ہے اس پر اب ذی فہم اشخاص ہر جگہ غور کر رہے ہیں اور امید ہے کہ کسی عام جلسہ میں کوئی نہ کوئی طریقہ عنقریب اختیار کیا جائے گا جو سب سے زیادہ معتدل اور عام فہم ہوگا اور جن دوسری قوموں سے ہم کو پشت ہا پشت سے چولی دامن کا ساتھ رہا ہے ان کے ساتھ بھی اس تجویز سے کوئی مخالفت قائم نہ ہوگی۔'' (ایضاً)

بہرحال یہ تحریک بھی علی گڑھ سے شروع ہوئی کہ مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنائی جائے۔کوئی مشترکہ سیاسی جماعت بنانے کا تصور سرسید کی پیٹریاٹک ایسوسی ایشن کی ناکامی سے ہی ختم ہو گیا تھا۔دراصل محمڈن ڈیفنس ایسوسی ایشن اسی ناکامی کے سبب وجود میں آئی جو سرسید کو مہاراجہ بنارس،نولکشور اور دسرے ہندو ممبران ایسوسی ایشن کے ساتھ چھوڑ جانے سے درپیش ہوئی۔اخبار انڈین مرر نے اس سانحہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا تھا:

''سرسید احمد نے (کانگریس کا مقابلہ کرنے کے لیے) ہندوؤں کا تعاون حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اس دغا کے بعد (جو شیو پرشاد وغیرہ نے ان کے ساتھ کی ہے) آئندہ کسی اور نے مسلمانوں کے علاوہ ان کے ساتھ تعاون کرنے کی پیش کش کی ہو اور اسے قبول کرنے میں انہیں تامل ہوا ہو تو ہمیں حیرت نہ ہوگی۔'' (انڈین مرر، ۳۰ر نومبر ۱۸۸۸ء، بحوالہ عتیق صدیقی، سرسید احمد خاں ایک سیاسی مطالعہ، ص:۲۹۱)

## صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی رائے

اس مسئلہ پر کہ ہندوستانی مسلمان اب سیاست میں کیا رویہ اختیار کریں؟ محسن الملک اور وقار الملک کی چلائی ہوئی بحث پر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے ایک جلسہ میں جو اسی مسئلہ پر غور کرنے کے لیے منعقد کیا گیا تھا اپنی رائے کا اس طرح اظہار کیا:



''میری رائے تو یہ ہے کہ بغیر اپنی پولیٹکل حالت کو سمجھے ہم مہذب دنیا میں رہنے کے قابل نہیں ہو سکتے۔جس طرح پر روحانی زندگی کی بہبودی کے لیے ہم کو مذہبی ہدایت کی ضرورت ہے اسی طرح مہذب سوسائٹی میں عزت وثروت کے ساتھ رہنے کے لیے پولیٹیکل ہدایت لازمی ہے۔اگر مہذب سوسائٹی میں ہم معزز اور کارآمد رکن ہونا چاہتے ہیں تو اپنی موجودہ پولیٹیکل حالت کی نسبت صحیح رائے قائم کرنا ازبس ضروری ہے......اے صاحبو! پولیٹکس ہے کیا چیز؟ گورنمنٹ کے اصول طرز گورنمنٹ اور مصالح کو سمجھنا پولیٹکس ہے۔ہمارے ملکی اور قومی جو حقوق اور ضرورتیں ہیں ان کو گورنمنٹ کے روبرو صفائی اور بلا کسی خوف کے ظاہر کرنا پولیٹکس ہے۔القصہ جب تک ہم امن سے رہنے کے ترقی کرنے کے حصول کی خواہش قطعی ترک نہ کر دیں اس وقت تک ہم کو پولیٹکس سے نجات نہیں مل سکتی۔'' (گزٹ ۵ر ستمبر ۱۹۰۳ء، ص:۶)

اس اقتباس کا آخری جملہ سنہری حروف میں لکھے جانے کے قابل ہے۔آزادی کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں نے سیاست کو برتنا چھوڑ دیا اور اپنے حقوق و مطالبات کو حکومت میں صفائی اور بلا خوف پیش کرنا بند کر دیا لہٰذا اس کا نتیجہ بھی ہمارے سامنے ہے کہ کسی قسم کی ترقی اور باعزت زندگی مسلمانوں کے حصہ میں نہ آئی۔آئے دن ایسے واقعات پیش آتے رہتے ہیں کہ کوئی بھی زندہ قوم ان کو برداشت نہیں کر سکتی مگر مسلمان ساری زیادتیوں اور پریشانیوں کو برداشت کر رہا ہے درحقیقت انھوں نے سیاست کے سنہرے اصول کو ترک کر دیا۔آزادی کے بعد شمالی ہند کے مسلمانوں نے مولانا آزاد کے مشورے پر عمل کرنا شروع کر دیا جو انھوں نے لکھنؤ کنونشن میں ان کو دیا تھا کہ اب کسی طرح کی مسلم سیاست ہندوستان میں نہیں ہونی چاہیے اور ساری خرابیوں کی جڑ یہی سیاست ہے۔خاص طور سے اتر پردیش کا مسلمان مولانا کے اس مشورے پر بے چوں چرا عمل کرتا آ رہا ہے۔ کانگریس سے خفا ہو کر دوسری جماعتوں میں مسلمان شریک ہو جاتے ہیں مگر ان کو اپنی کوئی سیاسی طاقت بنانے کا خیال تک نہیں آتا۔ چند لوگوں کو آتا بھی ہے تو وہ اپنی ہی زندگی خراب

کر لیتے ہیں کیونکہ خود مسلمان ایسے کسی کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ انہیں تو صرف دوسروں کی قیادت پسند ہے اپنوں کی نہیں۔ دوسروں کی جماعتیں پسند ہیں اپنی نہیں۔

''حضرات میرے دوست شیخ عبداللہ صاحب نے اپنی تقریر میں نہایت جوش اور فصاحت کے ساتھ فرمایا ہے کہ ہم کو گورنمنٹ سے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ایک جماعت کی ضرورت ہے۔ میں ان سے بالکل متفق ہوں اور میں بھی اس ضرورت کو اس مقصد کے لیے تسلیم کرتا ہوں۔ (ایضاً)

آفتاب احمد خاں صاحب نے بھی اپنی تقریر میں اس بات کو دہرایا کہ سرسید کے انتقال کر جانے سے ہم کو اور بھی زیادہ کسی جماعت کی ضرورت ہے کہ وہ اپنے آپ میں خود ایک جماعت کی برابر تھے اور مسلمانوں کے حقوق گورنمنٹ میں پیش کرتے رہتے تھے۔

''آپ کو معلوم ہے کہ جب تک سرسید مرحوم زندہ رہے وہ ہماری گورنمنٹ کے درمیان ایک وسیلہ تھے جس قدر ہماری قومی ضرورتیں تھیں ہمیشہ نہایت آزادی اور صفائی کے ساتھ گورنمنٹ کے روبرو پیش کرتے رہے...... لیکن وہ پیرِ اعظم ہم میں سے اٹھ گیا اسی وقت سے اس کی جگہ خالی ہے اور کوئی ایسا شخص نہیں ہے جو اس کے کام کو سنبھالے اور حقیقت میں اب وہ کام ایک یا چند شخصوں کے کرنے کا ہے بھی نہیں۔ ہم کو ضرورت ہے کہ کوئی ایسی جماعت ہو جس کے ذریعہ سے کل قوم کی طرف سے قومی ضرورتیں اور قومی رائے گورنمنٹ کے حضور میں پیش ہو سکیں۔''

اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے سرسید کے بعد وقار الملک و محسن الملک نے کوششیں تیز کر دیں۔ مختلف اضلاع کے دورے کرنا مختلف اشخاص اور جماعتوں کے سرگروہوں کو اس طرف متوجہ کرنا یہ دراصل انہیں لوگوں کی محنت تھی کہ مسلمانوں میں اپنی سیاسی تنظیم بنانے کا احساس پیدا ہوا۔ محسن الملک رقم طراز ہیں:

''ہم سب کو نواب وقار الملک بہادر کا دل سے ممنون ہونا چاہیے کہ



انھوں نے اس موسم میں اس قدر تکلیف گوارا فرمائی اور متعدد اضلاع میں بذاتِ خود جا کر ممبروں کے انتخاب کی کارروائی کرائی۔ قریب دس بارہ اضلاع میں یہ کارروائی کامیابی کے ساتھ ہو چکی ہے۔'' (ایضاً)

مسلمانوں کی سیاسی جماعت بنانے کی تیاریاں زور وشور سے جاری تھیں وقار الملک ان تمام کارروائیوں کے روحِ رواں تھے اور مختلف اضلاع میں دورے کر رہے تھے کہ ہر ضلع سے پانچ یا زیادہ آدمی لکھنؤ میں آ کر جمع ہوں اور مسلمانوں کے نمائندے جلسے میں یہ اہم فیصلہ لیا جائے کہ مسلم تنظیم کی کیا شکل ہو۔ محسن الملک اس کی اطلاع دیتے ہوئے گزٹ میں لکھتے ہیں:

''اکثر ناظرین کو معلوم ہوگا کہ جو کام اس وقت نواب صاحب ممدوح اس قدر محنت اور توجہ سے کر رہے ہیں وہ کیا ہے۔ تاہم اس قدر صراحت کرنا مناسب ہوگا کہ اس وقت صرف یہ کام کیا جا رہا ہے کہ جو جلسہ واسطے طے کرنے امورِ ضروری کے اور واسطے قرار دینے طرزِ عمل کے آئندہ لکھنؤ میں ہونے والا ہے اس میں شرکت کے واسطے ہر ضلع سے کم سے کم پانچ اور زیادہ سے زیادہ بارہ ممبر عام جلسے کی رائے سے تجویز کیے جائیں۔ جب ہر ضلع سے قائم مقام تجویز ہو جائیں تو کسی تاریخ آئندہ پر یہ کل حضرات ایک جلسہ میں بمقام لکھنؤ جمع ہوں گے اور یہ وہی وہ جلسہ ہوگا جو فیصلہ کر دے گا کہ ہم مسلمانانِ ہند کو سیاسی معاملات میں کیا روش اختیار کرنی چاہیے۔''

(گزٹ ۲۷ر جون ۱۹۰۳ء، ص:۹)

## شملہ ڈیپوٹیشن

۱۵ر اور ۱۶ر ستمبر ۱۹۰۶ء کو مسلمانوں کے نمائندوں کا ایک جلسہ لکھنؤ میں منعقد ہوا۔ اس میں یہ تجویز پایا کہ مسلمانوں کا ایک ڈیپوٹیشن سر آغا خاں کی سرگردگی میں وائسرائے لارڈ منٹو سے ملاقات کرے اور مسلمانانِ ہند کی جانب سے ایک عرض داشت وائسرائے کو پیش کرے۔ نواب محسن الملک (جو اس وقت محمڈن کالج کے سکریٹری تھے) کی خط و کتابت وائسرائے کے سکریٹری سے ان سے ملاقات کا وقت طے کرنے کے لے ہوتی رہی اور آخر

کار یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء کو سر آغا خاں کی قیادت میں مسلمانان ہند کے وفد نے لارڈ منٹو کے سامنے مسلمانوں کے مندرجہ ذیل مطالبات رکھے۔

(۱) نیابی نظامات کا طریقۂ انتخاب ایسا ہونا چاہیے جس میں مسلمانوں کے لیے یہ حق ہو کہ وہ خاص حلقوں سے اپنے نمائندے منتخب کریں۔

(۲) ان کی تاریخی اہمیت اور سیاسی حیثیت کا لحاظ کر کے مسلمانوں کو اس سے زیادہ نشستیں دی جائیں جتنی کہ ان کی آبادی کے تناسب سے ان کو مل سکتی ہیں۔

(۳) ایک معینہ تناسب کے مطابق گزیٹیڈ اور نان گزیٹیڈ ملازمتوں پر مسلمانوں کا تقرر کیا جائے۔ ہائی کورٹ کے ججوں، چیف کورٹ کے ججوں اور ایگزیکٹیو کونسل کے ممبروں کی حیثیت سے ان کا تقرر ہونا چاہیے۔

(۴) یونیورسٹیوں کے سنڈیکٹوں اور سنیٹوں میں مسلمانوں کے لیے چند نشستیں محفوظ کی جائیں۔

(۵) مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لیے امداد دی جائے۔ برصغیر کی نیابی حکومت کے نظام کی حدود کے اندر مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے سیاسی معاشرتی اور ثقافتی تشخص کی بقا کے لیے جو بہتر تدبیر مسلمان لیڈر پیش کر سکتے ہیں وہ انتخاب جداگانہ ہے جو ان تجاویز میں درج ہے۔

یہ وہ مطالبات تھے جو ملک میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری کی نشاندہی کر رہے تھے اور ملکی نظام میں مسلمانوں کے حق میں تبدیلی کی خواہش کے آئینہ دار تھے۔ حکومت آسانی سے ان مطالبات کو ماننے والی نہیں تھی لہٰذا ایک مستقل سیاسی جماعت بنانے کی تجویز ہوئی اور ۳۰؍ دسمبر ۱۹۰۶ء کو ڈھاکہ میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس کے بعد مسلمانان ہند نے نواب وقار الملک کی صدارت میں آل انڈیا مسلم لیگ کی بنیاد رکھی۔ وقار الملک نے اپنے خطبۂ صدارت میں کانگریس کے قیام اور اس کے ذریعہ ہندوؤں کی طاقت میں اضافہ ہونے کا ذکر کیا اور بتایا کہ سرسید نے کس طرح اس خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو تیار کیا تھا۔

"جس مقصد کے لیے آج ہم جمع ہوئے ہیں وہ نیا نہیں ہے۔ یہ اس



روز پیدا ہو گیا تھا جب انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ یہاں تک کہ سرسید احمد خاں مرحوم جن کی مدبرانہ اور دور اندیش پالیسی کے ہم ہمیشہ مرہون منت رہیں گے کانگریس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے ایسے متاثر ہوئے کہ انھوں نے مسلمانوں کو یہ سمجھانے کے لیے دلیری سے کوشش کی کہ ان کی فلاح اور سلامتی اس میں ہے کہ کانگریس میں شرکت سے اجتناب کریں۔ یہ نصیحت ایسی صائب تھی کہ آج اگرچہ وہ ہم میں نہیں تاہم مسلمان مضبوطی سے اسی پر قائم ہیں اور جتنا وقت گزرتا جارہا ہے اس کی اہمیت واضح ہوتی جارہی ہے کہ مسلمانوں کو اپنے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے انتہائی کوشش کرنی چاہیے......کانگریس کا یہ بڑھتا ہوا داخلی اور خارجی اثر دیکھ کر جو بنگال کی تقسیم کا نتیجہ ہے اور حکومت کا یہ ارادہ معلوم کر کے کہ وہ مجلس واضعان قانون میں توسیع کرنا چاہتی ہے وفد کی صورت میں مسلمان وائسرائے کے سامنے گئے اور انھوں نے اپنی ضروریات اور ناانصافیاں ان کے سامنے پیش کیں جو بحیثیت قوم ان کو برداشت کرنی پڑی تھیں......مسلمان لیڈروں نے اس پر غور کرنے کے بعد کہ مسلمانوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کے لیے کیا مستقل تدابیر اختیار کی جائیں یہ طے کیا کہ آخر دسمبر میں مختلف صوبوں کے نمائندے ڈھاکے میں مجتمع ہوں اور اس مسئلہ کا فیصلہ کریں۔

مسلمان ہندوستان میں اپنی دوسری ہمسایہ قوموں سے ایک خمس کے قریب ہیں اور اس لیے یہ ایک صاف مضمون ہے کہ اگر کسی وقت برٹش حکومت ہوگی جو تعداد میں ہم سے چار حصے زیادہ ہے اور اب صاحبو ہر ایک شخص کو چاہیے کہ اپنے دل میں اس بات پر غور کرے کہ اس وقت ہماری حالت یہ ہوگی کہ ہمارا مال ہماری آبرو ہمارا مذہب سب خطرے میں ہوگا۔ آج جب کہ برٹش کی زبردست سلطنت اپنی رعایا کی محافظ ہے جس قسم کی مشکلات بسا اوقات ہم کو اپنے دوستوں سے پیش آتی رہی ہیں

> ان کے نظائر کم وبیش ہر صوبے میں موجود ہیں تو وائے اس وقت پر جب ہم کو ان لوگوں کا محکوم ہو کر رہنا پڑے جو اورنگ زیب کا بدلہ صدہا برس بعد آج ہم سے لینا چاہتے ہیں......''

(بحوالہ محمد امین زبیری، تذکرہ وقار، ص:۱۷۱)

نواب سلیم اللہ رئیس ڈھاکہ کی تجویز پر آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کا رزولوشن پاس ہوا۔ محسن الملک اور وقار الملک اس کے دو جوائنٹ سکریٹری بنائے گئے اور اس وقت یہی دو عہدے رکھے گئے تھے اور ایک کمیٹی بنادی گئی جس کو ان دونوں حضرات کی سربراہی میں دستور مسلم لیگ وضع کرنے کا کام سونپا گیا۔

## قیام پاکستان

۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں تقسیم بنگال کی تنسیخ حکومت نے کانگریس کے دباؤ میں آ کر کردی۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ میں معاہدہ ہوا جس کی رو سے مسلمانوں کی نمائندگی کا حق مسلم لیگ کو دیا گیا اور میثاق لکھنؤ کے بعد کانگریس و لیگ قریب آ گئیں۔

۱۹۱۲ء کے بعد کے پندرہ سال ہندوستانی مسلمانوں کی سیاست کے لیے بہت نقصان دہ ثابت ہوئے۔ اس زمانہ میں مسلمان ایک غیر ضروری اور مضرت رساں تحریک میں شامل ہوگئے اور وہ تحریک تھی تحریک خلافت۔ اس تحریک کے سبب مسلمانوں میں انگریزوں کے تئیں ان کی نفرت اپنے عروج کو پہنچی اور مسلمان کسی دوسرے تعمیری کام کی طرف متوجہ نہ ہو سکے۔ خلافت تحریک کے قائدین کو اپنی کوششوں پر پورا بھروسہ تھا کہ وہ سلطان عبدالحمید کی خلافت بچالیں گے حالانکہ یہ سوچنے کی بات تھی کہ ہندوستانی مسلمان جو خود اپنی حکومتیں انگریزوں کو گنوا بیٹھے اتنے مضبوط کہاں سے ہوگئے کہ ہزاروں میل دور کسی ملک کے اندرونی معاملات پر اثر انداز ہو سکیں نتیجتاً خود مسلمانوں نے ہی سلطان عبدالحمید کو معزول کر کے ترکی میں جمہوری حکومت قائم کردی اور کمال اتاترک کو اس کا صدر بنادیا۔ یہ حادثہ خلافت تحریک کے لیے اور ہندوستان کے تمام مسلمانوں کے لیے انتہائی رنج اور حیرت کا باعث ہوا کہ اب کس بات کی کوشش کی جائے؟ اس تحریک کے اس دردناک انجام نے مسلمانوں کا اعتماد مسلم لیڈر شپ پر سے اٹھادیا اور ایک زمانے تک مسلمان اسی



کشمکش میں مبتلا رہا کہ اس کو کانگریس کے علاوہ اپنی قیادت کی دور اندیشی پر بھی یقین نہیں رہ گیا تھا۔ یہ حالت چلتی رہی اور کانگریس پے در پے غلطیاں کرتی رہی جس میں سب سے زیادہ واضح نہرو رپورٹ تھی جس میں مسلمانوں کے ادنیٰ مطالبات تک کو ماننے سے انکار کردیا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کی مخلوط وزارتوں کا تجربہ بھی مسلمانوں کے لیے اچھا نہیں رہا تھا۔ اس کے علاوہ انگریز ہندوستان کو چھوڑنے کے لیے ذہنی طور سے تیار ہو رہے تھے۔ ان سب وجوہات نے مل کر پھر سے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنادیا اور جناح صاحب کی واپسی نے مسلم لیگ کے شریانوں میں پھر سے تیز گرم لہو دوڑا دیا۔ اس دوران مسلم لیگ اور کانگریس دونوں ملک کے مستقبل پر نظر رکھے ہوئے تھیں۔ کانگریس بلا شرکت مسلم لیگ پورے ملک پر اپنی واضح اکثریت کی بنا پر حکومت کرنے کی خواہش مند تھی۔ مسلم لیگ اس کے برخلاف آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ سیاہ اور سفید میں چاہتی تھی۔ کانگریس ایسی کسی بھی تجویز کو ماننے سے اس دعوے کی بنیاد پر انکار کر رہی تھی کہ وہ ہندو اور مسلمانوں دونوں کی نمائندہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم تک یہ بات تقریباً طے ہو چکی تھی کہ انگریزوں کو بہت جلد ہندوستان کو آزاد کردینا ہے۔ کانگریس نے مسلم لیگ کے اس دعوے کو جھٹلانے کے لیے کہ وہ تمام مسلمانوں کی نمائندگی کرتی ہے ایسے وقت میں مولانا آزاد کو کانگریس کا صدر بنائے رکھا تھا۔ ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کو حل کرنے کے لیے کئی بار زوردار کوششیں ہوئیں اور ہر بار ناکامی کا شکار ہوگئیں۔ اس بیچ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نے لاہور میں ایک رزولوشن پاس کردیا جو پاکستان رزولوشن کے نام سے مشہور ہوا۔

## قراردادِ پاکستان

۲۲ رمارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ کے عام اجلاس میں مندرجہ ذیل قرارداد بہ اتفاق رائے منظور ہوئی۔

> ''قرار پایا کہ غور و خوض کے بعد آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ بغیر اس کے اس ملک میں قابل عمل اور مسلمانوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوگا کہ وہ مندرجہ ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی ہو! یعنی یہ کہ حد بندی کر کے اور ملکی تقسیم کے اعتبار سے حسب ضرورت

ردوبدل کرکے متصل واحدوں کو ایسے منطقے بنادیا جائے کہ وہ علاقے جن میں مسلمان بہ اعتبار تعداد اکثریت ہیں جیسے ہندوستان کے شمال ومغربی اور مشرقی منطقوں میں اس طرح یک جا ہوجائیں کہ وہ ایسی خودمختار ریاستیں بنیں جن کے واحدے اندرونی طور پر بااختیار وخودمختار ہوں۔

یہ کہ ان واحدوں میں اور ان علاقوں میں اقلیتوں کے لیے ان کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق ومفاد کے تحفظ کے لیے ان کے مشورے سے بقدر ضرورت موثر اور واجب التعمیل تحفظات معین طور پر دستور کے اندر مہیا کیے جائیں اور ہندوستان کے دوسرے حصوں میں جہاں مسلمان اقلت ہیں حسب ضرورت موثر اور واجب التعمیل تحفظات ان کے اور دوسری اقلیتوں کے مذہبی، ثقافتی، اقتصادی، سیاسی، انتظامی اور دوسرے حقوق ومفاد کی حفاظت کے لیے ان کے مشورے سے معین طور پر دستور کے اندر رکھے جائیں۔''

(سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، ص:۲۵۵)

اس قرارداد میں دو باتیں خاص طور سے آج کے مسلمانوں کے لیے قابل توجہ ہیں پہلی یہ کہ پاکستان کا مطالبہ تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے نہیں کیا گیا تھا۔ صرف مسلم اکثریتی علاقوں کو پاکستان کا نام دیا گیا تھا بلکہ پاکستان کا لفظ اس قرارداد میں کہیں استعمال نہیں کیا گیا صرف مسلم اکثریتی علاقوں کو خودمختار اور آزاد ریاستوں میں تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ لہٰذا آزادی کے بعد کے مسلمانوں سے قوم پرور قائدین کا یہ کہنا کہ تم نے پاکستان لے لیا اب تمہارا کچھ نہیں بالکل غلط ہے پاکستان مسلم اقلیتوں کے لیے مانگا ہی نہیں گیا تھا بلکہ جن علاقوں میں مسلمان اقلیت ہیں ان کے حقوق کی حفاظت کی گارنٹی مانگی گئی تھی اور اسی طرح ہندو اقلیت جو مسلم علاقوں میں رہتی تھی اس کے لیے بھی اسی طرح کی قانونی گارنٹی مانگی گئی۔ ہندو اکثریت کے علاقے میں رہنے والی مسلم اور دیگر اقلیتوں کے لیے قانونی تحفظات دینے کا مطالبہ خاص اس رزولوشن میں موجود ہے لہٰذا یہ پروپیگنڈہ کہ مسلم لیگ نے اور پاکستان بنانے والوں نے مسلم اقلیت کی کچھ فکر نہیں کی بلکہ ان کے مفاد کو قربان



کرکے اپنا مطالبہ پورا کرلیا تاریخی حقائق کے خلاف ہے۔ نہرو لیاقت پیکٹ اسی مطالبے کا نتیجہ تھا اور بہرحال کانگریس ہندو اور مسلمانوں دونوں کی حفاظت کی دعویدار تھی ہی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں تقسیم وطن کو جس غلط انداز میں پیش کیا جاتا ہے اس فیصلہ کے اصلی ذمہ دار کون تھے اور کیا ملک کی تقسیم روکی جاسکتی تھی؟ ہم یہاں اس سوال کی بہت زیادہ تفصیل میں نہیں جائیں گے بلکہ صرف کیبنٹ مشن پلان کی ناکامی کے اسباب پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں کہ یہ آخری کوشش تھی اور سنہری موقع تھا جس کو استعمال کرکے ملک کے بٹوارے کو روکا جاسکتا تھا اور لاکھوں انسانوں کو قتل ہونے سے بچایا جاسکتا تھا۔ بلاشبہ پاکستان کا مطالبہ مسلم لیگ نے کیا۔ لیکن کیا یہ ناقابل تنسیخ مطالبہ تھا؟ اور کیا مسلم لیگ کسی وقت اس مطالبہ سے دستبردار ہونے کو تیار ہوگئی تھی؟ یہ بہت اہم سوالات ہیں جن کا جواب ہندوستان میں رہنے والے مسلمانوں کو جاننا بہت ضروری ہے کہ آج تک الٹا ہی پروپیگنڈہ کیا گیا، اس کی وجہ بھی صاف ہے اور زیادہ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں کہ ایسا کیوں کہا جاتا رہا ہے کہ جناح اور مسلم لیگ مفسد اور ہندوستانی سیاست کے وِلین تھے۔

## کیبنٹ مشن پلان

۱۵/مارچ ۱۹۴۶ء کو وزیراعظم برطانیہ مسٹر ایٹلی نے پارلیمنٹ میں اعلان کیا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومت ایک وزارتی مشن انڈیا بھیج رہی ہے۔ اس مشن میں سر اسٹیفورڈ کرپس، لارڈ لارینس اور مسٹر الیکزینڈر شامل تھے۔ یہ مشن ۲۴/اپریل ۱۹۴۶ء کو ہندوستان پہنچا اور پہنچتے ہی کانگریس و مسلم لیگ کے لیڈران سے گفت وشنید شروع کردی تاکہ کوئی ایسا حل نکالا جاسکے جس پر کہ تینوں پارٹیاں ہندوستان کی آزادی کے لیے متفق ہوجائیں اور ملک جلد سے جلد آزاد کیا جاسکے۔ مشن کی گفتگو جواہر لال نہرو، مولانا آزاد ور محمد علی جناح وغیرہ سے چلتی رہی کبھی فرداً فرداً اور کبھی کانفرنس میں سب کے ساتھ ساتھ آخرکار ایک اسکیم ایسی نکل کر آئی جس پر مسلم لیگ اور کانگریس دونوں جماعتیں متفق ہوگئیں۔ یہ اسکیم اس طرح تھی کہ:

(۱) ہندوستان متحد رہے گا جس کی ایک مرکزی حکومت ہوگی۔

(۲) مرکزی حکومت کے پاس تین شعبہ ہوں گے۔ ڈیفنس، قانون معاملات اور رسل

ورسائل۔

(۳) ہندوستان کو تین انتظامی حصوں میں بانٹ دیا جائے گا۔گروپ A ہندو پارٹی علاقہ ہوگا۔گروپ B میں پنجاب، سندھ سرحد اور بلوچستان شامل ہوگا۔گروپ C میں بنگال اور آسام ہوگا جس میں مسلمانوں کی معمولی سی اکثریت ہوگی۔

اس منصوبہ کے تحت مسلم اقلیت اپنے اندرونی معاملات میں خودمختار ہوجاتی لیکن پھر بھی ہندو پارٹی کے زیراثر مرکز کے تحت اس کو رہنا ہوتا۔یہ ایک ایسی اسکیم تھی جس پر تینوں جماعتیں راضی ہوگئیں۔کانگریس، مسلم لیگ اور برطانیہ تینوں نے اس اسکیم کا خیرمقدم کیا۔گاندھی جی نے اس اسکیم کے بارے میں کہا۔

"THE SEED TO CONVERT THIS LAND OF SORROM INTO ONE WITHOUT SORROM OR SUFFERING... AFTER FOUR DAYS OF SEARCHING EXAMINATION OF THE STATE PAPER ISSUED BY THE CABINET MISSION AND THE VICEROY ON BEHALF OF THE BRITISH GOVERNMENT,MY CONVICTION ABIDES THAT IT IS THE BEST DOCUMENT THAT THE BRITISH GOVERNMENT COULD HAVE PRODUCED IN THE CIRCUMSTANCES. (LEONARD MOSELY, LAST DAYS OF THE BRITISH RAJ, P.17)

ملک میں چاروں طرف خوشی کا ماحول پیدا ہوگیا اور تمام انسانوں نے راحت کی سانس لی کہ آخرکار اتنا بڑا مسئلہ اتنی خوش اسلوبی اور آسانی سے حل ہوگیا تھا۔جناح کے لیے اس کو قبول کرنا حالانکہ اپنے پرانے مطالبۂ پاکستان سے دستبردار ہونا تھا لیکن انھوں نے مطالبۂ پاکستان کو پس پشت ڈال کر اس اسکیم کو قبول کرلیا۔

TO HIS WAY OF THINKING HIS ACCEPTANCE OF CABINET MISSION PLAN HAD BEEN A GREAT CONCESSION, IT MEANT THE ABONDONMENT OF HIS CONCEPTION OF SEPARATE STATE OF PAKISTAN. HE AND HIS FELLOW MUSLIMS WOULD HAVE REGIONAL INDEPENDENCE IN THEIR PROVINCES,BUT THEY WOULD STILL BE A PART OF HINDU DOMINATED RAJ. (IBID P.18)

کیبنٹ مشن انگلستان واپس چلا گیا۔تمام دنیا سے مبارکباد کے پیغامات مشن کو ملنے



لگے کہ اتنے اہم مسئلہ کو اتنی خوش اسلوبی سے سلجھادیا۔لیکن کیا واقعی ایسا ہوگیا تھا؟ جناح ہمیشہ سے ہی کانگریسیوں کی نیت پر شک رکھتے تھے اور انھوں نے بہت زیادہ بڑی قربانی کانگریس کے بیانات پر یقین کرکے دی تھی۔یہاں یہ سوال بہت اہم ہے اور تاریخ اس سوال کا جواب شاید نہ دے سکے کہ وہ کیا عوامل تھے جن کی بنیاد پر کہ جس کانفرنس میں کیبنٹ پلان کانگریس نے منظور کیا اسی کانفرنس میں کانگریس کے صدر کو بدلنے کا فیصلہ کیا گیا۔ حالانکہ مولانا آزاد پچھلے سات سالوں سے کانگریس سے صدر چلے آرہے تھے لیکن کانگریس کے ایک گروپ نے سردار پٹیل کو صدر بنانے پر زور ڈالا۔مولانا آزاد نے آخرکار جواہرلال نہرو کا نام صدارت کے لیے پیش کردیا اور وہ کانگریس کے صدر چن لیے گئے۔اس کے بعد جو واقعات پیش آئے وہ ہندوستان میں ہندو مسلم اتحاد کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوئے۔جواہرلال نہرو نے صدر بنتے ہی پہلی پریس کانفرنس میں اس معاہدے کی دھجیاں اڑادیں اور کسی بھی طرح کے طویل میعادی معاہدے کی موجودگی سے انکار کیا اور میجورٹی کی بنیاد پر آزاد ہندوستان کی پارلیمنٹ کو فیصلہ لینے کا حقدار قرار دیا۔یہ بالکل وہی بات تھی جس سے مسلم لیگ خوفزدہ تھی اور اتنی طویل گفتگو کے بعد معاہدہ ہوا تھا اور ایک ایسا طریقہ نکل کر آیا تھا کہ ملک کی اکثریت اقلیت پر زیادتی نہ کرسکے۔لیکن جواہرلال نہرو نے کہا:

''پہلی بات یہ ہے کہ ہم کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں جانے کے لیے راضی ہوگئے ہیں اس کے سوا ہم کسی بات پر راضی نہیں ہوئے ہیں۔اس میں ہم کیا کریں گے یہ طے کرنے کے لیے ہم بالکل آزاد ہیں۔ہم نے کسی ایک معاملے میں بھی کسی سے کوئی عہدو پیمان نہیں کیا ہے۔''

وہی ڈھاک کے تین پات والی بات ہوئی۔تمام خوشیاں ہندوستان کی اس بیان نے مٹادیں اور ہندو مسلمان کا سوال پھر سے زندہ ہوگیا اور اس سوال نے بنگال، پنجاب او رملک کے دوسرے حصوں میں ہزاروں بے گناہ انسانوں کا خون بہایا۔یہ خون آج تک بہہ رہا ہے ملک میں ہونے والے فسادات سے نہ ہندو خوش ہے اور نہ مسلمان سب کا نقصان ہے۔ملک کا نقصان ہے اور ملکی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

مولانا آزاد کے اس کارنامہ کو یقیناً تاریخ یاد رکھے گی (باوجود یہ کہ آزادی کے بعد دس

سالہ سیاسی زندگی میں ہمیشہ اس معاملے پر عوامی طور سے جھوٹ کا سہارا لیا تا کہ حکومت ان سے ناراض نہ ہو) کہ انھوں نے جواہر لال نہرو کی اس غلط بیانی کو بہت واضح الفاظ مین اپنی کتاب ''ہماری آزادی'' میں ظاہر کیا۔ یہ کتاب ان کے انتقال کے بعد چھپی اور اس اہم مسئلہ پر اخباروں میں بہت زیادہ لکھا گیا۔ مولانا آزاد نے لکھا:

''مجھے چاہیے کہ میں یہ درج کروں کہ جواہر لال نہرو کا بیان غلط تھا۔ یہ کہنا صحیح نہیں تھا کہ کانگریس کو یہ آزادی تھی کہ جس طرح چاہے وزارتی منصوبے کو تبدیل کرے۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم اس پر راضی ہوئے کہ مرکزی حکومت وفاقی ہوگی۔ تین شعبوں کی ایک لازمی فہرست ہوگی اور بقیہ تمام شعبے صوبائی حکومتوں کے پاس میں رہیں گے۔ ہم نے مزید اس پر اتفاق کیا کہ تین فریق ہوں گے یعنی (الف) (ب) اور (ج) جن میں صوبوں کی مجموعہ بندی ہوگی۔ یہ معاملات بغیر ان پارٹیوں کی رضامندی کے جو سمجھوتے میں شریک تھیں کانگریس کی طرف سے یکطرفہ طور پر تبدیل نہیں ہو سکتے تھے۔''

پنڈت نہرو کے اس پورے بیان کے متعلق مولانا کی یہ رائے تھی کہ:

''اب ان بدنصیبی کے حادثات میں سے ایک وہ واقعہ ہے جس نے تاریخ کی راہ بدل دی۔ ۱۰ر جولائی کو جواہر لال نے پریس کانفرنس منعقد کی اور اس میں ایک (مذکورہ بالا) بیان دیا۔'' (ابوالکلام آزاد، انڈیا ونس فریڈم، ص:۵۵)

اس بدنصیبی کے واقعہ کی طرف لیونا زوموسلے اپنی مشہور کتاب ''لاسٹ ڈیز آف برٹش راج'' میں رقم طراز ہیں:

"AND ON 10 JULY, AFTER HE HAD BEEN ELECTED PRESIDENT HE CALLED HE PRESS TOGETHER FOR A CONFERENCE TO DISCUSS HIS POLICY AS NEW HEAD OF CONGRESS. IT WAS A MOMENT IN HISTORY WHEN CIRCUMSPECTION WOULD HAVE BEEN THE ORDER OF THE DAY. THERE WAS MUCH TO BE GAINED BY SILENCE.



THE FORTUNES OF INDIA WERE IN BALANCE AND ONE FALSE MOVE COULD UPSET THEM. NEHRU CHOSE THIS MOMENT TO LAUNCH WHAT HIS BIOGRAPHER, MICHAL BRECHER HAS DESCRIBED AS ONE OF THE MOST FIREY AND PROVOCATIVE STATEMENT IN HIS FORTY YEARS OF PUBLIC LIFE. (LEONARD MOSELY:THE LAST DAYS OF BRITISH RAJ. P 21)

یعنی یہ کہ پنڈت نہرو نے جان بوجھ کر تاریخ کے اہم موڑ پر حالات کا رخ موڑ دیا اور ملک کے بٹوارے کا سبب بنے۔ ایسا انھوں نے کیوں کیا تاریخ شاید اس اہم مسئلہ پر ہمیشہ خاموش رہے لیکن گمان یہ کہتا ہے کہ پنڈت نہرو ہندوستان میں کسی بھی دوسری سیاسی قوت کو نہیں دیکھنا چاہتے تھے چاہے اس کے لیے انہیں ملک کا بٹوارہ منظور کرنا پڑے۔ اس معاملہ پر کچھ روشنی پنڈت نہرو کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے مولانا آزاد کی کتاب چھپنے کے بعد پریس رپورٹرز کے بار بار پوچھے جانے پر دیا۔ انھوں نے کہا:

MINE WAS CERTANILY PART OF THE RESPINSIBILTY AND MAULANA SAHIB MAY BE COMPLETELY RIGHT IN HIS THINKING THAT I ACTED WRONGLY ONLY I COULD SAY THAT MAULANA SAHIB THINKS TO MUCH IN TERMS OF INDIVIDUAL TERMS SOMETIMES, NOT IN TERMS OF HISTORIC FORCES AT WORK. INDIVIDUALS MAKE DIFFERENCE BUT SOMETIMES INDIVIDUALS ARE ONLY SYMBOLS OF FORCES AT WORK. (REPRODUCED IN THE INDIAN EXPRESS, 14TH MARC 1988)

یعنی پنڈت نہرو اس بیان کی اہمیت اور نتائج سے خوب واقف تھے کہ آخری وقت میں جب ملک آزاد اور متحد رہ سکتا تھا خود انھوں نے ایسا رویہ اختیار کیا جس سے کہ وطن کی تقسیم ہوگئی۔ پنڈت نہرو نے مولانا کے الزام کی تردید نہیں کی بلکہ اس سے آگے بڑھ کر یہ بات بھی کہی کہ تاریخی طاقتیں ایسا چاہتی تھیں۔ وہ طاقتیں کیا تھیں اور ان کے عوامل کیا تھے؟ یہ کوئی بہت زیادہ مشکل سوال نہیں ہے بلکہ واضح ہے کہ کانگریس ملک میں مسلمانوں کی برابری کے درجہ پر حکمرانی نہیں چاہتی تھی لہٰذا مسلم لیگ کو پاکستان دے کر ہندوستان کو خالص بنا لیا گیا۔ چونکہ جو مسلم قیادت ملک میں رہ گئی وہ مسلمانوں کی قیادت نہ تھی صرف مسلم تھی۔ اشارہ باریک ہے اور توجہ کا محتاج بھی۔ ○○○